اس نے کہا تھا

ناول

اشعر نجمی

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

© Esbaat Publications

Uss Ne Kaha Tha
by Ashar Najmi
Esbaat Publications, Thane, India
1st Edition : March, 2021
Printer: Fatima Offset, Andheri, Mumbai
ISBN: 978-81-950496-2-2

کتاب: اس نے کہا تھا (ناول)
مصنف: اشعر نجمی

اشاعت اول: مارچ ۲۰۲۱
سرورق: رشید میڈیا (مئو)
خطاط: منور کاتب
لفظ خواں: شامل سید
سوشل میڈیا ایگزیکیٹو: رضوان الدین فاروقی

B-202, Universe Darshan, Pooja Nagar Road, Naya Nagar,
Mira Road (East), Dist. Thane - 401107, Maharashtra, India
Contact: +91 8169002417 Email: asharnajmi2020@gmail.com
www.asharnajmi.com
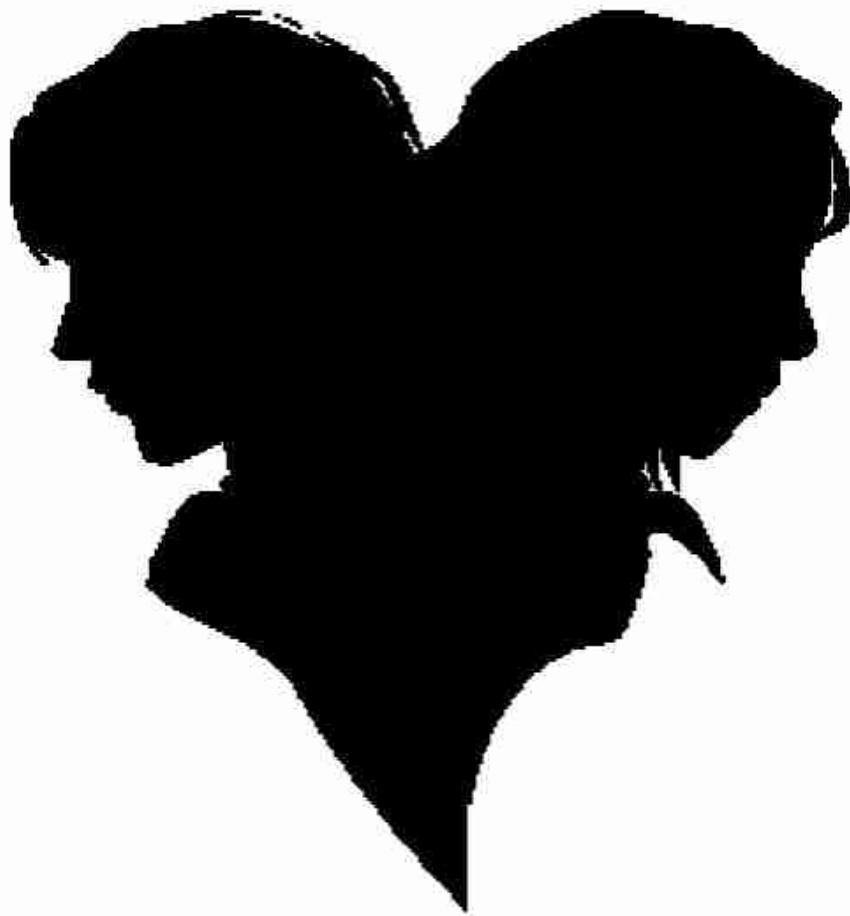
'Either you are homophobic or you are a human
- you cannot be both.'

- Abhijit Naskar

فکشن نگار کی حیثیت سے میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ میں اپنے کردار یا وقوعے کو جیسا بنانا چاہتا ہوں، ہمیشہ ویسا بنتا نہیں ہے۔ میرے سامنے سامع بھی نہیں ہے جس کے دباؤ کے تحت میں کردار اور واقعے کو آزاد نہ ہونے دوں۔ اس طرح متضاد سی صورت حال بنتی ہے کہ میں اپنے فکشن کا خالق ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں...

(شمس الرحمٰن فاروقی، 'فکشن کی سچائیاں')

لفظ چند

صدیق عالم

اشعر نجمی نے ناول 'اس نے کہا تھا' اس دور میں لکھا ہے جب دنیا اپنی تمام تکنیکی حیرتوں کے باوجود پرانی چولوں پر چل رہی ہے۔ آج LGBT کی اصطلاح اپنا مفہوم پوری طرح واضح کر چکی ہے مگر سماج نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا ہے۔ جب پدرانہ نظام اپنی نام نہاد 'پاکیزہ سوچوں' کو لگی ہوئی ٹھیس سے تلملا رہی ہو، اردو میں ان رشتوں پر ناول لکھنا، وہ بھی ہر طرح کی جبلی ہچکچاہٹ سے باہر نکل کر لکھنا، ایک مشکل ہی نہیں بلکہ ایسا کام ہے جس میں ناکامی کی شکل دیکھنا لازمی ہے۔ پھر بھی اشعر نجمی نے جو یہ ناول لکھا ہے تو کامیابی اور ناکامی اب ان کا مسئلہ نہیں رہا، اب یہ اس پدرانہ نظام کے جکڑ کوٹ پہنے ہوئے لوگوں کا مسئلہ بن چکا ہے جنھیں اپنے کپ بورڈ کے اندر ڈھانچوں کو چھپا کر رکھنے کی عادت ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم، اس ناول کو 'پکارسک' کے زمرے میں رکھا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ پکارسک کا کردار جس سماج میں رہتا ہے وہ اس کا غلام ہوتے ہوئے بھی اس کے رسم و رواج پر طنز کو اپنا وطیرہ بناتا ہے، جب کہ اشعر کے ناول میں کردار غلام تو ہیں (اور اس پدرانہ نظام میں کون نہیں ہے) لیکن وہ مقابلتاً زیادہ نفسیاتی اور سماجی الجھنوں کے شکار ہیں۔ یہاں کردار مروجہ جنسی رشتوں کے باہر کی دنیا کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں، ان کے اندر ان چیزوں کے تئیں اپنے تحفظات بھی ہیں مگر وہ جو چنتے ہیں، ان کا اپنا انتخاب ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی صورت میں یہ ناول انحراف کی کہانی کہی جا سکتی ہے نہ ہی یہ کسی دیوانے پن کی داستان ہے جس کی شاہد خود ناول کی زبان ہے:

''فقیر کیا جواب دیتا اور کن کو جواب دیتا؟ کیا انھیں جو لباس کے اندر سب کچھ چھپا لینے کے لیے بضد تھے؟''

یا

''ہمیں ڈر ہے ہماری حقیقت کہیں ظاہر نہ ہو جائے۔''

شاید اشعر اس میں یقین رکھتے ہوں کہ جب سارے کپڑے اتار لیے جاتے ہیں تو ننگا پن خود ہی ایک لباس بن جاتا ہے۔ یوں بھی کون ناول نگار سے اختلاف کر سکتا ہے کہ ہماری حقیقت سماجی جبر کی وجہ سے دب کر رہ گئی ہے، اور اب یہ ڈر ہی ہمارا اصلی چہرہ بن چکا ہے۔ آج تہذیب کے نام پر نہ صرف ہم اس ڈر کو ڈھو رہے ہیں، بلکہ اس ڈر کی ہی ناجائز اولاد ہیں۔

ایک ایسا ناول جس کا کوئی مربوط پلاٹ نہ ہو، نہ ہی واقعات کے زمانی اور مکانی تسلسل کے سلسلے میں کوئی خاص وفاداری برتی گئی ہو، اس کے تانے بانے کے بکھرنے کا قوی امکان رہتا ہے، بشرطیکہ تحریر کی روانی اسے سنبھال نہ لے اور اشعر نجمی کی تحریر کی روانی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ قارئین اس نامانوس دریا کے کنارے کھڑے کے کھڑے رہ جائیں، ہو سکتا ہے بیچ دریا تک پہنچتے پہنچتے کچھ لوگوں کی سانس پھولنے لگے مگر وہ جو کنارے پہنچیں گے انھیں کسی نخلستان کی امید نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ اس دریا کے اندر تیرنا ہی اس کا حاصل ہے۔

ناول کے اندر بیان ہونے والے واقعے کے مطابق ننگے فقیر کو تو موت کا فرمان ملا، دیکھیے اردو کے قارئین اشعر نجمی کے لیے کیا فرمان جاری کرتے ہیں۔

وسط عمر کا بحران
افتخار نسیم

میں عمر کے ایک عجیب حصے میں آ گیا ہوں
جہاں نہ کوئی حریم جاں
نہ عدوئے جاں ہے
نہ خطرۂ سود اور زیاں ہے
یہ دل ترازو ہے
جس کے پلڑے بس اک جگہ پر رُکے ہوئے ہیں
میں سارے پچھلے دنوں کی باتوں کو جانتا ہوں
میں آنے والے دنوں سے واقف
کہ میری چشم جہان دیدہ میں کوئی حیرانی اب نہیں ہے
یہ میرے بٹوے میں سب ممالک کی ریزگاری بھری ہوئی ہے
مگر ہے دل اک غریب کی جیب سے خالی
میں چلتے چلتے نظام شمسی کے ایسے نکتے پر آ گیا ہوں
جہاں پہنچ کے یہ میرا سایہ
ہزار رستوں پہ چل رہا ہے

- 1 -

اس نے اپنی موت کے لیے دیوالی کی رات کا انتخاب کیا تھا۔

جشن کی رات ۔ مہاویر کے 'موکش' کی رات ۔ اندھیرے پر روشنی کے غلبے کی رات ۔ نادانی پر دانشوری اور مایوسی پر امید کی فتح کی رات ۔

ایسا نہیں ہے کہ اس نے دنوں یا مہینوں پہلے اس کی تیاری کی ہو یا کوئی منصوبہ بنایا ہو، نہیں، سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ بس بیٹھے بیٹھے یوں ہی خیال آیا کہ مرنے کے لیے آج سے بہتر کوئی دوسری رات نہیں ہو سکتی ۔ جب ایک سوتیس کروڑ لوگ جشن منا رہے ہوں اور ایک دوسرے کو ۷۴۴ زبانوں میں مبارکباد دے رہے ہوں، جب بتیس لاکھ ستاسی ہزار دو سو تریسٹھ کلومیٹر میں چراغاں ہو، جب 'جی ڈی پی' کی منفی ۲۴ فیصد شرح کے باوجود مفلسوں کے ہاں بھی دو چار ہی سہی لیکن مٹی کے دیے روشن ہوں اور ان کے بچے پٹاخے چھوڑ کر تالیاں پیٹ رہے ہوں تو پھر بھلا اس رات کا ایک چھوٹا سا حصہ بننے سے زیادہ فخر کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر چہ اس کے پاس مرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی ۔ وہ بہت دیر تک سوچتا بھی رہا کہ وہ مرنا کیوں چاہتا ہے لیکن اس کے ہاتھ مایوسی ہی لگی ۔ اس کے پاس سب کچھ تو ہے؛ اپنا فلیٹ، اچھی زندگی، قیمتی کار، نہ بیوی نہ بچہ بالکل آزاد، نہ پیار میں دھوکہ، نہ بزنس میں نقصان، نہ قرض کا بوجھ، نہ دنیا کی فکر، نہ آخرت کا خوف؛ تو وہ پھر مرنا کیوں چاہتا ہے؟ بس ایسے ہی... کیا بغیر وجہ کے مرنے پر پابندی ہے؟ نہیں نہیں، اس کے دماغ میں کوئی فتور بھی نہ تھا اور نہ ہی وہ نفسیاتی مریض تھا بلکہ وہ تو خود ایک سائیکاٹرسٹ تھا۔ لوگوں کے اندرون میں جھانکنا، ان کے خیالات وتصورات کا ایکسرے نکال کر ان کا علاج کرنا صرف اس کا پیشہ نہیں، اس کا شوق بھی تھا۔ یہ شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ ہر

شام اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد گھنٹوں سڑکوں ، پارکوں ، شاپنگ مالوں، ریلوے اسٹیشنوں، بس اڈّوں، بیئر باروں حتیٰ کہ پبلک ٹوائلٹوں میں آوارہ گردی کرنا اس کے معمول میں شامل تھا۔ اس کی آنکھیں چوکنی ہوتیں، وہ لوگوں کے چہرے کنکھیوں سے پڑھتا ہوا گزرتا چلا جاتا۔ کوئی دلچسپ ہدف نظر آتا تو کسی بہانے وہ اس کے چاروں طرف منڈلاتا رہتا اور اس سے مخاطب ہونے کے حیلے گھڑنا شروع کر دیتا، اکثر وہ حیلے بہانے عام سے ہوتے، مثلاً:

'آپ کے پاس لائٹ ہے؟'

'کیا ٹائم ہوا ہے؟'

'لنک روڈ کے لیے کون سی بس جاتی ہے؟'

'اگلی ویرار لوکل کتنے بجے کی ہے؟'

'آج کتنی ٹریفک ہے نا؟' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن مشکل اس وقت پیش آتی تھی جب کوئی مردم بیزار سا مخاطب ایک مختصر سا جواب دے کر منہ پھیر لیتا۔ ایسے اخروٹوں کو توڑ کر اس کا مغز نکالنا اس کے لیے چیلنج بن جاتا، اور تب وہ اپنی تمام تر پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کے گلے پڑ جاتا۔ مثلاً:

'آپ کو شاید زیادہ باتیں کرنا پسند نہیں۔'

'دیکھیے، نوٹ بندی نے تو دیش کی واٹ لگا کے رکھ دی ہے۔'

'آپ سگریٹ لیں گے؟'

'سبزی مہنگی ہو گئی ہے اور چکن سستا، ویجیٹیرین رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے صاحب۔'

'بمبئی پہلے ایسی نہیں تھی، اوہ سوری ممبئی۔ کتنی گردی ہو گئی ہے۔'

'آپ کو کہاں جانا ہے؟'

'اگلی لوکل تو چار بیس کی ہے، آدھا گھنٹا ہے ابھی، ایک ایک کپ چائے ہو جائے؟'

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اسے کبھی کبھی اتنی تگ و دو بھی نہیں کرنی ہوتی، صرف بیئر بار یا ریسٹورنٹ میں گھسو، اور اگر کوئی ہدف اپنے دوست یا کسی ساتھی کے ہمراہ نظر آئے تو ان کے آس پاس والی ٹیبل کا انتخاب کرو، آنکھیں سامنے اور کان ان کے درمیان ہونی والی سرگوشیوں پر لگا دو، مطلب کی بات نہ ہو تو کان لپیٹ لو۔ بس اتنا ہی تو کرنا ہوتا تھا۔ لوگوں کی جنم کنڈلی وہ اکثر ان کے لباس، جوتے،

نشست و برخاست، ہیئر اسٹائل حتیٰ کہ ان کی ناک کی ساخت دیکھ کر نکال لیتا تھا۔ باریک لمبی ناک جسے یونانی ناک بھی کہا جاتا ہے، دیکھ کر وہ فوراً سمجھ جاتا تھا کہ یہ بندہ خود اسیری کا شکار ہے، اگرچہ کافی عملی اور وفادار بھی ہوگا لیکن اس کے لیے کھل کر بات کرنا مشکل ہے۔ طوطے کی چونچ جیسی ناک والے شخص کو دیکھ کر وہ اندازہ لگا لیتا تھا کہ جدت پسند ہوگا لیکن اپنے عقائد پر سختی سے ٹکے رہنے کے لیے ہر انتہا تک جا سکتا ہے۔ بٹن ناک یعنی جو بہت مختصر ہوتی ہے اور جلد ختم ہو جاتی ہے، اسے دیکھ کر وہ فوراً قیاس لگا لیتا تھا کہ یہ ہٹ دھرم ہوگا، اپنے فیصلے کو حرف آخر سمجھتا ہوگا، شاید اس کے اس رویے سے کچھ لوگ اسے ناپسند بھی کرتے ہوں لیکن بہرحال خود اعتماد ضرور ہوگا۔ سیدھی ناک رکھنے والوں، جن کے نتھنے چوڑے ہوتے ہیں، اس سے ان کے کردار کی مضبوطی کا احساس تو ہوتا تھا لیکن وہ ان کے غصے سے ڈرتا تھا۔ مقعر ناک رکھنے والوں سے وہ تھوڑا سا فاصلہ رکھتا تھا چونکہ وہ بہت جذباتی ہوتے ہیں، ان کی دل آزاری چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہو جاتی تھی، اب ایسے حساس لوگوں کا کیا ٹھکانہ کہ کب وہ ذرا سی بات پر اپنی جان دے دیں یا اس کی جان لے لیں۔ اسے سب سے زیادہ ٹیڑھی ناک والے پسند تھے جو بات کرنے سے زیادہ سننا پسند کرتے ہیں اور کافی منکسر المزاج بھی ہوتے ہیں۔ لیکن خود اس کی ناک آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی، متجسس اور نئے نئے تجربات کرنے کے عادی لوگوں کی صفت اس میں بھی تھی، وہ بھی دوسروں کی مدد کے لیے پیش پیش رہتا۔ مایوسی اور ناامیدی میں بھی پُرامید رہنا ایسی ناک رکھنے والوں کی خاصیت ہوتی ہے لیکن پھر وہ مرنا کیوں چاہتا ہے؟

کیا وہ دوسروں کے حصے کی موت چُرا کر خود مرنا چاہتا ہے؟

کیا اب اس کے اعصاب دوسروں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے چرمرا گئے ہیں؟

کیوں مرنا چاہتا ہے وہ آخر۔

اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا، لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ وہ مرنے کی وجہ کیوں ڈھونڈ رہا ہے؟ مرا تو کبھی بھی جا سکتا ہے، بغیر کسی وجہ کے... یہی تو ایک چیز ہے جس پر آدمی کا مکمل اختیار ہے۔ اس نے سگریٹ کو، جس کی تپش اب اس کی انگلیوں کے قریب پہنچ چکی تھی، ایش ٹرے میں رگڑ کر بجھایا۔ ایش ٹرے 'کوک' کی پلاسٹک بوتل کو نصف کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس نے بوتل سے بچی ہوئی 'اینٹی کوئٹی بلیو' خالی گلاس میں انڈیلی، پھر ٹیبل پر پڑی ہوئی دیسی دارو کے پلاسٹک کے پیکٹ کو دانتوں سے نوچ کر اسے بھی گلاس میں خالی کر دیا۔ پھر وہ صوفے پر سے ایک جست لگا

کر اٹھ کھڑا ہوا۔ فریج کھولا، فریج خالی تھا۔ آئس ٹرے بھی خالی تھی۔ اس نے پانی کی ایک بوتل نکالی، پھر کچھ سوچ کر اسے واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

گلاس سے ایک لمبی گھونٹ مارنے کے بعد اس نے میوزک سسٹم آن کر دیا۔ کمرے میں اچانک Black Eyed Peas کی Ritmo کا شور گونجنے لگا۔ ڈرم بیٹ اور گٹار کے بلاخیز امتزاج نے اس کے پاؤں کو تھرکنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے اس کے پاؤں نے تھوڑا تھوڑا تھرکنا شروع کیا، پھر اس میں بتدریج تیزی آتی گئی، پھر اس کی کمر، اس کی آنکھیں، اس کے ہاتھ، اس کے جسم کا رواں رواں تھرکنے لگا۔ اس نے ناچتے ناچتے ایک گھونٹ میں پورا گلاس ختم کر دیا اور اسے دیوار پر دے مارا۔ شیشے کے ٹوٹنے کی آواز کو تیز موسیقی نے ہضم کر لیا۔ اب اس کا جسم پوری طرح آزاد تھا، وہ ناچ رہا تھا لیکن وہ شاید یہاں نہیں تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، دماغ پتہ نہیں کہاں تھا۔ وہ بے پناہ ناچ رہا تھا، لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا، اس میں کوئی بھاؤ نہ تھا، بس وہ ناچے چلا جا رہا تھا، گھرنی کی طرح گھوم رہا تھا، پاؤں جیسے زمین پر نہیں بادلوں پہ پڑ رہے تھے۔

اچانک میوزک بند ہو گئی۔ جیسے سب کچھ رک گیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا جیسے اسے کسی نے اٹھا کر آسمان سے زمین پر پھینک دیا ہو۔ سناٹے میں وہ کچھ دیر تک ناچ کی 'مدرا' میں کھڑا رہا، جیسے کسی نے اسے اچانک 'اسٹیچو' بول کر بے حس و حرکت کر دیا ہو۔ باہر سے دیوالی کے پٹاخوں کے شور کی دراندازی جاری تھی، ایک راکٹ چیختا ہوا بالکنی کے پاس سے گزرا اور اس نے اپنے ہاتھ نیچے کر لیے، سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے پورے کمرے میں یوں نظر ڈالی جیسے طے کر رہا ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ پھر وہ زیرلب مسکرایا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، 'فک'۔

اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا، پینٹ کی زِپ نیچے کھسکائی اور کموڈ پر پیشاب کی دھار گرنی شروع ہو گئی۔ اس کا سر اٹھا ہوا تھا، آنکھیں چھت پر چپکی ہوئی تھیں۔ پیشاب کرنے کے بعد اس نے فلش کیا۔ کموڈ کی دیوار کے کسی کونے میں چھپا ہوا ایک کنڈوم فلش کی دھار سے گھبرا کر باہر نکل آیا اور بھنور کی طرح پانی کے بیچ چکر کاٹنے لگا۔ وہ نہایت انہماک سے کنڈوم کا رقص دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تیر گئی۔

''کنڈوم کو کبھی فلش کیا ہے؟'' اس مونچھوں والے ٹھگنے آدمی نے رات کے دو بجے اس سے کہا تھا، ''اس کو فلش کرو گے تو وہ کموڈ میں گھومتا ہی رہے گا... آدھا ہوا سے اور آدھا تمھارے اسپرم سے پھولا ہوا وہ کنڈوم... کتنا بھی فلش کر لو، جائے گا نہیں، چپکا ہی رہے گا، وہیں گھومتا رہے

گا جب تک تم اس میں گانٹھ نہیں مار دیتے۔ تم لوگوں کے ساتھ بھی سالا یہی ہے۔''

اس نے واش بیسین میں ہاتھ دھوئے، پاس پڑے ٹیشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتا ہوا دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا، جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ اب کیا کرنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا پورا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا، آسودگی سے بھرپور ایک سانس چھوڑی اور کندھے اُچکاتے ہوئے بڑبڑایا، ''چلو اب مرتے ہیں۔''

- 2 -

سفید اور بے شکن چھت کو تکتے تکتے آنکھیں پتھرا سی گئی ہیں، خیر وہ تو پہلے ہی پتھر ہوگئی ہیں، پورا جسم ہی پتھر ہوگیا ہے، میں حرکت نہیں کر پا رہا ہوں، پتہ نہیں یہ کون سی جگہ ہے۔ شاید میں مر چکا ہوں اور یہ جنت... نہیں اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ یہ جہنم ہوسکتا ہے لیکن میں سنا تھا کہ جہنم کی آگ ہم جیسوں کو چکن تندوری کی طرح روسٹ کردیتی ہے... بار بار... اور کھولتے ہوئے تیل کے کڑھائے میں ڈال کر مٹن دو پیازہ بنا دیا جاتا ہے لیکن مجھے تو کسی اذیت کا احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔ چھت کی سفیدی جھلملانے لگی اور پھر انھوں نے ننھے ننھے بلبلوں کی شکل لینی شروع کردی... یہ کیا گیم ہے بھائی... ضرور جہنم کے فرسودہ آلات اذیت کی جگہ کچھ نئی قسم کی سزائیں امپورٹ کی گئی ہوں گی۔ سب کچھ تو بدل گیا ہے، دنیا نے کتنی ترقی کرلی ہے تو پھر جہنم روایتی کیوں رہے۔ وہ بلبلے اُبل رہے تھے، جیسے سفید چونے میں پانی ڈالنے کے بعد وہ بلبلاتے ہیں، جوش مارتے ہیں۔ اچانک ان سفید بلبلوں کی رنگت بدلنی شروع ہوگئی... سرخ، زرد، سبز، زعفرانی... اور ان تمام رنگوں سے مل جل کر بنے ہوئے انگنت رنگ جن کا کوئی نام نہیں، کوئی پہچان نہیں ہے۔ وہ رنگ برنگے بلبلے چھتوں پر دائرے کی شکل میں گھومنے لگے، پہلے ان کی رفتار کم تھی جو رفتہ رفتہ تیز ہوتی گئی، اتنی تیز کہ اب بلبلے نہیں بلکہ ان کے باہمی امتزاج سے شکلیں بننے اور مٹنے لگیں۔ میری اس کھیل میں دلچسپی بڑھ گئی ہے، اتنی بڑھ گئی کہ میں نے پلکیں جھپکانی بند کردیں (محاورتاً سوچ رہا ہوں ورنہ پتھر بھی بھلا کبھی پلکیں جھپکتے ہیں)۔ رقص کرتے بلبلوں کو غور سے دیکھتا رہا، اب وہاں چھت نہیں تھی، صرف رنگین بلبلے ہیں اور بلبلے بھی کہاں ہیں، کچھ شکلیں ابھر رہی ہیں اور غائب ہو رہی ہیں۔ عجیب سے ٹیڑھی میڑھی، بے ہنگم؛ میں انھیں پہچاننے کی

کوشش کر رہا ہوں، لیکن یہ میرے لیے crossword جیسا کھیل ہے جو عموماً لوگ وقت گزاری کے لیے کھیلتے ہیں۔ لوکل ٹرینوں میں یا پھر کسی پارک میں آپ نے ایسے لوگوں کو اکثر دیکھا ہوگا اور ان میں سے بعض تو اس کھیل میں ایسے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انھیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی منزل سے آگے نکل چکے ہیں۔ خیر، میری کوئی منزل تو ہے نہیں، اور اگر کوئی ہے بھی تو وہ یہی ٹرمنس ہے جس کے آگے کوئی ٹرین نہیں جاتی۔ اس لیے میرے پاس وقت کی فراوانی ہے، کہیں جانے اور اُترنے کی کوئی جلدی نہیں۔

بُلبُلوں کا رقص جاری ہے۔ شکلیں بن اور بگڑ رہی ہیں اور میں انھیں بغیر پلک جھپکے تک رہا ہوں۔

اچانک ایک ہیولا کچھ جانا پہچانا سا لگا، میرے تجسس کو ہوا لگ گئی۔ میری یکسوئی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہاں ہاں، میں اسے جانتا ہوں۔

وہ نیلی شرٹ والا جو مجھے دیکھ کر مسکرا رہا ہے، ہم پانچ سال تک ساتھ تھے۔ ہر ہفتے کے آخر میں جب میرے پاس جگہ ہوتی تھی، اور میرے روم پارٹنر باہر گئے ہوتے تھے یا پھر اس کی بیوی جب کہیں اور گئی ہوتی تھی۔ ان طویل برسوں میں مجھے ہر 'ویک اینڈ' کی ہر چیز یاد ہے سوائے اس کے چہرے کے، البتہ اس کی فیوریٹ نیلی شرٹ آج بھی یاد ہے جس سے گٹکے کی بُو آتی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر مونچھیں اور ایک بڑا تل یاد ہے لیکن مجھے اس کا چہرہ یاد نہیں، تھوڑا سا بھی نہیں۔ ابھی بھی میں نے اسے اس کے چہرے سے نہیں، اس کی نیلی شرٹ سے پہچانا، یا پھر شاید اس کی وہ مسکراہٹ جو اس وقت ہوا میں معلق تھی۔

مجھے یاد ہے کہ کون سا دن بہت گرم تھا اور اس کا سینہ پسینے سے شرابور تھا۔ وہ کس دن کالی چھتری لے کر آیا تھا؟ کس دن وہ ٹریفک، آفس، ممبئی اور زندگی کی جھنجھلاہٹ ساتھ لایا تھا۔ کس دن وہ کھویا کھویا تھا اور کس دن اس نے کہا تھا اور سچ کہا تھا کہ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔

اور یہ انکل جو خوشبوؤں میں نہائے ہوئے ابھی ابھی دروازے سے اندر آئے ہیں، مجھے ان کی قمیصیں یاد ہیں؛ سفید۔ وہ ہر چیز جوش میں کرتے تھے، سوائے اپنے شرٹ کو سلیقے سے اتار کر ٹانگنے کے۔ مجھے ان کی قمیص کے بٹن یاد ہیں۔ مجھے وہ دیوالی یاد ہے جب میں اپنے شہر نہیں گیا تھا کہ ہمیں ملنے کا موقع مل جائے۔ مجھے ان کی خوشبو یاد ہے، مختلف قسم کی خوشبوئیں۔ جب وہ دفتر سے آتے تھے، تیز خوشبو... جب وہ گھر سے آتے تھے تو کبھی ان کی دونوں بیٹیوں کی خوشبو آتی

تھی، کبھی ان کی بیوی کی بریانی کے گرم مصالحے کی۔ مجھے وہ گرم ہوا سے لہراتے پردے یاد ہیں۔ بغل کی زیر تعمیر عمارت کی کھٹ کھٹ پٹ پٹ یاد ہے۔ ان کا ہچکیوں کے ساتھ رونا یاد ہے۔ مجھے ان کے منی کا ذائقہ یاد ہے لیکن مجھے ان کا چہرہ یاد نہیں، تھوڑا سا بھی نہیں۔ آخر مجھے چہرے کیوں یاد نہیں رہتے؟ کوئی سا بھی، کسی کا بھی چہرہ یاد نہیں۔

مجھے اپنے اسکول کے اس چوتیے کا چہرہ بھی یاد نہیں جو اپنے انڈر وئیر میں ہمیشہ ہاتھ ڈالے نظر آتا تھا۔

ان کا چہرہ یاد کرنے کی بہت کوشش کرتا ہوں جن میں کسی کو کھیل ختم ہوتے ہی اپنی گرل فرینڈ یاد آنے لگتی تھی۔ کہتے تھے، میرے ہونٹ ان کی 'ایکس گرل فرینڈ' جیسے ہیں۔ کسی کو 'ڈسچارج' ہونے کے بعد خیال آتا تھا کہ وہ تو رائٹر ہے اور یہ سب وہ تجربہ حاصل کرنے کے لیے کر رہا تھا، وہ میرے بارے میں بھی لکھے گا۔ مجھ پر پورا ایک باب نہ سہی مگر ایک پیراگراف تو لکھے گا ہی۔

ان میں سے کسی کا چہرہ مجھے یاد نہیں، ہاں باتیں سب یاد ہیں۔ مجھے ہارون رشید اور جعفر برمکی کے چہرے یاد نہیں جو دو گریبانوں والے فرغل پہن کر ایک جان دو قالب بن جایا کرتے تھے۔ مجھے امین رشید کا چہرہ یاد نہیں لیکن اس کے بڑے بڑے سرین یاد ہیں جن کے درمیان فاصلہ تھا۔ اس کا غلام کوثر بھی یاد ہے جس کے ساتھ وہ تالاب میں مچھلیاں پکڑتا تھا۔ مجھے معتصم کا بھی چہرہ یاد نہیں جو میرے ساتھ چوگان کھیلا کرتا تھا اور حمام میں ہم ایک دوسرے کے جسم رگڑا کرتے تھے۔ مجھے سرمد کی رباعیاں یاد ہیں، اس کے محبوب لونڈے کی سریلی آواز یاد ہے لیکن دونوں کے چہرے یاد نہیں۔ مجھے عطار کا لونڈا یاد ہے، میر یاد ہے لیکن ان کے چہرے بھی دھند میں لپٹے ہیں۔ مجھے جوش کے جوشیلے معاشقے یاد ہیں لیکن ان لونڈوں کے چہرے یاد نہیں جو ایک انقلابی شاعر کے اشعار میں اپنے لیے گنجائش نہ نکال پائے۔ مجھے آسکر وائلڈ کی سزائیں یاد ہیں لیکن اس کے محبوب کا چہرہ نہیں۔ مجھے امبا کے روپ میں شکھنڈی کی خود سپردگی یاد ہے لیکن اس کا چہرہ نہیں۔ مشتری چہرہ غلام ایاز بھی دھند میں لپٹا ہوا ہے جو بھرے دربار میں کہتا تھا کہ میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہوں چونکہ میرا قبضہ تمھارے بادشاہ کے دل پر ہے۔ مجھے سلطان سنجر، سلطان محمود مرزا، ہمایوں، خان زمان، سلیم شاہ سوری اور دولت خان کسی کے چہرے یاد نہیں، اور ہاں مجھے اس نازک اندام مجاہد خان کا چہرہ بھی یاد نہیں جسے قلیہ کی مہک سے غش آنے لگا تھا۔ خسرو خان کسے یاد نہیں جس نے اپنی اداؤں اور عشوؤں سے پہلے میرے حضور صفائی پیش کی، پھر مجھے قتل

کردیا، اس زمانے میں میرا نام مبارک شاہ ہوا کرتا تھا لیکن مجھے اب خود اپنا چہرہ یاد نہیں۔ مجھے گلاب سنگھ کا چہرہ بھی یاد نہیں جو کبھی رنجیت سنگھ کا لونڈا ہوا کرتا تھا... وہی گلاب سنگھ، جس کے ہاتھوں انگریزوں نے اونے پونے دام میں کشمیر بیچ دیا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے، لیکن چہرے دھند لکے میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اور یادیں بھی کیسی؟

دنیا بدلنے کا خواب دیکھنے والے بوائے فرینڈ، ایک کے بعد ایک شادی کرتے ہوئے بوائے فرینڈ۔ ہزار ہا ہزار ہارون، امین، سرمد، رنجیت، رضوان، راہل اور سمیر کو آتا جاتا دیکھتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی امیدیں اور بڑی بڑی سچائیاں دیکھتا رہا۔

تھک گیا ہوں میں... تھکی ہوئی سرخ آنکھیں اب جلنے لگی ہیں۔ میرے خواب ایسے چہروں سے بھی بھرے ہیں جن کا نام میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ میں کس چہرے کو یاد کروں... کسے آواز دوں؟ کسی چہرے پر جھریاں ہیں تو کسی کے چہروں پر مہاسوں کے داغ ہیں... کسی کی ناک بہہ رہی ہے تو کسی کی آنکھ... کوئی گنجا ہے تو کسی کے بالوں کا گچھا میرے نتھنوں سے ٹکرا رہا ہے اور مجھے چھینک آ رہی ہے۔ کسی چہرے پر نقاب نہیں لیکن ہر چہرہ چھلنی ہے... کسی چہرے پر بارود کی سڑانڈ اور خون کے دھبے ہیں۔ یہی آدھے ادھورے چہرے میری زندگی کا اثاثہ ہیں... میرے وجود کا اثبات ہیں۔ کسی کے بازو کٹے ہوئے ہیں... کسی کے پاؤں نہیں... کسی کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آ گئی ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے نا کہ ایک آدمی مر کر ان لوگوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے جنھیں وہ خود پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

بھاگتے ہوئے وقت کی دُم پکڑنے کا یہ کھیل میرا پسندیدہ مشغلہ ہے جس میں سب کچھ جو گزر چکا ہے، وہ میرا ہے۔ اس کھیل میں انتخاب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ یوں بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ جو گزر چکا ہے، اسے صرف یاد کیا جا سکتا ہے، تلاش کیا جا سکتا ہے، تجدید کیا جا سکتا ہے، لکھا جا سکتا ہے، محسوس کیا جا سکتا ہے اس امید پر کہ شاید وہ بچ جائے جسے ہم کھو چکے ہیں۔ یہ کھیل جاری رہے گا۔ کسی 'تھا' میں کسی 'ہے' کو تلاش کرنا اور بچانا مجھے اس دنیا کا سب سے مزیدار کھیل لگتا ہے۔ یہ جاری رہے تو میں اس میں سے خوشی کشید کرتا رہوں گا، سانس لیتا رہوں گا، جیتا رہوں گا۔

آہ! اتنی ساری روشنی کس نے میری آنکھوں میں انڈیل دی؟ شاید روشنی انڈیلنے والا مجھ پر جھکا ہوا ہے... اس کا چہرہ تو نظر نہیں آ رہا ہے لیکن اس کا ہیولی روشنی کے پیچھے ضرور موجود ہے چونکہ اس کی آواز مجھے کچھ کچھ سنائی دے رہی ہے، اگر چہ بہت واضح نہیں ہے، لیکن جیسے پڑوس کی

آوازیں ہم اپنے گھر کی مشترکہ دیوار سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے ہیں، بس اتنی ہی آواز۔

''Locked-in-syndrome!'' ڈاکٹر ٹارچ لائٹ بند کرتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''کیا؟'' انسپکٹر نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔

''Complete Paralysis۔'' ڈاکٹر نے مختلف رپورٹ کارڈ دیکھنے شروع کر دیے۔

''کیا اس کی نبض چل رہی ہے؟'' انسپکٹر اب بھی گومگو کی کیفیت میں تھا۔

''آف کورس، زندہ ہے یہ، لیکن مر جاتا تو بہتر ہوتا۔ ایک زندہ لاش سے زیادہ کچھ نہیں ہے یہ۔ He has lost control of all his muscles except the one that's his eye movements۔''

''کیا یہ دیکھ سکتا ہے؟ ہمیں سن سکتا ہے؟''

''اس کا برین ڈیڈ نہیں ہوا، damage ہوا ہے۔ کتنا کام کر رہا ہے، فی الحال کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ ہمیں بات کرتے ہوئے سن رہا ہو بلکہ دیکھ بھی رہا ہو۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنا دیکھ اور سن پا رہا ہے یا یہ جو کچھ دیکھ رہا ہے یا سن رہا ہے، اسے سمجھ بھی پا رہا ہے یا نہیں؟''

''آتم ہتیا کر کے ایسے لوگ تو اپنی پریشانیوں سے تو نجات پا جاتے ہیں لیکن ہماری اور آپ کی نیند حرام کر جاتے ہیں۔'' انسپکٹر نے تبصرہ کیا۔

''خیر آج تو میری نائٹ شفٹ تھی، اس لیے مجھے کوئی خاص ٹینشن نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے لاپروائی سے کہا اور میڈیکل ہسٹری شیٹ پر کچھ لکھنے لگا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب ہمارا کیا؟ گھر پر بچوں کے ساتھ دیوالی منا رہا تھا کہ تھانے سے فون آ گیا کہ کوئی سترہ مالے سے نیچے گر گیا، پتہ نہیں آتم ہتیا کی یا کسی نے اوپر سے دھکا دے دیا، کچھ بھی ہو لیکن اپنی دیوالی کا دیوالہ نکل گیا نا؟ کل نہیں کر سکتا تھا آتم ہتیا؟ آج کا دن ہی اس کو مانگتا تھا مرنے کے لیے، سالا ہلکٹ... سوری ڈاکٹر...''

''نہیں نہیں، آپ continue رہیے، لیکن سوچیے، اگر یہ آپ کی گالیاں سن رہا ہو تو؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

- 3 -

مجھے یاد ہے، میں اور قدیر سفید چادروں کے نیچے ٹارچ کی روشنی سے پرچھائیاں بنایا کرتے تھے؛ کتا... بلی... اور جب کچھ نہ بن پائے تو پھر بھوت... اس کا ہنستا ہوا چہرہ جسے میں آج تک نہیں بھول پایا۔ ہر چیز دھندلا گئی ہے مگر اس کا چہرہ جوں کا توں میری یادوں میں جیسے ٹھہر سا گیا ہو۔ میرا پہلا دوست... پہلا پیار۔ جب سے اس کے دادا مرے تھے، وہ میری دھڑکن سنتا رہتا تھا۔ ہم نے جو بھی کیا، ساتھ کیا؛ پہلی دوستی، پہلی گالی، پہلی سگریٹ، پہلی پورن، پہلی شراب، پہلا بوسہ۔

ہر چیز اپنا کچھ نہ کچھ اثر چھوڑ جاتی ہے لیکن کسی چیز کا اثر اتنا گہرا نہیں تھا، جتنا پہلی لاش کا تھا۔ یہ وہ نقش تھا جو ہمارے ذہن سے چپک سا گیا تھا۔

سردیوں کی صبح تھی، میں ۱۶ سال کا تھا۔ قدیر کے کوارٹر کے پاس بھیڑ لگی تھی، ہواؤں میں حبس تھا۔ میں آنکھیں مل ہی رہا تھا کہ قدیر بھاگتا ہوا آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ کھینچ لے گیا۔ میری سانسیں بھاری ہو رہی تھیں، میرے خالی پیٹ میں ہلکی سے گدگدی بھی ہو رہی تھی اور اس کا پسینے میں بھیگا ہوا ہاتھ اور اس کا بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنا آج بھی مجھے یاد ہے۔

ہم دروازے کے سامنے تھے۔ شاید قدیر یہاں اکیلے آنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا، اسے بھیڑ سے ڈر لگتا تھا۔ یہ اس آنٹی کا کوارٹر تھا جن کا کوئی نام نہ تھا۔ وہاں اچھی خاصی بھیڑ جمع تھی۔ یہ گھر بالکل قدیر کے گھر کی طرح تھا؛ سرکاری چونے کی دیوار، بے ترتیب بجلی کے تاروں کا جنگل، بڑی سی بالکنی، بڑا سا باورچی خانہ اور چھوٹا سا باتھ روم۔ اب ہمیں کھسکنے کے لیے مشقت کرنی پڑ رہی تھی۔ ایک چوہا ہمارے پاؤں کے بیچ سے تیزی سے بھاگا، شاید اتنی بھیڑ سے وہ بھی

گھبرا گیا ہوگا۔ قدیر اب بھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا مگر اب میں اسے کھینچ رہا تھا۔ ہم بھیڑ کے منھ پر پہنچ چکے تھے۔ لوگ بات چیت میں مصروف تھے؛ پچھلے میچ کی اور آنے والے الیکشن کی باتیں۔ لاش پیلی بیڈشیٹ کے نیچے پڑی تھی۔

پولیس والا بیڈشیٹ ہٹانے لگا۔ سبھی کی نظریں اسی لمحے کے انتظار میں تھیں، جواب جم سی گئی تھیں۔ بیڈشیٹ ہٹی اور 'یا اللہ رحم'... 'ہے بھگوان' کا جھونکا ہوا میں لہرایا۔ قدیر اب بھی میرا ہاتھ زور سے پکڑے ہوئے تھا۔

''ان بچوں کو کس نے یہاں آنے دیا؟''

جس کا نام تک لوگ کل تک اپنی زبان پر نہ لاتے تھے، وہی اب ان کے چاروں طرف بکھری پڑی تھی؛ کھانے کی میز پر، شادی بیاہ میں، جنازوں میں، ملاقاتوں میں۔ کسی نے ہمیں لاشوں کے ساتھ گزارے وہ دو لمحے بھولنے نہیں دیے۔ لوگوں کو صدمہ آنٹی کی موت پر نہیں، بلکہ اس بات پر لگا تھا کہ ان کی موت کا سبب خودکشی نہیں تھی۔ لوگوں کو پہلے سے پتہ تھا کہ یہی ہونے والا ہے، بس وقت وقت کی بات ہے۔ اب پھر سے ہماری کالونی میں راحت تھی، سکون تھا۔ کالونی کا وقار پھر سے قائم ہو گیا تھا۔

ہمارے گھروں میں اکثر بولا جاتا تھا کہ 'بڑوں کی بات نہیں مانوگے تو اس جیسا حال ہو جائے گا۔' پہلے یہ بات ہمارے چچا کے لیے بولی جاتی تھی جو کالج کی کسی لڑکی کے ساتھ فرار ہو گئے تھے اور کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ لیکن میرے گھر والوں کو لگتا تھا کہ آنٹی اب زیادہ ڈراؤنی مثال ہے، اس لیے چچا کی جگہ آنٹی نے لے لی۔ ہری سبزی نہیں کھاؤگے تو آنٹی جیسا حال ہو جائے گا۔ صبح جلدی نہیں اٹھوگے تو آنٹی کی طرح ہو جاؤگے (حالاں کہ ہر روز مجھ سے اور قدیر سے پہلے آنٹی بس اسٹاپ پر کھڑی نظر آتی تھیں)، بڑوں سے بحث کروگے تو... (پہلی بات یہ کہ میں نے آنٹی کی آواز کبھی نہیں سنی تھی، دوسری بات یہ کہ آنٹی کے گھر پر کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں تھا، وہ اکیلی تھیں۔)

لیکن کچھ بھی ہو اب میں ممی کا ہرا کچرا حلق کے نیچے اتارنے لگا تھا اور اپنا منھ بند رکھنے لگا (مگر زیادہ دنوں تک نہیں)۔ منھ بند رکھنے کا نقصان یہ ہوا کہ اب میں سوچنے لگا تھا، سننے لگا تھا۔ سنا تھا کہ وہ آنٹی کبھی جوان بھی تھیں اور سنا تھا کہ انھیں پیار بھی ہوا تھا، کسی شادی شدہ شخص سے۔ سب کچھ یوں ہی چلتا رہتا اگر وہ چپکے سے آنکھیں چار کرتے، سفید چادروں کے پیچھے یا نیچے ملتے

مگر وہ بیوقوف قیمت ادا کرنے کو تیار ہو گئے اور یہیں سب کچھ گڑ بڑ ہو گئی۔ وہ ساتھ رہنے لگے۔ شروعات میں وہ ایک دوسرے کے لیے کافی تھے، انھیں کسی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وقت گزرتا رہا، وہ اب بھی ساتھ تھے مگر انھیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ اکیلے ہیں، بالکل تنہا۔ ایک روز وہ آدمی اپنے گھر واپس لوٹ گیا لیکن آنٹی لوٹ نہیں پائیں... پیچھے کچھ بچا بھی تو نہ تھا۔

آنٹی لوور ڈویژن کی کلرک تھیں، اسی لیے انھیں سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا مگر انھیں ہماری کالونی میں کبھی جگہ نہ مل سکی۔ کبھی کسی سردی کی شام میں، جب دھند پھیلی ہوئی تھی، وہ آفس سے لوٹی ہوں گی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ان کے دبلے پتلے ہاتھ کانپ رہے تھے، چائے بناتے ہوئے۔ اس دن شکر کا ڈبہ خالی ملا۔ پڑوسیوں سے مانگنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اندھیرے میں شکر کا تھیلا لیے وہ دھیرے دھیرے آ رہی تھیں۔

ایسا ہوا یا نہیں، مجھے پتہ نہیں، مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے اتنے برسوں کے درمیان یہ ہوا ہی ہوگا۔ میں قدیر کے گھر پر تھا۔ قدیر کے پاپا اخبار پڑھ رہے تھے اور اس کی ممی چائے بنا رہی تھیں اور بولتی چلی جا رہی تھیں: ''اس نے کچرا جمع کر رکھا تھا، صوفوں کے نیچے، پلنگ کے نیچے، بالکنی میں۔ لوگ ڈپریشن میں کیا کیا کرتے ہیں۔'' قدیر کے پاپا نے اچانک اخبار کو رکھتے ہوئے کہا، ''سچ میں۔''

پتہ نہیں اس وقت ان کے دماغ میں وہ کچرے والی لڑائی گزر رہی تھی یا نہیں۔ صبح آفس جانے سے پہلے آنٹی نے کچرا باہر رکھا تھا، مگر کسی آوارہ کتے نے کچرے والے کے آنے سے پہلے اسے پھیلا دیا تھا۔ (دراصل میں نے اور قدیر نے۔) شام کو آنٹی شال میں لپٹی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ گلی کے کونے پر ان کے نظر آتے ہی قدیر کی ممی ایسی شروع ہوئیں کہ ہر کوئی اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔ قدیر کی ممی کا ہر جملہ 'رانڈ' پر ختم ہو رہا تھا۔ آنٹی گردن نیچی کیے چلتی رہیں۔ وہ روئی نہیں کیوں کہ اس زندگی کا انتخاب انھیں کا تھا۔

آنٹی کی موت سے پہلے قدیر اکثر بولا کرتا تھا کہ ہم تیرے انکل کی طرح گھر چھوڑ دیں گے، مگر اس کے بعد اس نے کبھی نہیں کہا۔ اس نے پھر کبھی مجھے زور سے بھینچا نہیں۔ کچھ تھا جو آنٹی کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ وہ لمحے جو خاموشی سے ہرے بھرے ہوتے تھے، اب وہ غائب ہو چکے تھے۔ ان لمحوں میں، میں نے اس سے پوچھا تھا کہ آنٹی کی غلطی کیا تھی؟

''پیار ہی تو کیا تھا اس نے۔'' میری سانسیں تیز چل رہی تھیں۔

''شادی شدہ آدمی سے۔'' قدیر نے کہا اور میں اب اس کے بغل میں لیٹ گیا تھا۔
''پیار اندھا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔
''لیکن سماج نہیں۔''

میں اس کی طرف دیکھتا رہا... اپنے کمزور قدیر کی طرف۔ وہ بولتا چلا گیا، ''پیار ہو گیا تھا تو ضروری تھا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر اسی کے گھر جا بیٹھے؟ پیار کی صلیب پر چڑھنا ضروری ہے؟ غلطی پر انھیں اس کی قیمت ادا کرنے کو کس نے کہا تھا؟''

اب وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا، میں نے اپنی نظریں پھیر لیں۔

ہمیں پتہ تھا کہ وہ غلط تھیں، ہمیں پتہ تھا کہ ہم غلط تھے، یا پھر ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ جو الگ ہے، وہ غلط ہے۔ کچھ بھی ہو... ہم، جو پہلے اپنی ان شاموں کی قیمت چکانے کو تیار تھے... خاص کر جب میں اس کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھتا تھا اور وہ میری دھڑکنیں سنتا تھا... مگر اب نہیں... قیمت جاننے کے بعد تو بالکل نہیں... لال پیلی چیک والی چادر... سفید چادر تمھاری ہر غلطیوں کو ڈھانپ لیتی ہے... تمھاری کہانی کچھ بھی ہو مگر اختتام شایانِ شان ہونا چاہیے۔ بھلا کون آخری بار اپنی ہی لال پیلی چیک والی بیڈ شیٹ میں خود کو لپیٹا جانا پسند کرے گا جس پر اس نے کبھی کھاتے ہوئے دال گرائی ہو گی؟

وقت گزرتا رہا، ہم نے قیمت نہیں چکائی مگر غلطیاں جاری رہیں۔ ہر بار دل کے کسی کونے میں انجانا خوف زندہ رہا۔

قدیر کی شادی سے پہلے جب میں اس سے ملا تو اس نے آنکھیں جھکا کر کہا تھا، ''میں اکیلے نہیں جینا چاہتا۔'' شاید اس کا مطلب تھا کہ میں اکیلے نہیں مرنا چاہتا... آنٹی کی طرح نہیں مرنا چاہتا... سنسان گھر میں اکیلے، چھوٹے سے باتھ روم میں پھسل کر۔ اپنے خون کو رِستے دیکھ کر، دھیرے دھیرے ہوش کھوتے ہوئے نہیں مرنا چاہتا۔ کسی کا انتظار کرتے ہوئے نہیں مرنا چاہتا۔ اور مرنے کے بعد دو دنوں تک سڑنا نہیں چاہتا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی لاش کے کانوں کو چوہے کتر جائیں۔ وہ آنٹی کی طرح لال پیلی چیک والی بیڈ شیٹ میں ملفوف نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اور وہ ہوا بھی نہیں۔ پانچ سال بعد جب میں آخری بار اس سے ملا تھا تو وہ اسپتال کی سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کا پورا خاندان اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اسے ہمیشہ بھیڑ سے ڈر لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں مگر ہماری نظریں بار بار مل رہی تھیں۔ سب

جا چکے تھے۔ آخر میں اٹھ کر میں قدیر کے پاس آیا۔

''میں ہمیشہ تیری دھڑکن سنتا تھا، آج تو میری سن لے، زیادہ نہیں بچی ہے۔'' وہ رو رہا تھا، ''میں مر رہا ہوں۔''

''مجھے پتہ ہے قدیر۔''

''اور سب سے عجیب بات کیا ہے کہ میں خوش ہوں۔ سب کچھ ختم ہو رہا ہے... خوف، شرم، درد... سب ختم ہو رہا ہے۔''

''بکواس مت کر قدیر۔'' میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا، میرے گلے میں کچھ اٹک سا گیا تھا۔

''زندگی بہت پہلے ختم ہو گئی تھی میری۔ پیار، محبت، انسیت، رومانس، قہقہے سب ٹُو لے گیا تھا یار۔ تجھے یاد ہے اپنے پڑوس کی آنٹی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میرا سب سے بڑا ڈر تھا کہ میں ان کی طرح نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اکیلے نہیں مرنا چاہتا تھا... یار اکیلے جینے سے زیادہ اکیلا مرنا بہت تکلیف دیتا ہے۔ ایسا درد اٹھتا ہے کہ ...'' اس کی سسکیاں گونجتی رہیں۔

اگلے دن قدیر کے کوارٹر میں بھیڑ جمع تھی۔ میں آنکھ ملتے ہوئے باہر نکلا، میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی، مگر مجھے کوئی وہاں کھینچے لے جا رہا تھا۔ گول سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے میں پھر ایک لاش کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ وہی مانوس باتیں کر رہے تھے؛ گزشتہ انتخابات کی، آئندہ میچ کی۔ میرا پورا جسم کانپ گیا... ایسا لگا جیسے آنٹی بھی اسی بھیڑ میں کھڑی مسکرا رہی ہے اور کسی کونے سے سفید چادر میں لپٹی لاش مجھے دیکھ رہی ہے۔ اسی وقت ایک چوہا میری دونوں ٹانگوں کے بیچ سے گزر گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔

- 4 -

یہ باتیں اس دور کی ہیں جسے گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، مگر اتنا کچھ بدل چکا ہے کہ باتیں کسی اور ہی صدی کی لگتی ہیں، جو لوگوں کی آنکھوں سے بچ کر نکل گئیں۔ اب انھیں جاننے پہچاننے والا کوئی بچا نہیں ہے۔ یہ کہانیاں ان لوگوں کی ہیں جنھیں سننے والا کوئی نہیں ہے، جنھیں سنانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ لوگ جو کچھ بکھرے ہوئے تھے، جو کچھ ٹوٹے ہوئے تھے، شرمسار تھے، لیکن کسی حجاب کے بغیر مجھ سے کبھی ملے تھے۔

اس گھنگریالے بال والے ادھیڑ شخص نے کہا تھا، ''مجھے لگتا نہیں تھا کہ کبھی پیار ملے گا، مگر مجھے ملا۔ یہ کتنا عجیب تھا کہ مجھ اسے دور دھکیلنا بھی پڑا۔ مجھ سے چھٹک کر دور جاتے ہوئے اس نے سرگوشیوں میں کچھ کہا تھا جو مجھے یاد نہیں۔ اس دور کی ہر بات کی طرح جو مجھے اس وقت پتہ تھی لیکن اب یاد نہیں۔''

اور ہاں، اس چمکیلے دانت والے آدمی نے ایک چھوٹے سے شہر کے پاس چھوٹے سے ہوٹل میں کہا تھا، ''جانتے ہو، میں بھی دو سال پہلے ممبئی میں تھا، کیا واقعی تھا میں؟'' پھر بہت ساری بکواس کرنے اور تین پیگ حلق کے نیچے انڈیلنے کے بعد وہ بولا، ''میرا ریٹرن ٹکٹ ہو چکا تھا، آخری کچھ دن بچے تھے، تب میں اس سے ملا تھا۔ وہ ایکٹیوسٹ تھا... میرا پہلا، آخری، اکلوتا، آؤٹ اوپن ایکٹیوسٹ۔'' اس نے ایک دنیا دیکھ لی تھی، چھوٹی چھوٹی امیدیں اور بڑی بڑی سچائیاں دیکھتا رہا۔ اس نے سب دیکھا تھا، مگر اس کی آنکھوں کے نیچے جھریاں نہیں تھیں۔ عجیب تھا... سب کچھ الگ تھا۔ پہلی بار کچھ پگھل نہیں رہا تھا، خود سے نبرد آزما نہیں تھا... خوفزدہ نہیں تھا۔ ''ارے نشان پڑ جائے گا... سنبھل کے... کاٹنا مت... سوچو تو، میں ہزاروں لوگوں سے ملا، مگر میرے 'میں'

ہونے کا کہیں کوئی نشان باقی بچا ہوگا تو وہ اس کے جسم پر ہوگا۔ ہاہاہا۔"
"میرا نام؟... راہل۔"

ایک بڑی آنکھوں والے انقلابی بوائے فرینڈ نے ہاسٹل کی چھت پر مجھ سے کہا تھا،
"اپنی اصلیت کو بستر کے نیچے مت چھپاؤ... آنے دو باہر سچ کو... تم مت چھپو اس سے جو تم سے ڈرتا ہو... اسے اور ڈراؤ... اتنا ڈراؤ کہ وہ خود ہی چھپ جائے۔"

وہ انقلابی تھا، شاید اس لیے ہمیں الگ ہونا پڑا۔ میری زندگی آگے بڑھ گئی۔ کچھ بھی پیچھے نہیں چھوٹا، کیوں کہ کچھ بچا ہی نہ تھا۔ کچی مٹی کی دیوار پہلی بارش میں ہی ڈھ گئی۔

طویل خاموشی کے بعد میں اٹھا، کچھ بولنے کی ناکام کوشش کی اور چل پڑا۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ پایا کہ وہ رو رہا ہے، یا سر جھکائے بیٹھا ہے یا وہ بھی اٹھ کر چل دیا کیوں کہ میں ڈرتا تھا کہ وہ کہیں میری طرف اب بھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے تاک نہ رہا ہو۔

سو میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا اس نے خودکشی کر لی؟ (جیسا اکثر وہ بولتا تھا) کیا وہ اب بھی زندہ ہے اور اس نے شادی کر لی؟ کیا وہ دو بچیوں کا باپ ہے یا وہ امریکہ چلا گیا؟ یا شاید اب وہ انقلابی ہو؟ مجھے کچھ نہیں پتہ۔

مجھے وہ بھوری ڈاڑھی والا سفید مہاراشٹرین اب تک یاد ہے جس نے کہا تھا، "آئی واز ریپڈ... میرے خالو نے... بھالو جیسے بال ان کے جسم پر تھے... ایک ہی رات میں کئی بار... درد سے چیخ رہا تھا میں... نہ جانے کیوں کوئی سننے والا نہ تھا۔ پتہ ہے... ختم ہونے کے بعد اس حرامزادے نے کیا کہا تھا... 'اگلی بار اتنا درد نہیں ہوگا۔'

"دماغ بھی کیا کھیل کھیلتا ہے کہ برسوں بعد اس رات کی پوری یاد بدل گئی۔ -some
times I even masturbate remembering that night۔

"میں ان سے ایک بار ملا بھی، برسوں بعد... بوڑھا ہو گیا تھا۔ بغیر دانت والا بھالو۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ بیمار ہے، عمر ہو گئی ہے، بھولنے لگا ہے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو بھی نہیں پہچان پا رہا تھا۔ کسی نے اس کے کان میں چیخ کر کہا، "دیکھو کون آیا ہے؟... للیتا کا چھوٹا بیٹا... فٹ بال کھیلنے جو ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔"

''وہ مجھ سے نظریں نہ ملا سکا... رونے لگا مادر چود۔''

''اس خالی فلیٹ میں کچھ استعمال میں آتا ہے تو وہ ہے میرا بستر۔ گیس کب کی ختم ہو چکی ہے، فریج خالی ہے، ٹی وی ہے مگر کیبل نہیں ہے۔ میں نے اپنے گھر پر کبھی کسی کو نہیں بلایا جنھیں میں جانتا ہوں۔ کبھی کوئی کہتا، 'بھول گئے کیا؟' تو یاد آتا کہ پہلے بھی ہماری ملاقات ہو چکی ہے... کسی دوپہر میں یا شام کے جھٹپٹے میں... اسی طرح... وہی تمبا کو بھری سانسیں... وہی کھٹا سا ذائقہ... وہی ادھورا پن۔''

''کئی راتوں کو ڈر لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اجنبی جو میرے گھر پر آیا تھا، جو میرے بستر پر لیٹا تھا (بغیر کپڑوں کے)، وہ اب تک لوٹا نہیں ہے۔ وہیں کہیں اوٹ میں چھپ کر بیٹھا ہے... پلنگ کے نیچے... دروازے کے پیچھے۔ مجھے دبوچ لے گا، ایک چیخ بھی حلق سے باہر نہ آ پائے گی، برسوں تک لوگوں کو معلوم ہی نہ ہوگا، ممکن ہے کہ کبھی پتہ ہی نہ چلے میرے نہ ہونے کا، یا کبھی میرے ہونے کا۔''

''تم کچھ کہا کرتے تھے نا، شاید اصلیت کو لے کر... کچھ اچھا سا تھا... کیا تھا؟''

مچھروں کی بھنبھناہٹ نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔

تھک گیا ہوں میں... تھکی ہوئی سرخ آنکھیں اب جلنے لگی ہیں۔ میرے خواب چہروں سے بھرے ہیں، جن کا نام میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ بچپن میں چھپائی ہوئی شیشے کی گولیوں کی طرح میں اپنی شناخت بھی کہیں چھپا کر بھول گیا ہوں، جواب شاید ڈھونڈے نہیں ملے گی، یا شاید مل جائے، کوشش تو بہر حال جاری رہنی چاہیے، آخری سانس تک۔

- 5 -

مئی - جولائی ۲۰۱۸ء

('گرائنڈر ایپ' پر)

ارمان ۲۱۳۲: 'باڈی نہیں پلیز۔'

سیکسی ۷۰۰: 'ٹھیک ہے۔'

ارمان ۲۱۳۲: 'نوکسنگ، نوٹچنگ ۔'

سیکسی ۷۰۰: 'ٹھیک ہے۔'

ارمان ۲۱۳۲: 'صرف بلوجاب (blowjob)'

سیکسی ۷۰۰: 'ٹھیک ہے۔'

ارمان ۲۱۳۲: 'ممم ۔ جب تم 'بلو' کروگے، اگر میں اسموک کروں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟'

سیکسی ۷۰۰: 'بالکل نہیں... کیوں ہوگا؟'

یہ تیسری دفعہ ہے جب کسی نے یہ پوچھا تھا اور یہ تیسری بار ہے جب میں نے ان دو دنوں میں حامی بھری ہے۔

ایسی بہت کم چیزیں ہیں، جن میں ، میں اچھا ہوں، اور بلوجاب ان میں سے ایک ہے۔ یہ حقیقت ہے، جیسے مجھے پتہ ہے کہ میں بایاں ہتھا ہوں، اور یہ کہ میں بہت دیر تک اپنی سانسیں روک سکتا ہوں، اسی طرح مجھے پتہ ہے کہ کب رکنا ہے، کب کرنا ہے، کب کرنے کا ناٹک کرنا ہے مگر رکے رہنا ہے، کب منھ کے کونے کی دیواروں پر، کب دانت، کب زبان اور کب

صرف چومتے جانا ہے۔

غرغراتی ہوئی 'آہا آ آ آ' اور 'باتھ روم کہاں ہے' کے درمیان کبھی کسی نے میرے اتنا اچھا ہونے کی وجہ پوچھی تھی۔ بہت غور کرنے کے باوجود میں صرف اتنا ہی بول پایا، ''میری عقل داڑھ نہیں ہے۔''

''کیا؟''

''وزڈم ٹیتھ (wisdom teeth)۔''

''کیا بکواس ہے یہ؟ پولیس کی نوکری میں کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ سالے مرجاتے ہیں اور اپنا پاپ ہم سے پڑھواتے ہیں۔''

''ریلیکس پاٹھک صاحب! اس دنیا پر کاپی رائٹ آپ کی نہیں ہے اور نہ ہی یہاں رہنے والے ہر شخص کے جوتے کی سائز ۹ نمبر ہے۔''

''بنرجی دا، آپ سائیکاٹرسٹ ہیں۔ آپ کو لوگوں کی کیس ہسٹری اسٹڈی کرنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ ہم بھی کرتے ہیں، لیکن ہم لوگ چور چمار، ڈکیت، مرڈرر اور زیادہ سے زیادہ ریپسٹ کی کنڈلی نکالتے ہیں، یہ گڑ چال ہمارے بس کا نہیں۔''

''پاٹھک صاحب! مت بھولیے کہ اس 'گڑ چال' کو ہمارے ملک کا قانون نارمل مان چکا ہے، میڈیکل سائنس مان چکی ہے، دنیا کے تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک مان چکے ہیں۔ آپ نہیں مانتے تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔''

''لیکن بنرجی دا، یہ سیدھا سیدھا سوسائڈ کیس ہے، پھر اتنی مغز ماری کی ضرورت کیا ہے؟''

''ایک بار پھر آپ بھول رہے ہیں کہ وہ مرا نہیں ہے، زندہ ہے۔''

''کیا فرق پڑتا ہے؟ زندہ لاش بن چکا ہے۔''

''ہاں، لیکن زندہ کا لفظ اب تک اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔''

''دیکھیے بنرجی دا، ہم نے اپنی کارروائی مکمل کر لی ہے۔ ہم اس کے فلیٹ پر بھی گئے

تھے۔ یہ LGBTQ کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا... سوری، رکھتا ہے۔ اور آپ ہی کا ہم پیشہ ہے، یعنی سائیکاٹرسٹ۔ اس کا یہ جو لیپ ٹاپ ہے، اس میں اس کے clients یا مریضوں، جو بھی آپ کہہ لیں، ان کی کیس ہسٹری ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ اپنے کلائنٹس کی چھوٹی سی چھوٹی باتیں تک درج کرتا تھا۔ کلائنٹس کے بیان، اپنے شبدوں میں پورے ایموشنز اور ڈرامائی انداز میں نوٹ کرتا تھا۔''

''جی ہم میں سے بعض ڈاکٹر detailing پہ بہت کام کرتے ہیں، مثلاً کلائنٹ کے محسوسات، اس کے روزمرہ، طرزِ گفتگو، حتیٰ کہ واقعات کی تاریخ بھی ان کے لیے اہم ہوتی ہیں۔''

''رائٹ بنر جی دا... اب یہ ایک کلائنٹ کی ہسٹری شیٹ ہے۔ اس میں تاریخ بتاریخ ایسا لکھا ہوا ہے جیسے یہ ایک ڈائری ہو۔''

جنوری۔ جون ۲۰۱۸ء

اسے میں عرصے سے دیکھ رہا تھا؛ 'نہارنا' زیادہ درست لفظ ہے۔ مجھے ہر ہفتے ٹرین سے سفر کرنا ہی پڑتا تھا؛ جمعہ کی شام کو اور پھر سموار کی صبح کو واپسی۔ ایک ہی چیئر کار ٹرین، بڑی بڑی کھڑکیاں، کانچ کے دروازے۔ وہ تیسرے یا چوتھے اسٹیشن تک آ ہی جاتا تھا؛ 'Meals on Wheels' کی ٹی شرٹ پہنے ہوئے۔ صرف چار لفظ تھے ہمارے درمیان، 'بریڈ، کٹلیٹ، پوہا اور آملیٹ۔' وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا؛ کتنا بڑا تھا یہ نہیں پتہ۔ عمر میں چاہے وہ مجھ سے آگے نکل گیا ہو لیکن اتنا تو طے تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔

اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی چمک تھی، وہ ہنستا بھی بچوں جیسا تھا۔ عمر، مہنگائی، اقلیت، کشمیر، افریقہ، ڈونالڈ ٹرمپ، عمران خان، لوک پال، نوٹ بندی وغیرہ نے جیسے اسے چھوا تک نہ تھا۔ اس کے بال معمولی سے پیچھے کھسک چکے تھے، جیکی شراف والی مونچھیں تھیں، غریبوں والا سانولا پن تھا، بالکل دبلا پتلا تھا مگر لگتا نہیں تھا جب تک کہ آپ اس کی بانہوں کو اپنی مٹھی کی گرفت میں نہیں لے لیتے۔

شروع شروع میں نظریں پھسل جاتی تھیں، پھر ٹھہرنے لگیں، پھر وہیں جم جاتی تھیں۔

''بریڈ، کٹلیٹ، پوہا، آملیٹ۔''

ایک روز، فروری کی یخ صبح کو وہ پگھلا اور ہلکا سا مسکرایا۔ بہت سے سوال پوچھنے تھے۔

جگہ، پسند، شوق، ٹاپ/ باٹم/ ورسٹائل؟ ویری ٹاپ/ ویری باٹم؟ مور ٹاپ یا مور باٹم؟ نہیں...
کچھ نئے سوال... سوال جو بامعنی الفاظ کے ساتھ کچھ پُرمعنی بناتے ہوں۔ مجھے پوچھنا تھا، اس کے ہونٹوں پر کاٹنے کا نشان کیوں ہے؟ وہ گٹکے کا کون سا برانڈ چباتا ہے؟ کیا اس کا رونے کا کبھی دل کرتا ہے... یوں ہی؟ کیا وہ بھی گھنٹوں کسی بھولے بسرے گانے کی دھن گنگناتا ہے؟ کیا اس کو بھی آم پسند ہے؟ وہ اسے کاٹ کر کھاتا ہے یا چوس کر؟

لیکن میں نے صرف یہی پوچھا، ''پوہا کتنے کا ہے؟''

ہم مسکراتے رہے، ایک دوسرے کو نہارتے رہے۔

جولائی ۲۰۱۸ء

جولائی میں دو ہی بار میں گھر جا پایا۔ وہ نہیں ملا، کوئی نیا لڑکا تھا، وہ نہیں تھا۔

اگست ۲۰۱۸ء

بارش ہو رہی تھی۔ ٹرین لیٹ تھی۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا جلدی پھیل گیا تھا۔ ٹرین آئی۔ وہ کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنے سر کے بال منڈوا لیے تھے۔ مجھے وہ کچھ اداس سا لگا اور کچھ بڑا بڑا سا بھی۔ ان کچھ مہینوں میں اس نے وہ فاصلہ طے کر لیا تھا جو وہ اتنے برسوں میں نہیں کر پایا تھا۔ اس کی آنکھیں چمکیں اور پھر بجھ گئیں۔ وہ آیا، ''بریڈ، کٹلیٹ، پوہا، آملیٹ''، لیکن ہر بار کی طرح اس نے بار بار چکر نہیں لگایا۔

اس نے بال کیوں ترشوا لیے؟ کیا اس کا کوئی عزیز مر گیا تھا؛ باپ؟ ماں؟ بیوی؟ یا کوئی پرانی منت پوری ہوئی ہے؟ یا وہ کہیں پکڑا گیا ہو؟ میں ایک بار صفدر گنج کے ٹائلٹ میں پکڑا گیا تھا، لوگ یہی چلا رہے تھے ''بال کاٹو سالے گانڈو کی۔''

ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء

اس کے بال پھر بڑھ آئے تھے۔ میں اب پیسے دیتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو ہلکے سے چھو لیتا تھا، بعد میں اس نے بھی پوہا دیتے ہوئے مجھے دھیرے سے چھونا شروع کر دیا۔

نومبر ۲۰۱۸ء

ٹرین تقریباً خالی تھی۔ مجھے ہلکا سا بخار تھا۔ میں سویا پڑا رہا۔ کوئی پوہا چھوڑ گیا تھا۔ اس نے یا شاید میرے بغل والے نے... پتہ نہیں۔ پوہا باس مار رہا تھا، ہر بار کی طرح۔

دسمبر ۲۰۱۸ء

میرا تبادلہ ہو گیا تھا۔ میں نے کافی کچھ بیچ دیا تھا اور کافی کچھ گھسیٹے چلا آ رہا تھا۔

اس نے مجھے اتنے سامان کے ساتھ دیکھا تو شاید وہ بھی سمجھ گیا کہ یہ آخری بار ہے۔ وہ ہڑبڑا رہا تھا... بار بار میرے ہی کمپارٹمنٹ میں آ رہا تھا، ''بریڈ، کٹلیٹ، پوہا، آملیٹ۔'' میں ہر بار باتھ روم جانے کے بہانے اس سے ٹکرا رہا تھا... کبھی اس کے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے رہا تھا... تب مجھے علم ہوا کہ وہ دبلا ہے مگر لگتا نہیں ہے۔

پھر میں اس کے پیچھے دور تک گیا۔ وہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے پینٹری میں اپنی ٹرے رکھی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ سر میں خون کی رفتار بڑھ گئی تھی یا پھر شاید سست ہو گئی تھی۔ ہر چیز ٹھہرتی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے اتنے برسوں سے جو گانا بھولنے کے باوجود میں گنگناتا رہا تھا، وہ اب پوری طرح بھول چکا ہوں۔

وہ میرے کچھ پوچھنے کا انتظار کر رہا تھا، مگر میرے دماغ نے تو اب کام کرنا ہی بند کر دیا تھا۔ دھک دھک... اب مجھے پکا یقین ہو گیا تھا کہ میرے سر پر خون کی گردش واقعی تیز ہو چکی ہے۔

''کہاں جاؤ گے ساب؟'' اس نے پوچھا۔

وہ تھوڑا اور مسکرایا۔ وہ دروازے کے اُس پار تھا اور میں دروازے کی دوسری طرف، ہمارے درمیان دروازہ تھا۔

میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے پایا؛ یہ دروازہ جس تک ۱۴۰۰۰ کلومیٹر (ایک سال، ۱۴ چکر، پانچ سو کلومیٹر = ۵۰۰ ☆ ۱۴ ☆ ۲) طے کر کے پہنچا ہوں، اب مجھ سے پار نہیں کیا جا رہا ہے۔ اسی وقت عقب سے آواز آئی، ''بریڈ، کٹلیٹ، پوہا، آملیٹ۔'' لیکن وہ تو خاموش تھا۔ دوسرا کینٹین بوائے آواز لگاتے ہوئے اسی طرف آ رہا تھا۔ میں نے دروازہ پار کرنے کی کوشش کی مگر اس نے اپنے سر کو ایسے جنبش دی کہ ابھی نہیں۔ اس نے دھیرے سے کچھ کہا بھی جو میں سن نہ

پایایا شاید سمجھ نہ پایا کیوں کہ دماغ نے تو کام کرنا بند کر دیا تھا۔
دوسرا کینٹین بوائے بہت قریب آچکا تھا۔ ''بریڈ، کٹلیٹ، پوہا، آملیٹ۔''
''کیا؟'' وہ اپنی ٹرے اٹھانے لگا۔
''نمبر ملے گا؟''
اس نے اثبات میں سر ہلایا، پیچھے دیکھتے ہوئے ٹرے لیے آگے بڑھا۔ وہ چھوٹے سر والا دوسرا کینٹین بوائے آپہنچا تھا۔
میرا اسٹیشن آگیا تھا۔ میں اتر گیا۔ ٹرین بھی زیادہ دیر نہیں رکی، چل پڑی۔

عرصہ ہو گیا ہے۔ میرا تبادلہ پاس ہی ہو گیا ہے۔ میں ہر ہفتے بس سے سفر کرتا ہوں؛ جمعہ کی شام کو، سموار کی صبح۔ بس کا کنڈکٹر، جسے میں پیسے دیتے ہوئے دھیرے سے چھو لیتا ہوں، وہ بھی ٹکٹ دیتے ہوئے مجھے چھو لیتا ہے۔ کئی بار جب وہ گرمیوں میں مسکراتا ہے، راستے جانے پہچانے لگتے ہیں۔ اس نے دھیرے سے کیا کہا تھا جو میں سن نہیں پایا، سمجھ نہیں پایا۔ کئی بار لگتا ہے جیسے اس نے کہا ہو، ''چھونا مت... چومنا مت... صرف چوکو بار... جب پی رہا ہوں گا سگار۔'' اور کئی بار لگتا ہے کہ شاید اس نے پوچھا ہو، ''آپ آم کاٹ کر کھاتے ہو یا چوس کر؟''

''پورا ڈرامہ ہے سالا... یہ ہسٹری شیٹ ہے یا سیکس پنچا نگ؟... بنرجی دا، آپ میری بات مانیے یہ آدمی کھسکا ہوا تھا۔ اپنے کلائنٹ کے کیس کو elaborate کرتا تھا، اس میں مرچ مسالہ لگا کر اپنا کیس بنا لیتا تھا، پھر اسے خود ہی بھوگتا بھی تھا۔''
''ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے 'کھسکا' ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسے تو پھر ان تمام لوگوں کو ہمیں کھسکا ہوا کہنا پڑے گا جو masturbate کرتے ہوئے اپنی گرل فرینڈ یا کسی پورن اسٹار کا تصور کرتے ہیں۔''
''زمین آسمان کا انتر ہے ان دونوں میں۔ مُٹھ مارنے والا ایک دو منٹ تک اس کلپنا میں جیتا ہے لیکن مجھے تو لگتا ہے، اس نے کئی لوگوں کی زندگیاں ایک ساتھ جینی شروع کر دی تھیں۔''

''انٹرسٹنگ!''

''ہاں جیسے یہ دیکھیے، ہمارے سوسائڈر بھائی صاحب کہانی کار بھی تھے، دیکھیے کیا لکھتے ہیں...

''میں ایک ایسا قاتل ہوں جس نے کبھی کسی کا قتل نہیں کیا اور نہ کرنے کا ارادہ ہے لیکن پھر بھی مجھے ساری سزائیں قبول ہیں۔

''میرے دماغ کے دروازے کھلتے ہیں اور ان سے نکل کر میرے تخیل میں ایک ناول کا آئیڈیا داخل ہوا ہے۔ ایک آدمی سمندر کنارے چل رہا ہے اور اس کے دماغ میں کسی دوسرے مصنف کے جملے گونج رہے ہیں۔ آدمی ایک ناکام شاعر ہے۔ وہ ایک ناکام عاشق، دوست، بیٹا، بھائی اور ملازم بھی ہوسکتا ہے۔ سمندر کے کنارے ناریل کے پیڑ ہیں۔ سمندر کے اوپر بادل ہیں اور یکے بعد دیگرے کئی ہوائی جہاز ان بادلوں کی طرف جا رہے ہیں۔ سمندر کی دوسری طرف بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔

''ناکام آدمیوں کو کبھی بھی بندوق نہیں دینا چاہیے۔ آدمی رُک کر سمندر کی طرف دیکھتا ہے اور اس کی نظر بار بار سمندر کی سرحد تک پہنچتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے زمین یہیں ختم ہوجاتی ہو۔ سمندر کی لہریں بار بار آ کر ساحل کو چھوتی ہیں۔ اس لمس میں تشدد، انا، عزت نفس، خود پسندی اور محبت کچھ بھی ہوسکتی ہے جو سامنے والے کے 'ڈی کوڈ' کرنے کی صلاحیت پر منحصر کرتی ہے۔ میں اگر تم سے محبت کرتا ہوں تو کیا یہ کافی نہیں ہے، خواہ یہ ایک طرح کی عدم بلوغت کا نتیجہ ہو، میرے اکیلے پن کا بائی پروڈکٹ ہو، میرے اندر کی چھٹپٹاہٹ ہو۔ میں اکثر خودکشی کے بارے میں اسی لیے سوچتا ہوں کیوں کہ میرے پاس بندوق یا زہر نہیں ہے، اگر یہ سب میرے پاس ہوتے تو میں کسی اور کو قتل کر کے قتل کے سارے ثبوت مٹانے کے بارے میں سوچتا۔

''میرے پاس کئی ناولوں کے پلاٹ ہیں جنھیں برسوں سے میں اپنے دماغ میں لکھ رہا ہوں، کاغذ پر نہیں لکھ پا رہا ہوں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ لکھنا پاکیزگی کی ایک قسم ہے لیکن اس کے باوجود نہ لکھنا بہرحال پھوہڑ پن تو ہے ہی۔ میں کبھی فرنانڈو پیسوا نہیں ہوسکتا، میں رابرتو بولانیو جیسا گمراہ بندہ ہوں، حالاں کہ میں سگریٹ، شراب اور ڈرگز نہیں لیتا، پھر بھی بیمار رہتا ہوں۔

''میں کبھی کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا کیوں کہ میرے جسم میں اتنی طاقت نہیں

کہ وہ پولیس کی لاٹھیاں برداشت کر سکے۔

''پتہ نہیں میں کب وہ ناول مکمل کر پاؤں گا جو میں نے کبھی لکھنا شروع ہی نہیں کیا۔ اگر تم مجھے تھوڑا پیار کر لیتے تو شاید مجھے اتنی مشقت نہ کرنی ہوتی، کبھی ناول کو مکمل کرنے کے بارے میں نہ سوچتا کیوں کہ جو ناول ختم ہو جائے وہ ناول ہی کیا۔ ناول تو آپ کو بس ایک دن اچانک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر کسی دوسرے کی زندگی کا باب بن جاتے ہیں۔

''معاف کیجیے گا، میں اسی زبان میں بات کر سکتا ہوں، اسے آپ مصنوعی یا بناوٹی کہہ سکتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ خودکشی کی بات بھی نہیں کروں گا چونکہ خودکشی کی بات کرنا ایک فحش ڈرامہ ہے... کرنا ہے تو خودکشی ہی کرلو۔''

''سائیکو... پورا سائیکو تھا یہ... دیکھا آپ نے، اس نے خود لکھا ہے کہ وہ اکثر خودکشی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔''

''خودکشی کے بارے میں بہت سے لوگ سوچتے ہیں لیکن سوچنے والے خودکشی نہیں کرتے، یہ میرا تجربہ ہے۔ دوسری بات، یہ کہانی نہیں ہے پاٹھک صاحب، خودکلامی ہے۔ لیکن آپ کی یہ بات درست ہے کہ یہ دوسروں کی زندگی بھی جی رہا تھا بلکہ ایک ساتھ کئی زندگیاں جی رہا تھا، اپنے ڈھیر سارے کلائنٹس کی زندگی جو اس سے کبھی ملے تھے، اس سے کبھی بات کی تھی۔ وہ ان کی کہانیوں میں اتنا involve ہو جاتا تھا کہ وہ ان کے دھڑ پر اپنا سر رکھ کر سوچنا شروع کر دیتا تھا۔ شاید اسے ایسا کرنے میں لطف آتا ہو یا پھر کیتھارسس؟... جو بھی ہو لیکن اس سے وہ اپنی خود کی شناخت بتدریج کھوتا جا رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کی اپنی شخصیت اور بہت سوں کے وجود کے ساتھ مل کر گڈمڈ ہو گئی تھیں۔''

''آپ کا مطلب split personality disorder سے ہے؟''

''ہو سکتا ہے لیکن میں اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''بنرجی دا، مجھے تو آپ صرف یہ بتائیے کہ کیا اس کے سوسائڈ اٹیمپٹ (suicide attempt) کی یہ وجہ ہو سکتی ہے؟''

''آپ کو کیس بند کرنے کی بہت جلدی ہے پاٹھک صاحب۔ لیکن میں ایک ڈاکٹر ہوں، مجھے اپنے مریض کے بارے میں رائے قائم کرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

''ہم نے اس کے پاس پڑوس سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ کو یہ سن کر شاید ہنسی آئے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے قبضے میں آتمائیں تھیں، وہ ان سے باتیں کر سکتا تھا، انھیں اپنے پاس بلا سکتا تھا۔ لوگ اس سے ڈرتے تھے۔''

''کیا اس نے کبھی لوگوں کو کوئی نقصان پہنچایا؟ میرا مطلب، کوئی جھگڑا فساد؟''

''نہیں، بلکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ بہت شریف تھا، کسی احمق کی طرح۔ وہ بلڈنگ میں ہمیشہ سر جھکائے داخل ہوتا اور بغیر کسی کی طرف دیکھے، کسی سے دعا سلام کیے، اپنے فلیٹ کے اندر چلا جاتا۔ شادی بیاہ، تیج تہوار، کسی کے جینے مرنے سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، حتیٰ کہ وہ کبھی سوسائٹی کی ماہانہ میٹنگ میں بھی شریک نہ ہوتا، حالاں کہ سکریٹری نے کئی بار اس کے دروازے پر جا کر شکایت بھی کی، ایک بار تو سکریٹری نے اسے کھری کھری بھی سنائیں لیکن وہ صرف سر جھکائے سنتا رہا۔ لوگ اسے گھمنڈی اور غیر مہذب سمجھتے ہیں۔''

''اور شاید اسی لیے انھوں نے اس کے خلاف کہانیاں گھڑ لیں۔''

''ہاں شاید.... لیکن لوگوں نے بتایا کہ کچھ لوگ اس کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔''

''آپ بھول رہے ہیں انسپکٹر کہ وہ ایک سائیکاٹرسٹ تھا، ایک فری لانس سائیکاٹرسٹ۔ آپ کی رپورٹ کے مطابق اس کا نہ تو کوئی کلینک تھا اور نہ وہ کسی اسپتال سے وابستہ تھا۔''

''جی۔''

''تو پھر عین ممکن ہے کہ اس کے کچھ خاص مریض اس کے پاس آتے جاتے ہوں۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سوسائٹی کے واچ مین کے مطابق اس سے ملنے والے لوگ بے ضرر قسم کے ہوتے تھے، کچھ ودیشی بھی ہوتے تھے... ان میں نوجوان ادھیڑ مرد عورت سب طرح کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ زیادہ تر وہ اپنے فلیٹ میں ہوتا ہی نہیں تھا۔''

''ہم...''

''لوگوں کو لگتا ہے کہ اس کے پاس کچھ شیطانی شکتیاں تھیں جن سے وہ لوگوں کا علاج کرتا تھا۔''

''سوسائٹی کے کسی شخص نے کبھی اس سے رجوع کیا؟ اس سے علاج کرانے کی کوشش کی؟''

''ایک بار.... صرف ایک بار.... دراصل سوسائٹی کے سابق سکریٹری کی بیوی نے خودکشی کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ لوگوں نے اسے بچالیا۔ اس کی مدد مانگی گئی۔ وہ اس عورت اوراس کے شوہر کے ساتھ بہت دیر تک کمرے میں بند رہا۔ کئی لوگوں نے دروازے سے کان لگا کران کی باتیں سننے کی کوشش بھی کیں لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اندر سے چیخ پکار کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ یہ بندہ حسب معمول سر جھکائے باہر آیا اور اس کا تعاقب کرتا ہوا گالیوں کے طوفان کے ساتھ سابق سکریٹری بھی۔ کھلے دروازے سے لوگوں نے دیکھا کہ اندر کمرے میں سکریٹری کی بیوی ایک کونے میں سمٹی سسکیاں بھر رہی ہے۔ لوگوں نے سابق سکریٹری سے معاملہ جاننا چاہا لیکن وہ گالیاں بکتا رہا بلکہ لوگوں کی مسلسل پوچھ تاچھ سے وہ ان پر بھی بھڑک اٹھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی بیوی لاپتہ ہوگئی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ سابق سکریٹری نے پولیس تھانے میں ایف آئی آر بھی نہیں لکھوایا۔ دو مہینے بعد سابق سکریٹری بھی اپنا فلیٹ بیچ کر کہیں اور چلا گیا۔''

''تو اس میں شیطانی شکلتیاں کہاں سے آگئیں؟''

''لوگوں کا ماننا ہے کہ اس نے سابق سکریٹری کی اس دن کی بدتمیزی کا بدلہ لیا اور اپنی شکلتیوں کی مدد سے اس نے سابق سکریٹری کا گھر برباد کردیا۔''

''یا پھر ممکن ہے کہ ایک برباد ہوتی ہوئی عورت کو اس نے بچالیا ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔.... میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟''

''NDE''

''مطلب؟''

''Near Death Experience۔ موت کے سفر کا تجربہ۔''

''کیا یہ مرنے والا ہے؟''

''میں نے ایسا کب کہا؟ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ اس وقت مریض NDE کے مرحلے سے گزر رہا ہو۔''

''ڈاکٹر بنرجی! ایک طرف آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ موت کے سفر کا تجربہ کر رہا ہے اور

دوسری طرف آپ اس کی موت کی possibilities سے انکار بھی کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ چونکہ ضروری نہیں کہ موت کا تجربہ کرنے والا شخص مر ہی جائے۔ کئی بار لوگ موت کو شکست دے کر پلٹ بھی آتے ہیں، لیکن وہ موت کے تجربے سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر کسی شخص کی روح زمان و مکاں سے آزاد سفر کرنا شروع کر دیتی ہے۔"

"آپ واقعی ڈاکٹر ہیں یا پھر کوئی دھرم گرو؟"

" International Association for Near Death Studies کے مطابق جیسے ہمارے اعتقادات ہوتے ہیں، ہمیں ویسے ہی تجربے ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم ہندو ہیں تو ہمیں یمراج کے درشن ہو سکتے ہیں اور اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمیں عزرائیل نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن سب سے خاص بات یہ کہ جن لوگوں کو ایسے تجربے ہوئے، ان میں سے کچھ نے بتایا کہ وہ اس تجربے کے دوران خود کو ایک سرنگ میں پاتے ہیں جہاں انھیں a welcoming white light and a replay of memories experience کا تجربہ ہوا۔"

"مطلب؟ پرانی یادیں؟"

"میں سمجھاتا ہوں۔ یہ تجربہ ایسا ہی ہے جیسے ایک Hypnotic Board میں خود کو گھومتے ہوئے محسوس کرنا۔ سننے میں یہ ڈراؤنا لگتا ہے لیکن اس تجربے سے گزرنے والے بتاتے ہیں کہ انھیں ڈر کا احساس تک نہ ہوا، ان کے لیے یہ سب دلچسپ اور نیا تھا۔"

"لیکن آپ نے time and space کی ابھی بات کی، آپ کو یہ عجیب سا نہیں لگتا؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ آپ کو یہ سن کر شاید اور زیادہ عجیب لگے کہ جن لوگوں کو NDE کے تجربے ہوئے، انھوں نے بتایا کہ وہ جسم کے قید سے باہر آ کر بھی ٹائم اور اسپیس کو ہماری ہی طرح محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لیے بھی وقت ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ کسی بھی عام آدمی کے لیے۔ ایک بہت ہی مشہور آدمی بیورلی براڈسکی، جنھوں نے ایک موٹر سائیکل ایکسیڈنٹ کے بعد NDE کا تجربہ کیا تھا، ان کے مطابق: "Space and time are illusions that hold us to the physical realm, in the spirit realm, all is

"present simultaneously."

''لیکن ڈاکٹر، اس کا پرانی یادوں یا ماضی کے فلیش بیک سے کیا رشتہ؟''

''جی اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کچھ لوگوں کو Astral Travel Experience کے دوران بھی ایسا تجربہ ہوتا ہے۔ تیز روشنی کے ساتھ کچھ لوگ اسے دکھائی دیتے ہیں جو ہمارے اجداد ہو سکتے ہیں یا رشتہ دار بھی ہو سکتے ہیں یا پھر وہ، جن سے ہم زندگی میں کبھی ملے ہوں اور ان میں کوئی ایسی خاص بات رہی ہو جو غیر ارادی طور پر ہمارے لاشعور کے تاریک گوشوں میں محفوظ ہو گئی ہو۔ یہ پورا تجربہ آپ کو ایک سفر کی طرح محسوس ہوتا ہے، اس میں ایسا کچھ نہیں ہے کہ ہم کہیں پھنس گئے ہوں یا کسی نے ہمیں پکڑ لیا ہو۔ اس تجربے سے گزرتے ہوئے ہم اپنی گزاری ہوئی زندگی کو دوبارہ جینا شروع کر دیتے ہیں، اور ہم کسی فلم کی طرح خود کو جیتا ہوا دیکھ بھی سکتے ہیں، لیکن ترتیب وار نہیں، بلکہ آگے پیچھے... اور سب سے دلچسپ بات یہ کہ کچھ لوگ دوسروں کی زندگی بھی اسی اسٹیج میں جینا شروع کر دیتے ہیں۔''

- 6 -

خزاں کا موسم آ گیا تھا۔

اس پیڑ پر ایک بھی پتہ نہیں بچا تھا۔ باجرے کی کلغی کے ایک ایک دانے کو جس طرح توتا نکال لیتا ہے، اسی طرح خزاں نے ہر پتے کو چگ لیا تھا۔ پیڑ کی کتھئی شاخیں بالکل برہنہ تھیں۔ شبنم کی بوندوں میں نہانے کے بعد اس کی کھردری اور پرانی چھال دھوپ میں بہت صاف نظر آتی تھی۔

لڑکا صبح چھت پر گملے کے پودے کو پانی دینے آیا۔ اس کی نگاہ پیڑ پر پڑی۔ اس نے پہلی مرتبہ پیڑ کو یوں ننگا دیکھا تھا۔ حالاں کہ خزاں کا موسم ہر سال آتا تھا اور وہ ہر سال باجرے کی کلغی کی طرح اس کا ایک ایک پتہ چگ لیا کرتا تھا، ہر سال اس کی شاخیں اسی طرح برہنہ ہو جاتی تھیں، لیکن لڑکے کی نگاہوں سے یہ منظر اب تک اوجھل رہا۔ اس سال اس کی آنکھوں کے کیمرے نے اسے قید کر لیا۔ اس نے پہلے کبھی بغیر پتوں والا ٹنڈ منڈ اتنا بڑا پیڑ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی بھوری، کتھئی شاخیں میلوں میں آنے والے سادھوؤں کی جٹاؤں کی طرح محسوس ہوئیں۔ پودوں کو پانی دینا بھول کر وہ ان جٹاؤں کو دیکھنے لگا۔

پیڑ کو نہارتے ہوئے، اس کی نظر شاخوں کے درمیان کی خالی جگہ پر یوں ہی چلی گئی۔ خالی جگہ سے اسے کچھ دور پر ایک آنگن کا مربع نما حصہ نظر آیا۔ اس مربع نما حصے پر ایک اور لڑکا کھڑا تھا۔ وہ بھی حیرانی سے پیڑ کو اُدھر سے دیکھ رہا تھا۔ برہنہ شاخوں کی خالی جگہ سے وہ اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ دو لوگ ایک ساتھ ایک ہی وقت میں ان کتھئی بھوری شاخوں کو دیکھ رہے تھے جنھیں انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان شاخوں کے درمیان سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے،

ایک دوسرے کو انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آنگن والا لڑکا رسی پر سوکھتے ہوئے کپڑے اٹھانے آیا تھا۔ کپڑے اٹھا کر وہ اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آنگن کی وہ مربع نما جگہ خالی ہوگئی۔ لڑکے نے اب پورے آنگن کو دیکھا۔ ایک طرف کنارے پر نیچی چھت تھی۔ اس پر دھواں نکلنے کے لیے بڑی سی چمنی بنی ہوئی تھی۔ وہ ضرور باورچی خانہ ہوگا، چھت والے لڑکے نے سوچا۔ دوسری طرف اتنی ہی نیچی چھت والی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ ضرور اناج اور دیگر سامان کو رکھنے کی جگہ ہوگی، ایک بار پھر چھت والے لڑکے نے خیالی گھوڑے دوڑائے۔ تیسری طرف کم اونچائی والا نلکا لگا ہوا تھا۔ اس پر کپڑے دھوئے جاتے ہوں گے۔ چوتھی طرف رسی بندھی ہوئی تھی، اس پر کچھ کپڑے اب بھی سوکھ رہے تھے۔ پیڑ کے خزاں رسیدہ پتے باورچی خانہ اور کوٹھریوں کی چھتوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ بہت زیادہ تھے؛ اتنے زیادہ کہ انھوں نے چھت کو تقریباً ڈھانپ لیا تھا۔ اتنے زیادہ تو لڑکے نے صرف تارے دیکھے تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی آسمان کو یوں ہی ڈھانپ لیتے تھے۔ پتے ایک دوسرے پر لدے ہوئے تھے۔ تارے ایک دوسرے کے اوپر شاید اس طرح سوار نہیں ہوتے ہوں گے، لڑکے نے سوچا۔ آنگن والے لڑکے کے جانے کے بعد آنگن کا وہ مربع نما حصہ بالکل سنسان سا محسوس ہو رہا تھا۔ چھت والے لڑکے نے آنگن والے لڑکے کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ پودے کو پانی دینے سے قبل ایک بار پھر وہ آ جائے تو اسے ٹھیک سے دیکھ لے گا۔ اور یہی ہوا۔ آنگن والا لڑکا دوبارہ آنگن میں آیا اور اسی جگہ کھڑے ہو کر گیلے کپڑے رسیوں پر سکھانے لگا اور ایسا کرتے ہوئے وہ چھت والے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس بار چھت والے لڑکے نے اسے ٹھیک سے دیکھا۔ وہ تقریباً اسی کی عمر کا تھا، چوڑے سرین والا... اس کی رنگت اگرچہ بادلوں سی سانولی تھی لیکن اس کے چہرے پر غضب کی چکناہٹ تھی جس سے چھت والے لڑکے کی نظر بار بار پھسل جاتی تھی۔ آنگن والے لڑکے کے جسم کا اوپری حصہ برہنہ تھا۔ اس کے جسم پر بال تو در کنار، روئیں بھی ناپید تھے۔ چھاتیاں دو حصوں میں منقسم تھیں اور قدرے اُبھری ہوئی تھیں۔ اس نے نیچے تولیہ باندھ رکھا تھا، شاید وہ کچھ دیر پہلے نہا کر فارغ ہوا تھا۔ تولیہ کمر سے کچھ زیادہ ہی نیچے تھا جس سے اس کی ریڑھ کا آخری سرا نظر آ رہا تھا اور جو اس کے کولھوں کے بھاری پن کو ڈھانپنے سے قاصر نظر آ رہا تھا۔

جب تک آنگن والا لڑکا کپڑے سکھاتا رہا، شاخوں کے درمیان سے چھت والے

لڑکے کو دیکھتا رہا۔ چھت والا لڑکا بھی شاخوں کے درمیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے پہلے کبھی کپڑے سکھاتے لڑکے نہیں دیکھے تھے۔ اسے لگا کہ آنگن والا لڑکا کپڑے سکھانے میں خواہ مخواہ کی دیری کر رہا ہے جب کہ وہ اس کام سے جلدی فارغ ہو سکتا تھا۔ بالآخر آنگن والے لڑکے نے تمام کپڑے رسیوں پر سوکھنے کے لیے پھیلا دیے۔ اچانک پیڑ سے باورچی خانے کی چھت پر دھم سے ایک بندر کودا۔ آنگن والے لڑکے نے پتہ نہیں کیا سمجھا، وہ جلدی سے اندر چلا گیا۔ چھت والے لڑکے نے بندر کو دل ہی دل میں ایک عدد گالی سے نوازا پھر پودے کے گملوں میں پانی چھڑکنے لگا۔

لڑکا شاید دسویں گملے میں پانی ڈال رہا تھا کہ اس نے 'ہٹ... ہٹ' کی آواز سنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آنگن والا لڑکا ایک چھوٹی سی لکڑی سے بندر کو بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ قدرے ڈرا ہوا بھی لگ رہا تھا کہ کہیں بندر اسی پر جست نہ لگا دے۔ لکڑی چھوٹی اور پتلی تھی، جب کہ بندر فربہ اور ضدی تھا۔ بندر پر اس کی 'ہٹ... ہٹ' کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے سوکھے پتوں کے درمیان ایک روٹی مل گئی تھی۔ اس نے روٹی کو منھ میں دبا کر لکڑی ہلاتے لڑکے کو ایک گھڑکی دی۔ لڑکا پھر اندر بھاگ گیا۔ بندر ہنستا ہوا روٹی چبانے لگا۔ چھت والا لڑکا بھی ہنستے ہوئے پودوں میں پانی دینے لگا۔

جب تک وہاں بندر بیٹھا تھا، آنگن والے لڑکے کے آنے کی امید نہ تھی۔ آخری گملے میں پانی دینے کے بعد چھت والے لڑکے کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت تھا، اس وقت کا استعمال کرتے ہوئے اس نے منڈیر پر اپنی کہنیاں ٹکائیں اور پیڑ کے اطراف دیکھنے لگا۔ پیڑ بہت اونچا تھا۔ اس کے نیچے کئی چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھتیں تھیں۔ ان گھروں کے باہر بڑی بڑی کھلی جگہیں تھیں۔ اس میں لکڑیوں کی ایک 'ٹال' بھی شامل تھی۔ گھروں کی چھتوں پر پیڑ کے زرد پتے بکھرے ہوئے تھے۔ پیڑ کہاں سے نکلا تھا، یہ لڑکے کی چھت سے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لڑکے کی چھت سے لکڑی کے ٹال کا کھلا میدان نظر آ رہا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر کٹی ہوئی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف پیڑوں کی پتلی بکھری ہوئی ٹہنیاں پڑی تھیں۔ ان کے پاس لکڑیوں کو تولنے کے لیے ایک بڑا سا ترازو لٹک رہا تھا۔ اس کے پیچھے چھوٹی سی کوٹھری بنی تھی۔ اس پیڑ کی شاخیں لکڑی کے ٹال کے کچھ حصے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آنگن انھیں کے پیچھے تھا۔ پیڑ کی دوسری طرف ایک دیوار کے پیچھے چھوٹی سی کھلی جگہ نظر آ رہی تھی۔

وہاں ایک گائے بندھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے کھانے کے لیے مٹی کا ایک بڑا ناند رکھا ہوا تھا جس میں گائے منھ مار رہی تھی، اس کا بچھڑا اس کے ساتھ چپکا ہوا کھڑا تھا۔ ایک آدمی چار خانے والی لنگی پہنے گائے کا دودھ نکالنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہیں سے اٹھتا ہوا سیاہ دھواں پیڑ تک آ رہا تھا۔

بندر اب بھی روٹی کھا رہا تھا۔ آنگن اب بھی خالی تھا۔ لڑکے نے چھت سے نظریں گھما کر آنگن کی طرف دیکھا۔ باورچی خانہ کی چھت پر دو بندر اور آ گئے تھے اور وہ پتوں میں روٹی تلاش کرتے ہوئے آنگن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آنگن والے لڑکے کی آنگن میں آنے کی امید ختم ہو چکی تھی۔ چھت والا لڑکا اداس ہو گیا، وہ چھت سے نیچے اتر گیا۔

دوپہر میں لڑکا پھر چھت پر آیا۔ وہ پہلے کبھی دوپہر میں چھت پر نہیں آیا تھا۔ اسے چھت پر جاتا دیکھ کر ماں نے ٹوکا۔

''صبح پودوں کو پانی کم دیا تھا۔'' لڑکے کے پاس جواب تیار تھا۔

''دھوپ میں پانی دینے سے پودے جل جاتے ہیں۔'' ماں نے کہا۔

لڑکے نے ماں کی بات نہ مانی۔ وہ چھت پر آ گیا۔ اس نے آنگن کی طرف دیکھا۔ آنگن خالی تھا۔ کچھ دیر دھوپ میں کھڑا وہ آنگن دیکھتا رہا۔ اچانک اس کی نظر آنگن والے لڑکے پر پڑی جو سر جھکائے باورچی خانے سے نکلا اور آنگن سے ہوتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، اور ٹرے پر کھانے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس گھر کا ملازم تھا۔ کچھ لمحوں بعد وہ باورچی خانے لوٹا، اس کے ہاتھ اب خالی تھے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ لڑکا چھت پر ہے۔ چھت والے لڑکے کی پرچھائیں اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس کے آنگن تک پہنچ جاتیں، نہ چھت والے لڑکے کی مہک اتنی تیز تھی کہ آنگن والا لڑکا اسے سونگھ لیتا، اور نہ چھت والے لڑکے کی دھڑکنیں اتنی تیز تھیں کہ آنگن والا لڑکا انھیں سن لیتا۔ وہ پہلے کی طرح سر جھکائے پھر باورچی خانے سے نکلا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی۔ پلیٹ پر روٹی رکھی ہوئی تھی۔ وہ آنگن کی دوسری طرف گیا، پھر لوٹا۔ اب اس کی پلیٹ خالی تھی۔ چھت والا لڑکا سمجھ گیا کہ باورچی خانے میں کوئی روٹی سینک رہا ہے اور وہ لڑکا آنگن کی دوسری طرف کسی کو کھانا کھلا رہا ہے۔

چھت والا لڑکا منڈیر پر کہنیاں ٹکائے کھڑا ہو گیا۔ آنگن والے لڑکے نے تین چکر لگائے۔ آخری چکر میں وہ ٹرے پر سارے برتن لے کر واپس لوٹا۔ ٹرے باورچی خانے میں رکھ

کر لوٹا۔ آنگن میں لگے نلکے پر اس نے ہاتھ دھوئے۔ پاؤں بھی دھوئے۔ اس کی پشت چھت والے لڑکے کی طرف تھی۔ ہاتھ پاؤں دھونے کے لیے وہ نلکے پر جھکا ہوا تھا جس سے اس کا ٹی شرٹ تھوڑا سا اوپر اٹھ گیا تھا۔ پاجامہ کا تھوڑا سا حصہ اس کے سرین کی دونوں نرم گولائیوں کے بیچ دفن تھا۔ چھت کے فرش پر لڑکے کے تلوے جلنے لگے۔ شاید دھوپ بہت تیز ہوگئی تھی۔ آنگن والا لڑکا اندر جا چکا تھا۔ ماں نے نیچے سے آواز لگائی، اسے پودوں کو جلانے کے لیے تھوڑا سا کوسا۔ اس کی بددعاؤں سے ڈر کر چھت والا لڑکا نیچے اتر گیا۔

شام کو لڑکا پھر چھت پر آیا۔ آنگن خالی تھا۔ اس نے دیر تک آسمان پر تیرتی پتنگیں دیکھیں، کھیتوں سے لوٹتے توتے دیکھے، چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں دیکھا، چرچ کے مینار کے گلے میں پینڈنٹ سا لٹکتا زرد چاند دیکھا، گھروں میں جلتے ہوئے چولھوں کے شعلے دیکھے، ان پر جلتی ہوئی روٹیاں دیکھیں، خوب سارے تارے دیکھے اور پھر وہ نیچے آ گیا۔

صبح کے انتظار میں لڑکا ٹھیک سے سو نہیں پایا۔ جنازے میں گیس بتی کرائے پر دینے والے چاچا کے مرغ کی اذان سے وہ اٹھ گیا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ ابھی اندھیرا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے پونے تین بجے تھے۔ اس نے سنا تھا کہ مرغ صبح ہونے پر ہی بانگ دیتا ہے لیکن اس مرغ نے اس اصول کو توڑ دیا تھا۔ گیس بتی کرائے پر دینے والا چاچا بے ایمان تھا۔ اسے موت میت پر گیس بتی مفت دینے کے لیے کہا گیا تھا لیکن وہ اس کے کرائے وصولتا تھا۔ مرغ اس کا اپنا تھا، شاید اس کی صحبت میں وہ بھی بے ایمان ہو گیا تھا۔ لڑکے نے مرغ کو ایک گالی دی۔ اس نے طے کر لیا کہ اب مرغ کی بانگ سے وہ کبھی بیدار نہیں ہوگا اور آئندہ کارخانوں کے بھونپو، کوتوالی کے گھنٹے، اذان یا چڑیوں کی آواز سن کر اٹھے گا، کیوں کہ وہ بے ایمان نہیں تھے۔

اس صبح سب سے پہلے چڑیا بولی۔ وہ اٹھ گیا۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس نے دیکھا۔ تھوڑی روشنی ہوگئی تھی۔ وہ چھت پر آ گیا۔ اس نے آنگن کی طرف دیکھا۔ آنگن میں لڑکا ٹہل رہا تھا۔ صبح کی تازی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھر رہا تھا۔ ہلکی ورزش بھی کر رہا تھا۔ تیسرے راؤنڈ میں اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ چھت پر کھڑے لڑکے کو دیکھ کر اپنی جگہ پر تھوڑا سا ٹھٹکا۔ رسی کی طرف آیا۔ اس نے رسی پر سوکھتے کپڑوں کو ٹھیک کیا۔ کپڑوں کو ٹھیک کرنے تک وہ چھت والے لڑکے کو دیکھتا رہا۔ چھت پر کھڑا لڑکا بھی اب اسے نظر بھر کر دیکھ سکتا تھا۔ یہ پتہ نہیں چل پا رہا

تھا کہ آنگن والا لڑکا چھت والے لڑکے کو دیکھ رہا تھا یا وہ اسے خود کو دیکھنے کا موقع دے رہا تھا۔ لڑکا آنگن میں چکر لگانے لگا۔ کبھی ہاتھ اوپر اٹھاتا، کبھی اپنے کندھے گھماتا۔ وہ شاید ورزش کرنے کا بہانہ کر رہا تھا۔

آنگن کے ایک طرف سے دوسری طرف گھوم کر وہ اپنا ایک چکر مکمل کر رہا تھا۔ ایک چکر میں وہ اتنی ہی دیر تک نظر آتا جتنی دیر وہ کھلے ہوئے حصے سے گزرتا۔ باقی وقت دیوار یا کوٹھریوں کی آڑ میں چلا جاتا۔ چھت والے لڑکے نے گنتی گن کر دیکھا کہ اس کا ایک چکر تین منٹ کا ہے۔ ہر تین منٹ کے بعد آنگن والا لڑکا کھلی جگہ سے گزر رہا تھا۔ کھلی جگہ سے گزرتے ہوئے وہ ایک بار چھت کی طرف نظر مار لیتا تھا۔ ہر تین منٹ کے بعد آنگن والا لڑکا چھت والے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔

چھت والے لڑکے نے آنگن والے لڑکے کو چھ بار دیکھا۔ پہلے چکر میں اس نے دیکھا کہ آنگن والا لڑکا کمر پر تولیہ باندھے ہوئے تھا۔ دوسری بار اس نے دیکھا کہ کمر کے نیچے تولیہ باندھنے کے باوجود اس کے سرین کی گولائیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تیسری بار اس نے دیکھا کہ کل کی طرح اس کے جسم کا اوپری حصہ برہنہ نہیں تھا بلکہ اس نے ایک سرخ رنگ کا ٹی شرٹ ڈالا ہوا تھا۔ چوتھی بار اس نے دیکھا کہ کل کی طرح اس کی آنکھوں میں غیریت نہیں تھی۔ پانچویں بار اس نے دیکھا کہ وہ تیز چلتے ہوئے کسی شہزادے کی طرح تھوڑا سا ایک طرف جھک جاتا تھا، گویا وہ اس گھر کا ملازم نہیں تھا۔ چھٹی بار وہ لڑکا کھلے ہوئے حصے میں رُک گیا۔ وہ پھر رسی کے پاس آیا۔ اس نے رسی سے کپڑے اتارے اور انھیں لے کر اندر چلا گیا۔ چھت والا لڑکا پودوں کو پانی دینے لگا۔

سولھویں پودے میں پانی دیتے وقت اسے آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آنگن والا لڑکا گیلے کپڑوں کی ایک نئی کھیپ سکھانے لایا تھا۔ یہ آواز بالٹی رکھنے اور کپڑوں کو زور سے پھٹکارنے کی تھی۔ چھت والے لڑکے نے پانی دینا چھوڑ دیا۔ وہ پھر منڈیر پر کہنی ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

اب دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ رسی کی طرف منھ کر کے لڑکا دھیرے دھیرے کپڑا پھٹکارتا اور پھر اسے رسی پر پھیلا دیتا۔ چھت والے لڑکے نے کپڑوں کو دیکھا۔ کپڑوں میں اس نے آنگن والے لڑکے کی کل والی نیلی ٹی شرٹ کو پہچان لیا۔ کپڑے سکھاتے لڑکے کے پیچھے ایک عورت نلکے کی طرف آئی، اس نے ہاتھ دھوئے پھر اندر چلی گئی۔ لڑکا تمام کپڑے رسی پر پھیلا چکا تھا۔ وہ بالٹی لے کر اندر جانے لگا۔ آنگن میں ایک آدمی آیا۔ اس کے

ساتھ وہی عورت تھی۔ باورچی خانے کی طرف اشارہ کرکے انھوں نے لڑکے سے کچھ کہا، پھر اندر چلے گئے۔ آنگن والا لڑکا بالٹی رکھ کر باورچی خانہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹا۔ اس نے بالٹی اٹھالی۔ ایک بار محتاط انداز میں ادھر اُدھر دیکھا، پھر چھت والے لڑکے کی طرف پلٹا۔ یوں ہی ایک ہاتھ اٹھایا اور اسے ہلکے سے لہرا کر چلا گیا۔ اس نے بتادیا تھا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ چھت والا لڑکا اداس ہوگیا، اتنا اداس کہ اس نے بقیہ پودوں کو پیاسا ہی چھوڑ دیا اور نیچے اتر گیا۔

ماں کی گالیاں سننے کے باوجود وہ دوپہر کو پھر چھت پر آیا۔ آنگن والا لڑکا اسی طرح سر جھکائے روٹیاں لے کر آتا جاتا رہا۔ اسے شاید یہ پتہ نہیں تھا کہ دوسرا لڑکا دوپہر میں بھی چھت پر آتا ہے۔ چھت والا لڑکا دوبار کھانسا، ایک بار منڈیر سے فرش پر دھم سے کودا بھی، لیکن آنگن والے لڑکے نے نہیں سنا۔ چھت والے لڑکے کو غصہ آ گیا۔ غصے میں وہ شام کو چھت پر نہیں آیا۔ اس شام وہ ندی کنارے ریت پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا ریت پر کپڑے سکھاتے، روٹیاں لے جاتے، پاؤں دھوتے اور بندر سے ڈرتے ہوئے لڑکے کی تصویریں بناتا رہا۔

اگلی صبح لڑکا مرغ کی آواز پر بیدار نہیں ہوا۔ چڑیوں کی آواز پر بھی نہیں جاگا۔ کوتوالی کے گھنٹے بجنے پر ہی آنکھیں کھولیں۔ وہ چھت پر لپکتا ہوا آیا۔ آنگن والا لڑکا اپنے معمول کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اسی طرح وہ آدمی اور وہی عورت آئی۔ لڑکا باورچی خانے میں گیا اور جاتے ہوئے ہوا میں ہاتھ ہلایا۔ چھت والے لڑکے کی ہمت بڑھ چکی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آنگن والے لڑکے سے رکنے کو کہا۔ لڑکا رک گیا۔ رسی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا، پھر نلکے پر منھ، ہاتھ، پاؤں دھوتا رہا، اور خوفزدہ نظروں سے کبھی کمرے تو کبھی باورچی خانے کی طرف دیکھتا رہا۔ یوں ہی بے مطلب کھڑے رہنا اسے خوف زدہ کررہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے چھت والے لڑکے کو دیکھے بغیر ہاتھ ہلایا اور اندر چلا گیا۔ اسے شاید ڈر تھا کہ چھت والا لڑکا اسے پھر روکنے کی کوشش کرے گا اور وہ پھر رک جائے گا۔ چھت والا لڑکا اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ آنگن میں ہی رہے۔ اسے کوئی خفیہ اشارہ بتانا چاہتا تھا جسے سن کر وہ جب اسے بلائے، لڑکا آنگن میں چلا آئے۔ اس نے کچھ خفیہ اشارے سوچ بھی رکھے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس موسم میں وہ کوئل کی آواز نکالے گا یا پھر سورج کے رتھ کو کھینچنے والے سنہرے ایال والے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز یا پھر اس بلبل کی آواز جس کی گردن کا رنگ سرخ ہو چکا ہو۔ اس نے بند کمرے میں ان آوازوں کی مشق بھی کی تھی۔ ان آوازوں کو سن کر اس کی ماں کمرے کے آس پاس حیرانی سے

بلبل اور گھوڑوں کو تلاش کر رہی تھی۔ لڑکے نے جب ماں کو اس طرح انھیں تلاش کرتے دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا کہ آنگن والا لڑکا بھی جب یہ آواز سنے گا تو بلبل یا گھوڑے کی آواز ہی سمجھے گا۔ یہ آوازیں اسے بلانے کے لیے وہ نکال رہا ہے، اسے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ لڑکے نے کچھ اور ترکیبیں بھی سوچیں۔ مثلاً، وہ کسی کا پالا ہوا کبوتر اُدھار مانگ لے جو اس کا خط لے جا سکے یا اس کی اناج رکھنے والی کوٹھری کی دیوار پر انگلیوں کی پرچھائیوں سے جانوروں کی شکلیں بنا کر اسے آنگن میں آنے کا اشارہ کرے یا اس کے آنگن تک کاغذ کا جہاز اڑا سکے۔

دوپہر میں لڑکا ایک بار پھر اسی طرح چھت پر آیا۔ آنگن والے لڑکے نے اسی طرح سر جھکائے کسی کو کمرے میں کھانا کھلایا۔ شام کو لڑکا پھر چھت پر آیا۔ آنگن خالی تھا۔

دس دن گزر گئے۔ گیارہویں دن صبح لڑکے نے شاخوں پر کچھ نئے پتے دیکھے۔ اس نے انھیں گنا۔ اسّی تھے۔ یہ پتے نوزائیدہ بچے کی طرح چمک دار تھے، ملائم تھے، پاکیزہ تھے اور امیدوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہوا میں جھولتے تو ان پر ٹھہری چمک بوندوں کی طرح نیچے ٹپکتی۔ وہ بڑے اور چوڑے تھے۔ ان کی نسیں اٹھی ہوئیں اور رس سے بھری تھیں۔ ان اسّی پتوں نے ہی آنگن والے لڑکے کے باورچی خانے کے ایک حصے کو ڈھانپ لیا تھا۔ ابھی انھیں بے شمار ہونا تھا، اتنا کہ ہوا بھی ان سے پار نہ ہو سکتی تھی، کسی کی نظر کا ان سے گزرنا تو بہت مشکل تھا۔

لڑکے نے چاروں طرف نظر گھما کر دوسرے پیڑوں کو دیکھا۔ وہ سب نئے پتوں سے بھر چکے تھے۔ ان کے سبز رنگ الگ الگ تھے۔ ان کی بناوٹیں بھی الگ تھیں۔ چمک الگ تھی۔ خزاں میں سوکھے اور کانپتے ہوئے مریل پیڑ اب کسے ہوئے بدن کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہی ایک پیڑ باقی تھا جس کی شاخیں اب تک برہنہ تھیں۔ یہ سب سے الگ بھی تھا۔ اس پر کتھئی رنگ کے بڑے بڑے پھول لگتے تھے۔ بعد میں ان سے کپاس کے ریشے اڑ کر چاروں طرف پھیل جاتے تھے۔ اسی پیڑ پر بیٹھ کر کوئل کوکتی تھی۔ اسی پیڑ پر جب چاند ٹھہرتا، نیچے چاندنی کا نگر آباد نظر آتا تھا۔ یہ سب شروع ہونے والا تھا۔ دو یا تین دن میں ان شاخوں کو پتوں سے بھر جانا تھا۔ لڑکے نے چھت سے آنگن والے گھر کا راستہ پہچاننے کی کوشش کی۔ آنگن کے چاروں طرف نیچی چھتوں والے چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں کے درمیان وہ گھر کہاں ہے، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس کی گلی، دروازہ کہاں ہے، نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاخوں کے پتوں سے بھر جانے کے بعد آنگن نظر آنا بھی بند ہو جائے گا۔ لڑکا بھی نظر نہیں آئے گا۔ یہ سوچ کر چھت والا لڑکا گھبرا گیا۔ منڈیر سے اپنی کہنیاں ٹکا کر اس نے ایک بار پھر پیڑ کو دیکھا۔ لکڑی کی ٹال کو دیکھا جس کے اوپر اس کی شاخیں تھیں۔ بندھی ہوئی گائے والے حصے کو دیکھا جہاں اس کی ٹہنیاں گئی تھیں۔ کچھ دیر تک اسی طرح سب طرف گھورنے کے بعد وہ نیچے اُتر آیا۔

صبح آنگن والے لڑکے کو نہارنے کے بعد چھت والا لڑکا گھر سے نکلنے لگا۔ ماں نے اسے بغیر کھائے پیے گھر سے نکلنے پر ٹوکا، ''خالی پیٹ میں آگ لگے گی۔''

لڑکا جھنجھلا گیا، ''آگ لگنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیٹ کے اندر آکسیجن نہیں ہوتی۔''

ماں حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ شاید وہ پیٹ کی آگ کے بارے میں کچھ اور بولنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی لڑکا باہر نکل گیا۔

لکڑی کی ٹال ایک چھوٹے سے کھلے میدان میں تھی۔ یہاں حویلیوں کی ضرورت کی سبزیاں وغیرہ بوئی جاتی ہوں گی یا جانور باندھے جاتے ہوں گے یا ان حویلیوں میں کام کرنے والے جھونپڑیوں میں رہتے ہوں گے۔ اب وہ میدان چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں سے بھر گیا تھا۔ ان کوٹھریوں میں لوگ رہتے تھے۔ ان کوٹھریوں کی چھتوں پر پیڑ کے سوکھے پتے برستے رہتے تھے۔ کبھی کوئی پرانا سائیکل کا ٹائر، ٹوٹا پنجرہ، پھٹا ہوا جوتا بھی پڑا رہتا تھا۔ لڑکے نے اپنی چھت سے یہ نظارہ دیکھا تھا۔ کوٹھریوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ یہ گلہریوں اور بندروں کے دوڑنے، سونے اور کھیلنے کے کام آتی تھیں۔ یہی چھت آنگن والے لڑکے کے باورچی خانے اور اناج کے کمرے تک چلی گئی تھی۔

گلیوں میں راستہ پوچھتا ہوا لڑکا ٹال تک آ گیا۔ کئی طرح کی لکڑیوں کے کئی ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کچھ ڈھیر بہت اونچے تھے، کچھ چھوٹے تھے۔ کچھ سوکھی ٹہنیوں کے تھے۔ لکڑیاں تولنے کے لیے ترازو وہاں نصب تھا۔ اس کے پلڑے موٹی لکڑیوں سے بنے ہوئے تھے۔ دکان کے سامنے کے تخت پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ وہ دکان دار کا انتظار کر رہے تھے۔ لڑکا ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ان کی باتوں سے لڑکے کو علم ہوا کہ ان میں سے ایک چتا کی لکڑیاں بیچنے والا شمشان کا

دکان دار تھا، دوسرا 'ہون' کے لیے لکڑیاں بیچتا تھا، تیسرا گلی ڈنڈا بنانے کے لیے لکڑیاں خریدنے آیا تھا۔ وہ لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرکے زور زور سے بول رہے تھے۔ ایک کوٹھری سے کھانستا ہوا دکاندار باہر آیا۔ وہ دبلا پتلا سا شخص تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی ساٹھ کے آس پاس ہوگی۔ چھوٹی سی سفید داڑھی تھی۔ رنگ صاف تھا۔ کندھے پر بڑا سا تولیہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لکڑیاں تولنے والا چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ وہ تینوں اس کے پرانے گاہک تھے۔ چھوٹا لڑکا بھی انھیں پہچانتا تھا۔ وہ بغیر پوچھے ڈھیر سے لکڑیاں اٹھا کر ترازو کے پلڑے پر ڈالنے لگا۔

لڑکا ان سے تھوڑی دور پر کھڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ تینوں چلے جائیں تو اکیلے میں دکان دار سے بات کرے گا۔

دکان دار نے ایک بار اسے اچٹتی نگاہ سے دیکھا۔ وہ سمجھ نہ پایا کہ لڑکا اس کا گاہک ہے یا کسی سے ملنے آیا ہے۔ ان تینوں سے باتیں کرتے ہوئے وہ بیچ بیچ میں ترازو کی لکڑیاں بھی دیکھ رہا تھا۔ لڑکے تک لکڑیوں کی بُو آ رہی تھی، جیسے وہ سانس چھوڑ رہی ہوں، بالکل ویسے ہی جیسے بکرا منڈی میں کٹنے کے لیے جاتے ہوئے بکرے سانسیں چھوڑتے ہیں۔

لڑکے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پیڑ کی شاخیں نظر آ رہی تھیں۔ لکڑیاں تولنے کے بعد، باہر کھڑے رکشوں پر لکڑیاں لاد کر وہ تینوں چلے گئے۔ دکان دار نے ایک بار پھر لڑکے کو دیکھا اور تخت پر بیٹھ کر حساب کتاب کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اب لڑکا آگے بڑھا۔ دکان دار کے کاغذ پر اس کا سایہ پڑا۔ اس نے سر اٹھایا۔

''کیا اس پیڑ کی لکڑیاں ملیں گی؟'' لڑکے نے انگلی اٹھا کر پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ٹہنی کو لکڑی کہا تھا کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ 'ٹہنی' بولنے پر دکان دار کہیں یہ نہ کہہ دے کہ وہ لکڑیاں بیچتا ہے، ٹہنیاں نہیں۔ دکان دار نے سر اٹھا کر پیڑ کو دیکھا۔ وہ جب پیدا ہوا تھا، تب سے اس پیڑ کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ کسی کام نہیں آتیں،'' اس نے لڑکے کو دیکھا ''اور بہت طرح کی لکڑیاں یہاں ہیں، وہ لے لو۔''

''نہیں۔ یہی چاہیے۔''

''کیوں؟''

''وید جی نے اسی پیڑ کے لیے کہا ہے۔ پتے آنے سے پہلے اس کی پتلی ٹہنیوں کو گھس

کر لیپ بنانا ہے۔ ابھی پتے نہیں آئے ہیں، ان کی چھال بالکل سوکھی ہے۔ یہی سب سے زیادہ فائدہ کرتی ہیں۔ پیڑ کے اس طرف پتے آنے لگے ہیں۔ میں نے خود گنے ہیں، اسّی ہیں۔''

''تم نے پتے گنے؟'' دکان دار نے حیرت سے لڑکے کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں نے تارے گنے تھے۔''

''کتنے تھے؟''

''پتہ نہیں۔''

''کیا وہ ایک دوسرے پر لدے ہوئے تھے؟''

''کیا تارے ایسا کرتے ہیں؟''

''پتے تو کرتے ہیں۔''

''نہیں... لدے ہوئے نہیں تھے۔''

دکاندار نے سر ہلایا۔ وہ چپ ہو گیا۔ کچھ دیر دونوں چپ رہے۔

''کیا آپ پیڑ کے اِدھر کے حصے کی ٹہنیاں کٹوا کر دے سکتے ہیں؟'' لڑکے نے اس بات لکڑیوں کی جگہ ٹہنیوں کا استعمال کیا۔

''نہیں... وہاں پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اسے نہیں چھوؤں گا۔ یہ پیڑ وکیل کے گھر سے نکلا ہے۔ اس کی جڑیں وہیں ہیں۔ اسی کا پیڑ ہے۔ وہیں سے اس کی ڈالیوں پر چڑھا بھی جا سکتا ہے۔ تمھیں اگر اس کی ٹہنیاں چاہئیں تو اس کے پاس جاؤ۔ اس کی مرضی ہوئی تو تمھیں اس کے تنے پر چڑھ کر یہاں تک آنے دے گا۔ البتہ اگر دو چار ٹہنیوں سے تمھارا کام چل جائے گا تو اکثر یہاں گر جاتی ہیں۔ کبھی پتنگ کی ڈور سے، کبھی بندروں کے کودنے سے۔''

''نہیں۔ مجھے بہت چاہئیں۔ جتنی اِدھر ہیں وہ سب چاہئیں۔ سال بھر کی دوا بنانی ہے۔ خزاں سال بھر میں ایک ہی بار آتا ہے۔ سوکھی ٹہنیاں اسی موسم میں ملتی ہیں۔ وید جی کے پاس اور بھی مریض آتے ہیں، ان کے بھی کام آجائیں گی۔''

''کسے چاہیے؟'' دکان دار نے جیب سے پیتل کی تمباکو کی ڈبیا نکالی۔ تمباکو اور چونا ہتھیلی پر رکھ کر گھسنے لگا۔

''کیا؟''

''دوا۔ کیا تمھیں بیماری ہے؟''
''نہیں... ''لڑکا ہڑ بڑا گیا، ''بھائی کو۔''
''کیا؟''
''وید جی جانتے ہیں۔''
''تم نہیں جانتے؟''
''انھوں نے نہیں بتایا۔''

دکان دار کچھ لمحے لڑکے کو دیکھتا رہا، پھر پتلیوں کو آنکھوں کے کونے پر ٹکا کر پوچھا،
''کہاں لگے گی؟''
''کیا؟''
''دوا۔''

لڑکے نے دکان دار کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تھوڑی سکڑ گئی تھیں۔ مزید سکڑتیں تو شاید بند ہو جاتیں۔ ہونٹ تھوڑا سا پھیل گئے تھے، تھوڑا سا اور پھیلتے تو ہنسی بن جاتی۔ اس نے ان پھیلے ہوئے ہونٹوں کے درمیان میں تمبا کو دبایا۔

''دیکھنا، اگر تمھارے بھائی کو فائدہ ہو تو مجھے بھی بتانا۔ مجھے بھی تکلیف رہتی ہے۔ اکثر بعد میں سوجن بھی آ جاتی ہے۔''

دکان دار کی باتوں سے لڑکا متذبذب ہو گیا۔ ''وکیل کے گھر کا راستہ کہاں سے ہے؟''

''یہاں سے باہر نکل کر دائیں گھوم جانا۔ کالے بچھو کا تیل بیچنے والے بورڈ کی دکان پر رُک جانا۔ وہاں سے ملحق گلی میں چلے جانا۔ تھوڑی دور جانے پر ایک ٹوٹا ہوا فوارہ نظر آئے گا۔ اس کے پیچھے چھوٹا مندر ہے۔ سامنے اس کا گھر ہے۔ فوارے سے تمھیں پیڑ کا موٹا تنا نظر آئے گا۔ وہ ہمیشہ نم ہوتا ہے، جیسے مست ہاتھی کے ماتھے سے پسینہ رِستا ہے۔ جو پیڑ سینکڑوں سال پرانے ہو جاتے ہیں، ان کے تنوں سے ہمیشہ آنسو بہتے ہیں، جیسے اندر کی روح آزادی چاہتی ہے۔ تمھیں فوارے سے اس کے آنسو نظر آئیں گے۔ شاید وید نے اسی لیے اس پیڑ کی ٹہنیاں مانگی ہیں۔ اس نے اس کا تنا دیکھا ہوگا۔ یہ آنسو امرت کی بوندوں میں بدل جاتے ہیں۔ ایسا پرانی کتابوں میں لکھا ہے۔ پرانے لکڑہارے اسے جانتے ہیں۔'' دکان دار خاموش ہو گیا۔ لڑکے نے سر ہلایا اور ٹال سے باہر آ گیا۔

ٹال سے بچھو کے تیل کی دکان تک ایک پتلی گلی جاتی تھی۔ لڑکا اس گلی میں گھس گیا۔ وہ

بہت تنگ تھی۔ اس میں دھوپ نہیں آتی تھی۔گلی میں مکانوں کے چھجے ملے ہوئے تھے۔ان پر رنگین کپڑے لٹک رہے تھے۔کچھ کپڑے زیادہ لمبے تھے۔اسی وقت سکھائے گئے تھے۔ان کی بوندیں نیچے ٹپک رہی تھیں۔دکانیں بند تھیں۔گلی میں نیچے دکان اور اوپر مکان تھے۔دکانوں کے پٹرے کے نیچے کتے نالی کی ٹھنڈک میں دبکے ہوئے تھے۔لڑکے نے گلی پار کی۔گلی پار کرتے ہوئے اس نے رنگریز، کٹھ پتلی، نٹ، چاندی کا ورق اور چمڑے کا مشکیزہ بنانے والوں کی دکانیں اور مکان پار کیے۔لڑکا جب ان سب کو پار کر رہا تھا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ ٹال والے کو بولا ہوا جھوٹ یہاں کام نہ کرے گا۔ پیڑ کا تنا وکیل کے گھر میں تھا۔ دوا کے لیے ٹہنیوں کی ضرورت بتانے پر، وہ اپنی طرف کی ٹہنیاں کٹوا سکتا تھا۔ بچھو کے تیل کی دکان پر پہنچنے تک لڑکے نے دوسرا جھوٹ سوچ لیا تھا۔

دکان سے ملحق گلی کے اندر لڑکا چلا گیا۔ٹوٹے فوارے پر پہنچ کر لڑکے کو پیڑ کا تنا نظر آ گیا۔ پیڑ کے تنے سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ زرد رنگ کی نیچی چار دیواری والا گھر تھا۔ باہر وکیل کا نام لکھا تھا۔لوہے کا دروازہ بند تھا۔لڑکے نے چھت سے اس گھر میں گائے بندھی دیکھی تھی۔ بھوسے کا ڈھیر بھی دیکھا تھا۔البتہ یہ دیوار، یہ دروازہ وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔دیوار کے پیچھے اسے گائے کے ڈکارنے کی آواز سنائی دی۔تبھی دروازہ کھول کر ایک آدمی باہر آیا۔وہ ہرے رنگ کے خانوں والی لنگی پہنے ہوئے تھا۔لڑکے نے اسے لنگی سے پہچان لیا۔اس لنگی کو پہن کر اسے گائے کا دودھ دوہتے ہوئے لڑکے نے چھت سے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں تازے دودھ کی بالٹی تھی۔

''وکیل صاحب سے ملنا ہے۔''

اس نے لڑکے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، پھر سر ہلا کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔لڑکا دروازے سے اندر چلا گیا۔اندر داخل ہونے پر ایک راستہ کچھ دور تک بالکل سیدھا جاتا تھا۔اس کے دونوں طرف بیگنی پھولوں والے پودے لگے ہوئے تھے۔ دوسرا راستہ بائیں ہاتھ پر گھوم گیا تھا، جو ایک جالی دار کمرے سے ہوتا ہوا آگے چلا گیا تھا۔ایک کھلی جگہ کو تاروں والی جالی سے گھیر کر بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔اس جالی پر بھی وکیل کے نام کی ایک تختی لٹک رہی تھی۔اندر پلاسٹک کی کرسیاں پڑی تھیں۔ایک چھوٹی میز کے پیچھے اونٹ کے چمڑے والی اونچی کرسی تھی۔

پلاسٹک کی کرسیوں پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ وکیل کا انتظار کر رہے تھے۔لڑکا بھی کرسی

پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی انتظار کرنے لگا۔

لڑکے نے اس راستے کو آگے جاتے ہوئے دیکھا جو آگے جا کر دیوار کے پیچھے گھوم گیا تھا۔ پیڑ کا تنا وہیں تھا۔ گائے وہیں تھی۔ آدمی وہیں دودھ نکالتا تھا۔ لڑکے کے دل میں آیا کہ اس جگہ پر جا کر اپنی چھت دیکھے، جیسے وہ لڑکا اپنے آنگن سے دیکھتا ہے۔ لڑکے کا دل ہوا کہ اس جگہ پر جا کر پیڑ کے نم تنے کو چھوئے۔ اس کی روتی ہوئی آتما سے بات کرے۔ بندر کی طرح اس پر چڑھ کر ان شاخوں تک چلا جائے جو آنگن والے لڑکے تک گئی تھیں۔ وہاں سے دیکھ لے گا کہ وہ لڑکا روز اندر کسے روٹی کھلاتا ہے۔ اس لڑکے کو بھی وہ بہت قریب سے دیکھ لے گا۔ اس کے اندر اس خواہش کی ہوک اٹھی، اتنی تیز کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں بیٹھے دونوں آدمیوں نے اسے دیکھا۔ وہ سمجھے وکیل آ رہا ہے۔ وہ بھی کھڑے ہو گئے۔ لڑکے نے انھیں کھڑے ہوتے دیکھا تو چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اسے گھورتے ہوئے وہ بھی بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

لڑکا ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ رام لیلا میدان کو خریدنا چاہتے تھے۔ وکیل نے انھیں بتایا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس زمین کے مالک خود دشرتھ کے بیٹے بھرت جی ہیں۔ سینکڑوں سال پرانے دستاویز میں اس کے مالک نے زمین ان کے نام کر دی تھی۔ اب صرف بھرت جی ہی اسے بیچ سکتے ہیں۔ ان کے دستخط کے بغیر زمین کسی کو بیچی نہیں جا سکتی تھی۔ وکیل نے انھیں سمجھایا تھا کہ ایک ہی طریقہ ہے کہ تم ثابت کر دو کہ بھرت کی موت ہو چکی ہے اور تم ان کے وارث ہو۔ وکیل نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ لوگ پہلے نہیں ہیں جو اس زمین کو خریدنا چاہتے ہیں۔ ان سے پہلے بھی کئی لوگ ایسی کوششیں کر چکے تھے۔ انگریز بھی کر چکے تھے۔ اسی وقت یہ پتہ چلا تھا کہ زمین کے مالک بھرت جی ہیں۔ اس لیے گزشتہ ایک سو تیس سالوں سے 'بھرت ملاپ' اسی میدان پر ہوتا ہے۔ بھرت ملاپ ہر سال ہوتا ہے، اس لیے بھرت اب زندہ نہیں ہیں، یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اب سوریہ ونشی بھرت کے جعلی دستخط کی کوئی سازش لے کر یہاں آئے تھے۔

دروازے پر کھانسنے کی آواز کرتا ہوا وکیل داخل ہوا۔ کھانستے ہوئے داخل ہونا اس نے مغل بادشاہوں کے آنے کے اعلان سے سیکھا تھا۔ وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ لڑکا بھی کھڑا ہو گیا۔ وکیل سیدھے چمڑے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی بیٹھ گئے۔ لڑکا بھی بیٹھ گیا۔ لڑکے نے وکیل کا جائزہ لیا۔ وکیل کافی تندرست آدمی تھا اور اس کی اضافی تندرستی اس کی توند بن کر باہر لٹک رہی تھی۔ وکیل نے لڑکے کو دیکھا۔ وہ سمجھا کہ لڑکا ان دو آدمیوں کے ساتھ ہے۔ وہ ان لوگوں

کی طرف جھک گیا۔ انھوں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ لڑکا ان کی باتیں سن سکتا تھا اور باہر جا کر ان کے راز کھول سکتا تھا۔

''پہلے ان کا کام کر دیں۔'' دو میں سے ایک بولا۔

وکیل پھر پیچھے ہو کر کرسی کی پیٹھ سے چپک گیا۔ وہ خاموشی سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جلد تنی ہوئی تھی۔ اسے لڑکے کا آنا یا بذات خود لڑکا اچھا نہیں لگ رہا تھا، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ لڑکے کی خود اعتمادی لڑکھڑا گئی۔

''میں پیچھے رہتا ہوں۔ میری چھت سے آپ کی گائے نظر آتی ہے۔'' لڑکا خاموش ہو گیا۔ پیچھے رہنے یا گائے کا حوالہ سن کر وکیل کا چہرہ نرم ہوتا چلا گیا۔ وہ مسکرایا۔ لڑکے کی خود اعتمادی پھر بحال ہو گئی۔ ''آپ کے گھر میں کتھئی پھولوں والا پیڑ ہے، وہی جس کے تنے سے آنسو نکلتے ہیں۔ وہ پیڑ اوپر بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے نظر نہیں آئے گا۔ میری چھت سے نظر آتا ہے۔ خزاں کے سبب ابھی اس میں پتے نہیں ہیں مگر اب آنے شروع ہو گئے ہیں۔ پھر اس میں پھول آئیں گے، بہت سارے، بڑے بڑے پھول... ان سے کپاس کے ریشے نکلتے ہیں۔ میری ماں کو ان سے تکلیف ہوتی ہے۔ جب ہوا میرے گھر کی طرف چلتی ہے تو ان پھولوں کی مہک اور کپاس کے ریشے میرے گھر تک آ جاتے ہیں... کھڑکیوں سے اندر باورچی خانے تک۔ ماں کی سانس پھولنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انھیں ان پھولوں کی مہک سے، کپاس کے ریشوں سے بچانا ضروری ہے۔'' لڑکا ایک سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ وکیل مسکراتا ہوا سن رہا تھا۔ اسے طویل بیان سننے کی عادت تھی۔ وہ دونوں بھی سن رہے تھے۔

''پتے آنے شروع ہو چکے ہیں۔ پھول بھی آئیں گے۔ ہوا بھی چلنے لگی ہے۔ اس موسم سے ہوا بھی پیڑ سے ہوتی ہوئی میرے گھر کی طرف آتی ہے۔''

''تمھیں کیسے معلوم؟'' اب وکیل نے زبان کھولی۔ اس کی آواز کھردری تھی، جیسے کسی پتھر پر رسی گھسی جا رہی ہو۔

''کیا؟''

''یہی کہ ہوا اِدھر سے تمھارے گھر کی طرف چلے گی؟''

''اس موسم میں یہی ہوتا ہے۔ اس میں کھلے جسم کی، سانولے خرگوش کی اور روٹیوں کی مہک ہوتی ہے۔'' لڑکے کو اچانک آنگن والا لڑکا یاد آ گیا۔

''اس سے ہوا کے چلنے کی سمت کا کیا تعلق؟''
لڑکا ہکلا کر رہ گیا۔
''اُدھر گھروں میں یہ سب ہوتا ہے۔''
''ان گھروں سے کبھی میرے گھر کی طرف بھی چلتی ہوگی؟''
''جی۔''
''لیکن میں نے تو کبھی روٹیوں کی، کھلے جسموں کی یا سانولے خرگوش کی مہک محسوس نہیں کی۔''
لڑکے نے سر جھکا لیا۔ اس کے بیان میں غلطی پکڑ کر وکیل خوش ہو گیا۔ ''خیر تو؟''
''اگر آپ پیڑ کی صرف ان ڈالیوں کو کٹوا دیں جو میری چھت سے نظر آتی ہیں تو پھولوں کی مہک اور کپاس کے ریشے نہیں آئیں گے۔''
''لیکن یہ پیڑ تو میرا نہیں ہے۔''
''آپ کے گھر میں ہے۔''
''گھر بھی میرا نہیں ہے۔''
لڑکے نے کنفیوژ ہو کر وکیل کو دیکھا۔
''دراصل یہ ساری زمین وقف کی ہے۔ سارے گھر بھی اسی کے ہیں۔ ان کا مالک متولی ہے۔ ان گھروں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ وہی لے سکتا ہے۔''
''یہ کیا ہوتا ہے؟''
''کیا؟''
''جو ابھی آپ نے بولا۔''
''تم اتنا ہی سمجھ لو کہ وقف کا مطلب ٹرسٹ ہے اور متولی کا مطلب بڑا ٹرسٹی۔ متولی کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم نے باہر دیوار پر زرد رنگ دیکھا ہوگا؟ اسی نے کروایا ہے۔ گائے بھی اسی نے بندھوائی ہے۔ دروازے پر دودھ کی بالٹی کوئی آدمی ملا تھا؟ اسی کا ہے۔ دودھ بھی اسی کا ہے۔ اسی کے گھر جا رہا تھا۔ میں تو بازار سے خریدتا ہوں۔ یہ پیڑ بھی اسی کا ہے۔ اس کی شاخیں کٹوانے کے لیے تمھیں اسی سے بات کرنی ہوگی۔''
''وہ کہاں ملیں گے؟''

''دور نہیں ہے۔ مسافر خانے کے اندر اس کا دفتر ہے۔ وہ صبح بیٹھتا ہے۔ ابھی چلے جاؤ، مل جائے گا۔''

''بعد میں؟''

''تم نے راستے میں کالے بچھو کے تیل کی دکان دیکھی تھی نا؟''

''ہاں۔''

''اسی کی ہے۔ وہ کالے بچھو خریدتا ہے... ان کا تیل نکلواتا ہے۔ شیشیوں میں بند کرواتا ہے، اس کا تیل بہت مفید ہے، بہت بکتا ہے۔ تم نے کبھی کوشش کی؟'' میز پر کہنیاں رکھ کر وہ تھوڑا آگے جھک آیا۔

''کس بات کی؟''

''ماں کی بیماری کے لیے اس تیل کا استعمال کرنے کی؟ ممکن ہے انھیں فائدہ ہو جائے اور پیڑ نہ کٹوانا پڑے۔ تم چاہو تو میں متولی سے بات کر لوں گا۔ وہ اس بیماری کے لیے کسی نایاب بچھو کا تیل بنا دے گا۔ اس کے پاس ایسے بہت بچھو ہیں۔ ان کا تیل وہ نہیں بیچتا، اپنے لیے بچا رکھتا ہے۔ کئی بیماریوں میں استعمال کرتا ہے۔''

''کیا اس سے سوجن ٹھیک ہو جاتی ہے؟''

''وہ تو بالکل ہو جاتی ہے۔''

''لکڑی کی ٹال والے کو ضرورت ہے، اسے بعد میں سوجن آ جاتی ہے۔''

''وہ تو آئے گی ہی، اس نے ایک توتا پال رکھا ہے۔ جیسے توتا ہری مرچ پکڑتا ہے، اس طرح وہ عورت کو پکڑتا ہے۔ سوجن تو آئے گی ہی۔''

لڑکے نے کبھی توتے کو ہری مرچ پکڑتے نہیں دیکھا تھا، سو وہ خاموش رہا۔

''خیر تم متولی سے مل لو۔ تیل ضرور لے لینا۔ ایک شیشی ٹال والے کے لیے بھی۔''

لڑکا اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔

''تم ایک درخواست دے دو۔ ماں کی بیماری کا حوالہ دے دینا۔ اس کے پاس آدمی رہتے ہیں، وہ جب چاہے انھیں بھیج دے۔ میں پیڑ پر چڑھا دوں گا۔ درخواست لکھ لو گے نا؟'' اس نے لڑکے کو دیکھا۔ لڑکا خاموش ہی رہا۔

''نہ لکھ پاؤ تو رکو۔ میرا منشی آ رہا ہوگا۔ وہ لکھ دے گا۔ اس کی فیس دے دینا۔''

''میں لکھ لوں گا۔'' لڑکے نے سر ہلایا۔ وکیل نے بھی سر ہلا دیا۔ وہ دونوں آدمی اب تک اُوب چکے تھے، انھوں نے بھی سر ہلایا۔ لڑکے نے ان کی اُوب دیکھی۔ وہ جالی والے کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے ایک بار پھر تنے کو دیکھا۔ ان پر پھیلتی شاخوں کو دیکھا۔ پتے بہت تیزی سے نکل رہے تھے۔ اب وہ تین سو ہو گئے تھے۔ شاخوں پر دوڑتی گلہری ان میں پھنس رہی تھی۔

لڑکا واپس ٹوٹے فوارے کے پاس آ گیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کے پیٹ میں آگ لگنے لگی۔

مسافر خانہ دور تھا۔ لڑکے نے سوچا کہ گھر جا کر کچھ کھا لے، وہیں بیٹھ کر درخواست بھی لکھ دے گا۔

گھر لوٹتے وقت لڑکا پھر اسی گلی سے گزرا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ متولی کے پاس یہ جھوٹ کام نہیں کرے گا۔ بیماری کی بات کرنے پر ہو سکتا تھا کہ متولی اسے کالے بچھو کا تیل لگانے کے لیے دے دیتا۔ کچھ دن اثر دیکھنے کے لیے کہہ سکتا تھا۔ مریض دیکھنے وہ گھر بھی آ سکتا تھا۔ دوا کا اثر نہیں ہوا تو پیڑ کی ڈالیاں وہ کٹوا دے گا، وہ ایسا کہہ سکتا تھا۔ لیکن تب تک پیڑ پتوں سے بھر جاتا۔ تب تک ہو سکتا تھا وہ ہرے بھرے پیڑ کو کاٹنے سے انکار کر دیتا، آئندہ خزاں تک سب کچھ ٹل جاتا۔

لڑکا گھر آ گیا۔ تیز دھوپ میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ماں اسے دروازے پر ہی مل گئی، اس کی صبح کی باتوں سے وہ ناراض تھی۔ لڑکے کو دکھ ہوا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ماں ہے، چٹکیوں میں مان جائے گی۔ وہ ماں سے لپٹ گیا۔

''پیٹ میں آگ لگی ہے۔'' اس نے اپنا گال ماں کے کندھے سے رگڑا۔

''کہاں گیا تھا صبح سے؟'' ماں نے اپنا کندھا ہٹاتے ہوئے غصہ دکھایا۔

''لکڑی کی ٹال۔'' لڑکے نے پھر گال ماں کے کندھے سے چپکا دیا۔ اس بار ماں نے نہیں ہٹایا۔

''کیوں؟''

''دوست کے گھر پر ہَون ہے۔ اس کے لیے لکڑیاں لینی تھیں۔'' لڑکے نے جھوٹ بولا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ بڑی روانی سے جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے اب جھوٹ گھڑنا بھی نہیں پڑ رہا ہے۔ ہون کا سن کر ماں خوش ہو گئی۔ وہ اندر چلی گئی، لڑکا بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ماں باورچی خانے میں آ گئی، اس نے لڑکے کے لیے کھیر اور ہرے چنے بنائے تھے۔ لڑکا وہیں فرش پر بیٹھ

گیا۔ ماں نے اس کے سامنے تھالی رکھ دی اور خود بھی سامنے بیٹھ گئی۔ لڑکے نے کھانا شروع کر دیا۔ اسے کھانے کے بعد درخواست لکھنی تھی۔ اس نے وکیل سے کہہ تو دیا تھا کہ وہ درخواست لکھ لے گا، لیکن اس سے پہلے کبھی نہیں لکھی تھی۔

''تم درخواست لکھ سکتی ہو؟'' اس نے ماں سے پوچھا۔ ماں کو بھگوان کے نام درخواست لکھتے اس نے کئی بار دیکھا تھا۔

''کیوں؟'' ماں نے اسے دیکھا، ''کسے لکھوانی ہے؟''

''میں نے صبح چھت سے دیکھا، سامنے پیڑ کے درمیان سے اپنے ٹیلی فون کے تار آئے ہیں۔ پیڑ پر پتے آنے لگے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ تاروں کو خود میں چھپا لیں گے۔ ان پر شبنم گرے گی تو اس کی نمی تاروں میں پہنچ جائے گی۔ اس سے فون خراب ہو سکتا ہے۔ اگر پتوں سے نہیں بھی ہوا تو جب پھول آئیں گے تب ہوگا۔ پھول سے کپاس اُڑے گی، تاروں سے چپک جائے گی...'' لڑکے نے گھبراہٹ میں ڈھیر سارے چنے منھ میں بھر لیے تھے۔ اتنا بول کر وہ انھیں دھیرے دھیرے چبانے لگا۔

''کیا فون بند ہو جائے گا؟'' ماں فکر مند ہو گئی۔ وہ اپنی ماں سے فون پر روزانہ ایک بار بات کرتی تھی۔

''بند نہ بھی ہو تو بھی ایسا لگے گا جیسے فون پر کوئی سسکیاں لے رہا ہے۔ کچھ سنائی نہیں دے گا۔''

''ہاں سسکیوں کے بیچ میں بولا ہوا ایک لفظ سنائی نہیں دیتا۔''

ماں سچ مچ فکر مند ہو گئی تھی کیوں کہ جب اس کی ماں فون پر سسکیاں لیتی تھی تو وہ کچھ نہیں سمجھ پاتی تھی۔

''تم کھا لو۔ میں درخواست لکھ دیتی ہوں۔''

لڑکا خوش ہو گیا۔ اس نے جلدی سے کھیر کھانے کی بجائے پی لی۔ چنے نگل لیے۔ ماں اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

لڑکے نے اسے کاغذ قلم دیا۔ اسے بتایا کہ درخواست متولی کے نام لکھنی ہے کہ وہ اس پیڑ کی ان شاخوں کو کٹوا دے جو تاروں کے پاس ہیں۔ ماں درخواست لکھنے بیٹھ گئی۔ لڑکا چھت پر آنگن والے لڑکے کو دیکھنے چلا گیا۔ آنگن خالی تھا۔

اگر چہ چھت والے لڑکے کو آنگن والے لڑکے کی نظر آنے کی امید نہیں تھی، پھر بھی امید کی ایک امید تھی۔ تبھی اوپر سے ایک ہوائی جہاز شور کرتا ہوا گزرا۔ جہاز دیکھنے کے لیے اندر سے وہ لڑکا بھاگتا ہوا آنگن میں نکل آیا۔ جہاز آنگن سے چھت کی طرف آ رہا تھا۔ جہاز کو دیکھتے ہوئے آنگن والے لڑکے کی نگاہ چھت پر گئی۔ اس نے جہاز دیکھنا چھوڑ دیا اور چھت والے لڑکے کو دیکھنے لگا۔ وہ ننگے پاؤں بھاگتا ہوا آنگن میں آیا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ آنگن کی اینٹ پر اس کے تلوے جلنے لگے۔ وہ کھڑا تھا مگر جلدی جلدی پیر بدل رہا تھا۔ اس دھوپ میں آنگن میں یوں ہی کھڑا وہ ڈر رہا تھا۔ تلوؤں کی جلن نے اسے دیر تک وہاں کھڑا نہیں رہنے دیا۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔ چھت پر کھڑا ہوا لڑکا خوش ہو گیا۔ اس نے پیڑ کو دیکھا، چار سو تیس پتے ہو گئے تھے۔

آنگن کا نل تھوڑا ڈھک گیا تھا۔ لڑکا اگر پاؤں دھوتا تو اس کے پنجے نظر نہیں آتے۔ شاخیں نہیں کٹیں تو اسی طرح ایک روز لڑکا بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ لڑکا اداس ہو گیا۔ اس کی اداسی اتنی بڑھی کہ وہ گھبرا کر نیچے اتر آیا۔ ماں نے درخواست لکھ دی تھی، اس نے بغیر پڑھے اسے جیب میں رکھ لیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

مسافر خانہ شہر کے وسط میں تھا۔ برسات کے دنوں میں جب ندی کے گھاٹ کی اوپری سیڑھیاں ڈوب جاتی تھیں اور کشتیاں اُلٹ کر رکھ دی جاتی تھیں اور پُل سے گزرنے والی ریل گاڑیوں میں بیٹھے لوگ ندی میں جارج پنجم اور وکٹوریہ کے سکے پھینکتے تھے، ان دنوں مسافر خانہ بھرا رہتا تھا۔ آس پاس سے یا دور دراز سے بھی لوگ میلوں میں آتے تھے، شادیوں میں آتے تھے، موت میت میں آتے تھے، فصل کٹنے پر، منت پوری ہونے پر آتے تھے۔ ندی سوکھتی گئی۔ مسافر خانے کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ گوشوں میں مکڑیوں نے جالے بنا لیے۔ چھت پر سبز پتوں والے پودے اُگ آئے تھے۔ مسافر خانے کو روپے دینے والے گھر خود فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں نے بھی فصلوں، بیماریوں، موت میت اور منتوں میں آنا چھوڑ دیا۔ آزادی کے بعد اس میں دفتر کھول دیے گئے۔ جنم لینے اور مرنے کی خبر کا دفتر، ٹیکے لگانے، مردہ جانور اٹھانے کا، گمشدوں کو تلاش کرنے کا دفتر کھل گیا۔ باہر ان کی تختیاں لگی تھیں۔ پہلے وہ ہوا میں لٹکیں، پھر ٹوٹ کر نالی میں گر گئیں۔ اسی مسافر خانے میں وقف کا دفتر تھا۔

لڑکا مسافر خانے کی تین ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اونچے دروازے سے اندر داخل

ہوا۔ اندر ایک کھلی جگہ کے چاروں طرف مربع نما گلیارا تھا۔ اس کے ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے، کمرے کے باہر نام کی تختیاں جھول رہی تھیں۔گلیارے کے ایک کونے میں دو گھڑوں میں پانی رکھا تھا۔ ایک گھڑے کے اوپر ہینڈل والا چھوٹا سا جگ رکھا ہوتھا۔گلیارے کے باہر کی کھلی جگہ میں پودوں کی کیاریاں تھیں۔

پہلا بڑا کمرہ وقف کا تھا۔لڑکا کمرے میں گیا۔ بڑی سی میز کے پیچھے دُہرے بدن کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ متولی تھا۔ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔لڑکا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔لڑکے نے کمرے میں نظر دوڑائی۔متولی کے پیچھے کی دیوار کے دونوں سروں پر لمبی کھڑکیاں بنی ہوئی تھی۔ ایک سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ کمرے میں اسی کی روشنی تھی۔ اسی روشنی میں کھڑکیوں کی سلاخوں کا بھورا زنگ چمک رہا تھا اور نیچے کی دھول بھی۔ دوسری کھڑکی کے پیچھے سڑک نظر آرہی تھی۔ سڑک پر درگاہ پر چڑھانے والی چادر کے چاروں کونے پکڑ کر لڑکے پیسے مانگ رہے تھے۔ ایک مداری جمورے کو زمین پر لٹانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بانسری بجاتا ہوا ایک آدمی کندھے پر ڈھیر ساری بانسری، رنگین غبارے، غلیل، رنگین لٹو، کاغذ کے جانور لٹکائے جارہا تھا۔ایک لڑکی اور لڑکا اس کی دُھن پر ناچتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے جارہے تھے۔

''بچھو کے بارے میں لوگ زیادہ نہیں جانتے۔'' متولی کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی بول رہا تھا۔متولی اسے بہت دھیان سے سن رہا تھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ جانوروں کے بارے میں بھی نہیں جانتے۔ان کے اندر انمول خزانے چھپے ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے۔ ان کی کھال، ان کے زہر، ان کی لار، ان کے نیچے کی گولیاں، ناخن، بال تک میں ہر بیماری کا علاج ہے۔جس دن انسان جانوروں کے اندر چھپی اس طاقت کو جان لے گا، سب کچھ بدل جائے گا۔ نہ کوئی بوڑھا ہوگا، نہ مرے گا۔مکڑی کے جالے کے تار، بچھو کا زہر۔'' وہ آدمی فرش تک جھکا۔جھولے کے اندر سے کانچ کی بڑی شیشیاں نکال کر میز پر رکھی، ''میرے اجداد جانتے تھے۔تبھی سیکڑوں سالوں سے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔اب ریگستان کے اس بچھو کو دیکھیے۔دنیا کا سب سے زہریلا جانور ہے۔اس کی دُم دیکھیے، ہمیشہ کمان کی طرح اوپر اٹھی رہتی ہے، ڈنک مارنے کو تیار۔ ریگستانی لومڑی، کنگارو، چوہا تک اس کے زہر سے نہیں بچ پاتے۔اس میں تیل بہت کم ہوتا ہے، مگر جتنا ہوتا ہے اسے امرت سمجھیے۔اور اسے دیکھیے،'' اس نے ایک اور بڑی شیشی آگے بڑھائی، ''پہاڑوں کی چٹانوں میں رہنے والا۔روم کے لوگ اپنے

چغے کا ایک حصہ اس کے زہر سے رنگواتے تھے۔ کبھی اچانک مرنا پڑے تو اسے چاٹ لیتے تھے۔ بہت سے لوگ اسی طرح مرے ہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ سقراط کو بھی اسی کا زہر دیا گیا تھا۔''

لڑکا بھی جھک کر بچھو دیکھنے لگا۔ اس نے پہلے کبھی بچھو نہیں دیکھا تھا۔ کانچ کی بڑی شیشی میں بند ہونے کے بعد بھی وہ خوفزدہ تھا۔ اس کی کھال بٹی ہوئی رسی کی طرح اور چمکدار تھی۔ لڑکے نے اتنا گہرا سیاہ رنگ کبھی نہیں دیکھا تھا؛ نہ بادلوں میں، نہ شہتوت میں۔ لڑکے نے سر اٹھا کر متولی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''لیکن مجھے زندہ نہیں چاہیے۔''

''وہ میں دوں گا بھی نہیں۔'' اس آدمی نے شیشیاں واپس اپنے جھولے میں رکھ لیں۔ ''مار کر دوں گا۔ تیل آپ نکالیے گا۔'' اس نے ایک بار لڑکے کو دیکھا، پھر اُٹھ گیا۔ ''باقی باتیں شام کو دکان پر کروں گا۔ تب تک میں میڈیکل کالج جا رہا ہوں۔ وہاں بھی ان کی ضرورت ہے۔''

''مگر انھیں یہ مت دینا۔''

''نہیں۔ انھیں تو دُم نکلے ہوئے معمولی بچھو دوں گا جو مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ آپ کے لیے رہیں گے۔'' اس نے پاجامے کا ازار بند کھول کر باندھا، پھر جھولے کو کندھے پر لٹکا کر چلا گیا۔

''ہاں؟'' متولی اب لڑکے کی طرف مڑا۔

لڑکے نے جیب سے درخواست نکال کر اسے تھما دیا۔ متولی نے میز پر رکھا چشمہ آنکھوں پر چڑھایا۔ درخواست پڑھی۔ چشمہ اُتار کر میز پر رکھا۔ چشمے کے پاس کاغذ رکھا۔ لڑکے کو دیکھا اور پھر ہنسا۔

''کمال ہے! ایک پیڑ کی شاخوں سے اتنی دشمنی... جیسے وہ بچھو ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے انھیں شاخوں کو کاٹنے کی ایک اور درخواست آئی ہے۔'' اس نے دراز کھولی اور ایک کاغذ نکال کر لڑکے کے سامنے رکھ دیا۔

اس خزاں میں چھت والے لڑکے نے پانچ جھوٹ بولے۔ آنگن والے لڑکے نے کتنے بولے، پتہ نہیں لیکن پتے آنے سے قبل پیڑ کی شاخیں کٹ گئیں۔

- 7 -

کسی نے پوچھا تھا، یہ سڑک کہاں جاتی ہے؟

جواب ملا تھا، کہیں نہیں جاتی۔ یہیں پڑی رہتی ہے۔

واقعی سڑک کہیں نہیں جاتی؛ خوش قسمت ہے یا بدقسمت، مگر یہیں ایک جگہ پڑی رہتی ہے، ستاتی رہتی ہے۔ خواہ کتنے ہی بھٹکے ہوئے لوگ اس کی آغوش میں سما جائیں، اسے پرواہ نہیں۔

مسافر بھی تو کم خودغرض نہیں ہوتے۔ سڑک کی بانہوں میں پناہ لیں گے، اسی کے سینے کو روندیں گے اور اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھیں گے، اپنے اپنے سفر میں گم چلتے چلے جائیں گے۔ انھیں ہم سفر کہنا ٹھیک ہوگا؟

سڑک کا کیا ہے، وہ تو کسی سفر پر نکلتی نہیں ہے، اس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ انجام۔ وہ نہ کہیں سے چلی ہے اور نہ اسے کہیں جانا ہے۔ تو پھر بھلا اسے ہم سفر کی کیا ضرورت؟

میں سڑک ہی تو ہوں؛ بے غرض، غیر جانب دار اور بے نیاز۔

مگر میرا آغاز ہے اور میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرا سفر کب اور کیسے شروع ہوا۔

مجھے ہم سفر کی بھی ضرورت ہے لیکن میری کوئی منزل نہیں، اس لیے تم مجھے آخر تک برداشت نہیں کر سکتے کیوں کہ میرا کوئی آخر ہی نہیں ہے۔ اس لیے، جب تک ہم دونوں کی کہانی ختم نہ ہو جائے، میرے ساتھ چلتے رہنا۔ میں کوشش کروں گا کہ کہانی ختم ہونے سے پہلے ہمارا سفر ختم ہو جائے۔ تمھارے سفر کی بات کر رہا ہوں۔

میرا سفر تو تمھاری کہانی کے ساتھ ہے۔ جب کہانی ختم ہوگی، سفر بھی ختم ہو جائے گا۔

لیکن میں کچھ وقت بچا کرر کھ لوں گا۔ کہانی ختم کر کے تم سے الگ ہو کر سڑک کے دوسرے کنارے پر چلا جاؤں گا۔ تمھارے سفر کو میری نظر نہیں لگے گی۔ میں کچھ دور چل کر تمھاری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤں گا اور اپنا سفر تنہا ہی طے کروں گا۔ تمھیں خبر نہ ہوگی۔ ڈر نا مت کہ تم میرے سفر کے ساتھی ضرور بنو گے مگر منزل کے ساجھے دار نہیں۔

ایک بات اور۔ میں کہانی سنا تو رہا ہوں لیکن اس پر میرا مالکانہ حق نہیں ہے، یہ تمھاری بھی اتنی ہے جتنی میری ہے۔ میرے دماغ میں سب کچھ گڈ مڈ ہو چکا ہے۔ کب کون تھا، کب کون آیا، کب میں تنہا تھا، مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ میرے لیے یہ تصور کرنا ہی ناممکن ہے کہ کیا ایسا وقت بھی تھا جب کوئی نہیں تھا۔ اس وقت کیا میں تھا؟

دور ہونے کا احساس اپنائیت دیتا ہے کیوں کہ اس میں قریب ہونے پر اس کے جدا ہو جانے کا خوف شامل نہیں ہوتا۔ فاصلہ محبت کی عجب ڈور ہے جو ہمیشہ تنی ہوتی ہے۔ ایک کشش ہوتی ہے جو لحہ در لحہ کھنچتا رہتا ہے۔ دور ہونے پر چیزیں کس طرح قریب ہونے کے لیے مضطرب رہتی ہیں۔

مثلاً اس وقت اپنے بستر پر دراز مجھے پہاڑوں کی یاد آ رہی ہے۔ یادوں کی تلچھٹ میں جھانکنے کا یہ آغاز ہے۔ دیکھنے میں سننے کا جذبہ بھی شامل ہے، جیسے کھڑکی کے باہر ٹکٹکی لگائے دھوپ کو دیکھنا۔ اس دھوپ میں بچپن سے لے کر اب تک کی ہر آہٹ شامل ہے۔ میں کھڑکی کے باہر چھٹکی ہوئی دھوپ کو پہچانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی دھوپ ہے جو میری یادوں کے شہر کے ہر حصے میں پڑ رہی ہے جہاں میں اس وقت ہوں۔

میں ایک جگہ پر ہوتے ہوئے بھی بہت سی جگہوں پر ہوں۔ کسی اور کی یادوں میں بھی، خود کی یادداشت میں بھی۔ اس طرح بہت سارے وقتوں کو ایک ساتھ دیکھ پانے میں قادر ہوں۔

میں کسی اسٹیشن پر بیٹھا وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔ کوئی گاڑی آئے گی اور مجھے کہیں بھی پہنچا دے گی۔ ہم ہر چیز اپنے طریقے سے کرنا چاہتے ہیں، جینا بھی اور محسوس کرنا بھی۔ اسی چکر میں وقت کی کئی صدیاں اور پرتیں اُدھیڑ ڈالتے ہیں۔ ایک خاص وقت تک پہنچنا، کئی وقتوں کی صفوں کو توڑ کر جانا ہے۔ میں ایک طویل مگر مختصر سفر میں ہوں۔ مجھے پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف میں پہنچنا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بس ایک وقت ہی ہے جو مجھ سے واقف ہے۔ مجھے سفر کے درمیان ایمان دار ہونا پسند ہے۔ یہ خود تک پہنچنے کی پہلی شرط ہے۔ کئی بار طویل سفر کے بعد بھی میں

خالی ہاتھ لوٹا ہوں۔

کسی سفر کے لیے نکل پڑنا دراصل برسوں پرانی یادوں کو متحرک کرنا ہے۔ بے نام جگہوں پر جہاں ہم کبھی نہیں گئے، جہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں، وہ خوشی نہیں دیتا۔ خوش ہونا لمحاتی ہے۔ وہ ایک لاتعلقی دیتا ہے۔ اب وہاں پہنچ کر پھر واپس آنا ہوگا۔ زندگی بھر ہم کسی جگہ پہنچنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں لیکن اصل تو راستہ ہے اور وہ راستہ ایمان داری کا ہے۔ ہم زندگی بھر کہیں نہیں پہنچ پاتے، ہمیشہ راستوں میں ہوتے ہیں۔ انتظار ہی زندگی کا حاصل ہے جو ابھی ہے، جو گزر چکا ہے اور جو گزرنے والا ہے، اس کا انتظار۔

مثلاً ریل کا سفر کسی دوسری زندگی کے کسی کردار کو جی لینے جیسا ہوتا ہے۔ ہم اس کردار کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں جو ہم کبھی نہیں تھے۔ اتنے قریب سے ہم اپنے بغل میں بیٹھے، بات کرتے یا سوتے ہوئے اجنبی لوگوں کو کبھی نہیں دیکھ پاتے۔ دنیا کی کسی کتاب کے کسی صفحے پر اجنبیت اور اپنائیت کا اتنا آسان رشتہ موجود نہیں ہے۔ دراصل جینا، پڑھنے سے کہیں زیادہ تجربہ دیتا ہے۔ جذبات کی دیواروں کے درمیان ہم اپنے آپ میں اتنا گم رہتے ہیں کہ خود سے بھی ہماری ملاقات نہیں ہو پاتی۔ لیکن ریل کے سفر میں اپنے اس سچ کے ساتھ ہر ایک شخص چل رہا ہوتا ہے جو وہ ہے۔ ہم بھی وہ ہیں جو ہم اکثر چھپا لیتے ہیں۔ ایک کمپارٹمنٹ کی الگ الگ برتھوں پر کتنی ساری کہانیاں ایک ساتھ چل رہی ہوتی ہیں لیکن ان میں سے کچھ بغیر ہونٹ ہلائے بہت کچھ کہنے کی اذیت میں مبتلا رہتی ہیں، حتیٰ کہ وہیں دم توڑ دیتی ہیں۔

وہ لوکل ٹرین میں سارے راستے مجھ سے چپک کر بیٹھا رہا، اور ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر بنا کچھ کہے، بغیر مڑے اتر گیا۔

فلائی اوور کے نیچے کھڑی کار میں ہم خاموش تھے، آخر تک خاموش ہی رہے۔

اس اے ٹی ایم کی لائن میں وہی تھا۔ مجھے یاد تھا؛ اس کی کھوپڑی میں ٹٹولنے پر ایک گڈھا سا نظر آتا تھا، اس کے کندھوں پر چاقو کا ایک لمبا نشان، بغلوں میں چلنے والی گدگدیاں، اس کا آدھا ٹوٹا ہوا دانت اور تنا ہوا جینئو۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ ان دنوں میرا کیا نام ہوا کرتا تھا۔

بارش بس ہوئے جا رہی تھی؛ بادل تب بھی گھرے تھے جب وہ اپنے گھر سے نہا کر نکلا تھا۔ بجلی کڑکنے لگی، پینٹ اتارنے کے چکر میں موبائل پھسل کر گر پڑا تھا۔ اب بھی بادل برس رہے

ہیں اور وہ مہمان کی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھا، کبھی کھڑکی کی طرف کبھی میری طرف تو کبھی موبائل کی طرف دیکھ رہا ہے۔

مجھے اسے کچھ بتانا تھا۔ میں اب بھی راتوں میں ہڑبڑا کر جاگ جاتا ہوں۔ برسات رُک چکی ہے اور وہ باہر بھیگی ہوئی سڑک پر ہے۔

موبائل پر پڑی ہوئی دراروں کو وہ ایسے سہلاتا ہے جیسے کندھے پر بچپن کا کوئی لمبا سا نشان ہے جو کبھی کبھی یادوں کو کھجلاتا ہے۔

اس لمبے سفر میں اس اجنبی نے بہت ساری باتیں کی، شاید کسی امید میں۔ کالج کے بچھڑے دوست کی طرح اب خاموش ہے کیوں کہ اسے پتہ ہے کہ 'میں ہوں' اور مجھے پتہ ہے کہ 'وہ نہیں ہے'۔

کافی وقت گزر چکا ہے۔ مہینے یا سال نہیں، دہائیاں۔

دس سال پہلے کسی نے مجھے تمھارے بارے میں بتایا تھا، جے پور کے انجینئرنگ ہاسٹل کے میرے کمرے میں، رات کے دس گیارہ بجے۔ بہت ساری باتیں بھول گیا جو اکثر ہاسٹل میں ہوا کرتی ہیں۔ میرے روم پارٹنرز کے ان پانچ چھ دوستوں (جن کے نام میں جانتا نہ تھا مگر جو میرے دوست بننے والے تھا، ان کے نام مجھے اب بھی یاد نہیں ہے، سچ مچ یاد نہیں ہیں) میں سے ایک نے اس حبس بھری شام کو بتایا تھا کہ ہمارے اسکول ہاسٹل میں ایک چوتیا تھا جو اپنے انڈر ویئر میں ہاتھ ڈالے رکھتا تھا۔

تمھارے بارے میں اور بھی کئی غیر ضروری باتیں مجھے بتائی گئیں، جیسے لوگ کس طرح تم سے برتاؤ کرتے تھے، ہنستے تھے، تمھیں ہاتھ دھونے کو بولا جاتا تھا، تم نے مار بھی کھائی تھی کیوں کہ تم نے کسی کے کھانے کو چھوا تھا۔ تم نہانے جاتے تھے تو ہاسٹل کے گلیاروں سے گزرتے ہوئے، گانا گاتے ہوئے ایک ہاتھ میں بالٹی لیے اور دوسرا ہاتھ انڈر ویئر میں ڈالے ہوئے۔

اور بھی کئی باتیں ہوئی، وہ رات گزر گئی، کئی راتیں گزر گئیں، ہاسٹل چھوٹ گیا، سب چھوٹ گئے، نئے لوگ ملے، نئی باتیں ہوئیں۔ بچھڑنے اور ملنے کا یہ سلسلہ زندگی میں کبھی نہیں رکا، نہ تھما۔ زندگی میں کچھ تھا جو کبھی نہیں مٹا، کبھی نہیں دھندلایا بلکہ اور دبیز ہوتا چلا گیا، 'تمھارا انڈر ویئر میں ہاتھ'۔

کئی بار طلب ہوئی کہ ان پرانی ڈائریوں کو اٹھاؤں جو ہاسٹل کے آخری دن میں لیے گئے فون نمبروں سے بھری ہیں، جو ان برسوں میں بدل چکے ہیں اور جنھیں بدل جانے سے پہلے یا بعد میں تلاش نہیں کیا گیا ہے۔ ان ناموں اور نمبروں کے درمیان اس ایک کو ڈھونڈنا مشکل ہے جو گانا گاتے ہوئے، ہاسٹل کے گلیاروں کو پار کر رہا ہوا ایک ہاتھ میں بالٹی پکڑے اور دوسرا انڈر رویئر میں گھسائے ہوئے۔ جی چاہتا ہے اس سے پوچھوں تمھارا نام، تمھارے انڈر رویئر کا رنگ، تمھارا رنگ، تمھاری بالٹیوں کا رنگ، تمھاری آنکھوں کے بارے میں، تمھارے ہاتھوں کے بارے میں کہ تمھارے ہاتھوں کی بُو، ان کا ذائقہ اگر کبھی ذرا سا بھی چکھا ہو، تمھارا شہر تمھاری گلی سب کچھ پوچھ ڈالوں تاکہ کبھی تمھارے شہر تک، تمھاری گلی تک، اس بستر تک آؤں جس پر تم انڈر رویئر میں ہاتھ ڈالے پڑے ہو۔

۱۹۷۳ء کا سال تھا جب میں پہلی بار اس سے ملا۔ اس کے ہاتھ نرم تھے، نازک نہیں تھے، بس نرم تھے۔ وہ جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہنستا تھا تو پوری دنیا جیسے ٹھہر جاتی تھی۔ اس کی ہنسی میں بھی میں کچھ تولنے یا اندازہ لگانے کی کوشش کیا کرتا تھا، 'وہ ہے یا نہیں؟' کئی بار جب وہ نہا کر سامنے آتا تھا، صرف بوندوں میں لپٹا ہوا، میری نسوں میں خون جم جاتا تھا مگر میں کبھی اس کا اظہار نہ کر پایا کیوں مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ 'وہ ہے یا نہیں؟'

ہمارے درمیان کتنی باتیں ہوئیں؛ ہاسٹل کی چھت پر، ڈوبتے ہوئے سورج کے نیچے، رات کے دو بجے، مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے، شراب پیتے ہوئے، مائیکرو پروسیسر کے لیکچرز میں، لیبارٹری میں، امتحان سے پہلے صفحے پلٹتے ہوئے، امتحانات کے دوران، امتحانات کے بعد، فریشر میں، الوداعیہ تقریب میں۔ کتنے قہقہے شیئر کیے گئے اور میں ہر بار یہی سوچتا رہا کہ 'وہ ہے یا نہیں؟'

اس کے ساتھ وقت تیزی سے گزر گیا اور پھر معلوم ہوا کہ زندگی کتنی لمبی اور ٹھہری ہوئی ہے۔ اس طویل سی ٹھہری ہوئی زندگی میں کافی لوگ ملے، مگر ایسا کچھ تھا جو کھو گیا تھا۔ نئے سال تھے، شاید ۱۹۹۰۔ دنیا کھل رہی تھی۔ میں ڈر گیا۔ میں نے اندھیروں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

اب پبلک ٹوائلٹ میں بھی 'وہ ہے یا نہیں' کا سوال غائب ہو چکا ہے، سرکاری بس اسٹینڈ پر ملے اس آدمی کی نظروں میں مجھے کچھ تولنا نہیں پڑا، نہ ہی کسی دوسرے شہر کے ہوٹل میں

ویٹر کو پیسے دینے کے بہانے چھوتے ہوئے میری دنیا ٹھہری، نہ کبھی میرا خون خشک ہوا۔ جو ملا، ادھورا ملا، کچھ ہمیشہ کے لیے باقی بچا رہا۔ غلط لگتا ہے، غلط ہوں میں، کچھ تو غلط کیا ہے میں نے۔ شاید 'وہ ہے یا نہیں؟' کی لاجوابی ہی میرے معتوب ہونے کا سبب ہے۔

پُل کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا ہے۔ اس کے نرم سے ہاتھ (نازک سے نہیں، صرف نرم سے) اب نرم نہیں رہے ہوں گے، میری طرح جھریوں سے بھر گئے ہوں گے۔ اتنے برسوں میں سب کچھ بدل گیا ہوگا؛ اس کی ہنسی، اس کی باتیں، سب کچھ بدل گیا ہوگا۔ اب وہ ملے تو شاید مجھے نئے سرے سے اپنی تلاش شروع کرنی ہوگی کہ 'وہ ہے یا نہیں؟'

- 8 -

ہاتھوں میں پکڑا ہوا کیمرہ سانس لینا بند کر چکا تھا۔ آنکھیں ساکت ہوگئی تھیں اور سامنے بیس سال پرانا وقت اپنی بانہیں کھولے کھڑا تھا۔

ایک ۱۰ / ۱۲ فٹ کا کمرہ، جس میں ایک پلنگ تھی۔ سیمنٹ کے بنے ہوئے چار ریکوں میں سب سے اوپر سوٹ کیس پڑا تھا، پھر کتابوں کی جگہ بنائی گئی تھی۔ پھر بھگوان جی براجمان تھے اور سب سے نیچے سب کچھ۔

کھڑکی کی سبز ریلنگ پر کوئی لٹکا ہوا تھا۔ لمبے بال، ہاف پینٹ اور آنکھوں میں شرارت۔ سامنے کسی کی شادی کا کھانا پک رہا تھا اور وہ اس کھانے کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر آواز آئی، 'ماں بھوک لگی ہے'۔ دو چوٹی والی ماں باورچی خانے سے نکلی تھی، شکر بھر کے بنائی ہوئی روٹی کے ساتھ۔ ماں کو شاید پتہ تھا کہ لمبے بالوں والا شادی کا کھانا دیکھ کر للچا گیا ہے۔

کیمرہ رُک گیا، ریل (Reel) پیچھے گھوم گئی تھی، بیس سال پیچھے۔ کلک کرنے کے لیے اٹھی انگلی یخ ہوگئی تھی۔ فریم میں وہ لمبے بالوں والا لڑکا آ نہیں رہا تھا۔ کیسے آتا، وہ تو کیمرے کے پیچھے تھا۔

دو کیمرے، ایک ویڈیو ریکارڈر اور ایک موبائل۔ سب کچھ ریکارڈ کر لینا تھا۔ لڑکیوں سے گھرے گارڈن کے سامنے بھی کوئی کھڑا تھا، ٹن کا دروازہ ٹھیک کرتا ہوا۔

وہ تیز دھوپ میں پھاوڑا اور گینتی چلا رہا تھا۔ پسینے سے شرابور دبلے پتلے ہاتھ تھکے ہوئے تھے لیکن خوش تھے۔ گینتی پتھر پر لگتی اور 'ٹن' کی آواز آتی تھی۔ اسے گرمیوں کی چھٹیوں میں پھول اُگانے تھے۔

گیلی مٹی اوپر آ گئی تھی، ساتھ میں دُوب گھاس، پتے اور سڑی ہوئی بیل بھی جو پیڑ سے گرا تھا۔ گھر کے اندر سے ماں نے آواز دی تھی، 'اب چھوڑ دو۔ بیج ڈال دو، شاید اس بار پھول لگ ہی جائیں۔'

وہ ہر کیمرہ کلک کر چکا تھا، لیکن نہ تو گیلی مٹی آئی، نہ دُوب اور نہ ہی سڑی ہوئی بیل۔ ایک بدصورت جھونپڑی جو اس مٹی پر اُگ آئی تھی، اس کا دروازہ تصویر میں منہ چڑھا رہا تھا۔ بغل کے باغیچے کی بکری ممیائی اور بولی، 'کہاں رہے اتنے دن؟ اب تو میں جا چکی ہوں۔'

دو کمروں والے گھر کے سامنے امرود کا پیڑ سوکھ چکا تھا، لیکن بقیہ جگہ میں ہریالی بہت تھی۔ بالکنی میں کھڑا لڑکا اب نوجوان ہو چکا تھا۔ منتشر داڑھی اور بال لمبے ہو چکے تھے۔ چہرے پر عجیب وغریب چشمہ اور بے چینی تھی۔

وہ بار بار بالکنی میں کسی کو تلاش کرنے آتا اور پھر گھر کے اندر چلا جاتا۔ ٹی وی چلنے کی آواز صاف طور پر آ رہی تھی۔ کیمرہ نکلا اور کھٹا کھٹ پرنٹ کے پرنٹ چھپنے لگے۔ زرد دیوار زرد ہی تھی۔ سوکھا امرود کا پیڑ بھی تھا لیکن لمبے بالوں والا یہاں بھی غائب تھا۔ اس کی بے چینی کیمرے کے پیچھے نظر آنے لگی تھی۔

کیمرے میں کچھ بھی قید نہیں ہو رہا تھا لیکن بہت کچھ کلک ہو رہا تھا۔ کالونی کے ٹپوری چوک سے آگے بڑھتے ہوئے پان کی گمٹیاں جواب بڑی ہو گئی تھیں، سامان سے لدا ہوا منھ چڑھا رہا تھا اور پان لگاتا ہوا پنواڑی بوڑھا ہو چکا تھا۔ وہ مسکرایا تھا، اس کے دانت سفید سے بھورے ہو چکے تھے۔ بولا، 'اتنا کیمرہ ہے، ایک آدھ ہماری فوٹو بھی کھینچ دو۔'

بھورے دانت اور منھ چڑھاتا سامان قید ہو گئے لیکن اپنے لیے پچاس پیسے والی ٹافی خریدتا ہوا لمبے بالوں والا وہ بے چین نوجوان اب بھی مسکرا رہا تھا، جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تم مجھے قید نہیں کر سکتے۔

اندر بارش ہو رہی تھی۔ جگہ جگہ گھروں کے سروں پر اُگے ہوئے ٹین کے بدصورت چھپر بے چینی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ پہاڑ اور ندی کے درمیان کا فاصلہ دو منٹوں میں طے ہو گیا۔ مندر بھی وہیں تھا۔ ہر گہرائی کا اشارہ بھی وہیں تھا اور ندی کو پار کرنے والے گوالے بھی کمر تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

لمبے بالوں والا شخص بھی وہیں تھا۔ وہ پانی میں پتھر پھینک رہا تھا۔ جب جب پتھر پانی

سے ٹکراتا، کیمرہ ٹوٹتا، فریم ٹوٹتا اور کچھ جسم کے اندر گونجتا۔

تم اس پلاسٹک کے قید خانے میں میرے وجود کو کیوں کر قید کر سکتے ہو؟

تم اپنے ذہن میں اپنی معصومیت کو کیسے قید کر سکتے ہو؟

اپنے گزارے ہوئے لمحوں کو تم صرف دیکھ سکتے ہو۔ انھیں اپنے اندر تم صرف کرید سکتے ہو لیکن اپنے دماغ میں انھیں قید نہیں کر سکتے کیوں کہ دل دماغ نہیں ہوتا اور دماغ دل نہیں ہوتا۔

جاؤ اپنے اس ننھے فرشتے کو اپنے دل میں سمیٹ کر، اس مضطرب نوجوان کو اپنی بانہوں کی گرفت میں لے لو، پھر وہ شاید تمھارے پاس اور تمھارے ساتھ رہ پائے گا۔

زندگی یادوں کی کشتی پر چڑھ کر ندی میں اتر جاتی ہے اور چھپ چھپ کی آواز سے رات کا سناٹا جھوم جاتا ہے۔ ندی کی لہریں کناروں سے سرگوشیاں کر رہی ہیں، جس میں تہذیب کے تماشے کا ذکر بھی شامل ہے۔ میں ندی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتا ہوں کہ خاموشیاں اور ٹھہراؤ کے اس دور میں ندی مجھے پتھر سمجھ کر شاید کچھ کہہ دے۔ لیکن ندی میری سازش پہچان جاتی ہے۔ ندی صدیوں سے شاعر، گلوکار، مداری، فلسفی اور عاشق کی لفاظیوں کے فریب میں پھنستی رہی ہے، اس لیے شاید اس نے ان سے بات کرنا بند کر دیا ہے جو مانگے کی زندگی جی رہے ہیں۔ ندی ایک گھاٹ پر کھڑی ہو کر دوسرے گھاٹ کی طرف دیکھتی ہے اور روتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے جیسے شادی کے بعد دلہن کی سوگوار رفتار ہوتی ہے۔ ایک لاش ندی میں ڈوب کر خودکشی کر لیتی ہے اور صبح ہو جاتی ہے۔ شہر کو کچھ نظر نہیں آتا۔

- 9 -

روشنی سے دور اندھیرے میں ایک خالی پلیٹ چمکتی ہے اور شہر ٹوٹ کر اس پلیٹ میں بھر جاتا ہے۔ پلیٹ میں پڑے ہوئے شہر کے ٹکڑے کو ایک لڑکا اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔ ایک ندی آنکھوں سے نکلتی ہے اور پہاڑ کے آخری پتھر پر جا کر سوکھ جاتی ہے۔ ایک اور لڑکا اس آخری پتھر کو اپنی روح کی سطح پر توڑ دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فروری کی ایک مقدس تاریخ کو اس کی آنکھوں میں سمندر دکھائی دیتا ہے۔

شہر کے ایک کونے پر نوادرات کی دکان تھی۔ اس دکان اور سڑک کے درمیان 'اردھ ناریشور' کی ایک چینی مٹی کی مورتی کھڑی تھی جس کا نصف حصہ مرد کا جسم اور بقیہ عورت کا جسم تھا۔ یہ مورتی چینی مٹی سے بنی تھی۔ جب بھی وہاں سے کوئی سامانوں سے لدا ہوا ٹرک یا مسافروں سے بھری ہوئی بس گزرتی تو اردھ ناریشور کی سرد جلد اور دکان کے شیشے کا دروازہ دونوں ہلکے سے کانپ جاتے ہیں۔

میں جب بھی اس دکان کے پاس سے گزرتا تو مجھے ڈر لگتا کہ کہیں وہ مورتی سڑک پر نہ گر جائے۔ میں نے دراصل ایک خواب دیکھا تھا جس میں اردھ ناریشور کا جسم سیدھا میرے اوپر گر رہا تھا۔ اردھ ناریشور نے اچانک اپنا لمبا، بہت بڑا اور سفید ہاتھ باہر نکالا اور میرے گلے کے چاروں طرف لپیٹ دیا۔ میں نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی۔ مورتی کے صرف ہاتھ کے زندہ ہونے کا عجوبہ اور چینی مٹی کی جلد کے سرد لمس کے سبب میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔

بے آواز اردھ ناریشور کی مورتی سڑک کے کنارے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے نے اس کے کچھ ٹکڑے اٹھائے۔ وہ بکھرے ہوئے چمکتے چینی مٹی کے ٹکڑوں کو جلد بازی میں سمیٹنے لگا۔ میں اس لڑکے کے ایک دم سے وہاں وارد ہوجانے پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں نے جیسے ہی اپنی صفائی دینے کے لیے منھ کھولا، میں جاگ گیا۔

یوں لگا کہ یہ سب اردھ ناریشور کے گرنے کے فوراً بعد ہوا ہے۔ میں نے اس خواب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ 'اپنے پارٹنر کو ویسی ہی عزت دو جیسے تم نازک اور کمزور برتن کو دیتے ہو۔' بائبل کی یہ سطر اس وقت اکثر میرے ذہن میں آجایا کرتی تھی۔ میں نے ہمیشہ 'نازک اور کمزور برتن' کا ترجمہ چینی مٹی کے برتن سے کیا۔ اور پھر میں نے اس کا ترجمہ اس لڑکے سے کیا جو میرے خواب میں آیا تھا۔

ایک نوجوان لڑکا فوراً گر جاتا ہے۔

ایک طرح سے، محبت اپنے آپ میں ایک نوجوان لڑکے کا گرنا ہی ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔

تو کیا، میرے خواب میں ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ لڑکا جلد بازی میں اپنے ہی گرے ہوئے ٹکڑے سمیٹ رہا ہو؟

اندھیرے میں رات بھیگ گئی ہے۔ شہر سے دور ایک گاؤں سسک کر کسی کو یاد کرلیتا ہے اور سبھی گھروں کی دیواریں تھوڑی سی نم ہوجاتی ہیں۔ سڑک پر جسموں کے بغیر رینگتی پرچھائیاں پگھل کر مٹی میں مل جاتی ہیں اور آسمان سفید بادلوں سے بھر جاتا ہے، بغیر برسات والے بادل۔ گاؤں کے سب سے کنارے والے گھر میں رہنے والی بڑھیا نے ایک انتظار کھودیا ہے۔ ایک بوڑھے آدمی نے بچپن کا وہ گیت کھودیا جو اس کے دوست نے اسے سونپا تھا۔

کہتے ہیں کہ پچھلے سال جب بوڑھے نے آخری بار اپنا گیت گایا تھا تو گل مہر کی بارش ہوئی تھی۔ میں گل مہر کی بارش کی بات کرتا ہوں اور ایک لڑکا میری آنکھوں سے نکل کر بادلوں پر دوڑ جاتا ہے۔ بادلوں پر اس کے قدموں کے سرخ نشان ہیں۔

بچپن سے ہی محسوس ہوتا ہے کہ یا تو میں پاگل ہوں یا پھر آس پاس جتنے بھی لوگ ہیں وہ پاگل ہیں۔ اماں کہتی تھی، میں تھوڑا سا الگ ہوں۔ جب بڑے ہوئے تو پتہ چلا کہ ہم سب کی اماں ہم سب سے یہی کہتی ہیں۔ کافی وقت یہ سوچنے میں ضائع کیا کہ ہم میں اوروں سے کیا الگ

ہے؟ آخر ہم سب کی اماؤں کو اپنے بچوں میں کیا نظر آتا ہے؟ جو بھی نظر آتا ہو لیکن ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر انسان ایک دوسرے سے کبھی نہ سمجھ پانے کی حد تک الگ ہے۔ یہ جو الگاؤ ہے، اس کی ایک سے زیادہ وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ہم جہاں پیدا ہوئے، جہاں پرورش پائی، جہاں پڑھائی کی، کیسے لوگوں سے ملے، کیسے لوگوں سے نہیں ملے۔ دنیا میں آئے تو کیا دیکھا، کیا کھایا، کہاں روئے، کس کو رُلایا، کب یہ بات سمجھ میں آئی کہ موت ہر انسان کی ہوتی ہے خواہ وہ ہم سے کتنا ہی الگ کیوں نہ ہو۔

اور انسان ہی کیا، پیڑ پودے، کتے، بلیاں سبھی کو موت آتی ہے۔

موت میں نیا کیا ہے؟

رنگیلی کی موت بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کسی کے لیے بھی یہ عام واقعہ تھا۔ البتہ رنگیلی کی اماں بہت روئی۔ رنگیلی اپنے گھر کا سب سے بڑا اور سمجھدار لڑکا تھا، یا پتہ نہیں وہ کیا تھا۔ ویسے تو رمیش بھیا سب سے بڑے تھے اور رنگیلی دوسرے نمبر پر تھا مگر رنگیلی نے اپنے گھر کو جس طرح سنبھالا ہوا تھا، ویسا شاید ہی رمیش بھیا کبھی کر پائیں گے۔

رنگیلی کو ناچنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ڈانس کی باقاعدہ ٹریننگ لی تھی۔ شاید اس نے ڈانس میں دہلی کے کسی کالج سے گریجویشن کیا تھا اور یہاں جمال پور میں وہ ہر اسکول کے بچوں کو ڈانس کرنا سکھاتا تھا۔ اسکول والے اسے کبھی اس کی قابلیت کے مطابق پیسے نہیں دیتے تھے کیوں کہ بھئی ڈانس بھی کوئی سکھانے یا کرنے کی چیز ہے؟ اسکول کے بچے بھی اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اسکول کے بچے رنگیلی کے پیٹھ پیچھے اسے 'موگا' بلاتے تھے۔ 'موگا' کا مطلب مرد ہی ہوتا ہے لیکن لفظوں کی یہی جعل سازی تو ہے جو ہمیں 'ہم' بناتی ہے۔ 'موگی' عورت کو کہتے ہیں اور عورت کی ضد آدمی ہے۔ یعنی موگی کی ضد مرد ہے موگا نہیں، ہو ہی نہیں سکتا، خواہ آپ لاکھ کوشش کرلیں کیوں کہ یہ جو پدری معاشرہ ہے، اس کی 'غیرت' کو ٹھیس لگے گی۔

تو رنگیلی موگا تھا۔ یہ بات پورے شہر کو معلوم تھی لیکن خود رنگیلی کو اپنے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔

ہمارے اسکول میں ڈانس کا ایک مقابلہ تھا اور ٹیگور ہاؤس والوں نے رنگیلی کو ڈانس سکھانے کے لیے بلایا تھا۔ اسی دن پہلی بار میں نے رنگیلی کو دیکھا تھا۔ دِکھنے میں تو وہ آدمی ہی جیسا تھا لیکن اس کی آواز تھوڑی الگ تھی۔ بولتے وقت اس کے ہاتھ اِدھر اُدھر خوب گھومتے۔ ہنستے

وقت چہرہ سب سے چھپالیتا تھا۔ کچھ الگ تو تھا رنگیلی۔ ہم شاستری ہاؤس والے جب مقابلہ جیت گئے تو رنگیلی نے ہم سب کو آ کر مبارکباد دی۔

ہم لڑکے پورے ہفتے اسے پریشان کرتے رہے اور یہ بندہ ہماری اوقات دکھا کر چلا گیا۔ اس شام ہم سب دوست بیئر کی پارٹی مانگنے رنگیلی کے گھر گئے تھے۔ کچھ دوستوں سے ہم نے سن رکھا تھا کہ رنگیلی سخی داتا کی طرح ہے تو ہم لوگ اس کے گھر کے باہر پہنچ گئے۔ وہ ہاف پینٹ میں باہر آیا۔ اس کے پیروں میں امیزون کا جنگل اُگ آیا تھا۔

چھوٹے شہروں میں باتیں نہ گھروں میں ہوتی ہیں نہ کلبوں میں۔ لوگ سڑک پر بتیاتے ہیں اور اس وقت تک نہیں رُکتے جب تک بات ختم نہ ہو جائے، باتیں بھی کچھ ایسی کہ سڑک کم پڑ جائے مگر باتیں ختم نہ ہوں۔

ہم بھی کل آٹھ لوگ سڑک پر نکل پڑے۔ ڈانس کی باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ وہ 'ڈانس انڈیا ڈانس' کا آڈیشن دینے گیا تھا۔ فائنل راؤنڈ تک سلیکشن بھی ہوا، ٹی وی پر دکھایا بھی گیا۔ ایک دوست کے منھ سے بے ساختہ نکل پڑا، ''آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا اس وقت جب آپ سے جج گیتا نے پوچھا کہ آپ کہاں سے ہو؟ آپ نے کیوں بولا کہ آپ اڑیسہ سے ہو؟''

رنگیلی حیرت زدہ تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کسی نے اسے ٹی وی پر دیکھا تھا۔ پھر اس نے کہا، ''ہم بہار والے ایسے ہی بدنام ہیں۔ اور پھر میرا سلیکشن ہی اس لیے انھوں نے کیا تھا تاکہ پورا دیش دو سکنڈ کے لیے مجھ پر ہنس سکے کہ دیکھو کیسے کیسے نمونے اٹھ کر چلے آتے ہیں۔ خیر، لوگ مجھ پر ہنسیں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میرے گاؤں، گھر، پریوار پر ہنسیں تو اچھا نہیں لگتا۔ لیکن مجھے اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ تم لوگوں نے مجھے دیکھا۔''

ہم لوگ چپ ہو گئے۔ شاید کسی کے پاس کچھ بھی کہنے کو نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد رنگیلی نے ایک کہانی سنانی شروع کر دی۔

میری عمر نو دس برس کی تھی جب ابا نے مجھے زمین پر گھسیٹتے ہوئے گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ میں چیخ چیخ کر ماں کو پکارتا رہا مگر وہ بے حس و حرکت سہمی ہوئی مجھے تکتی رہی، صرف اس کے آنسو متحرک تھے جو بابا کے غیظ و غضب کے آگے بھی تھمنے کو تیار نہ تھے۔ ماں کا ہر آنسو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بابا کے اس فعل سے بہت نالاں تھی مگر بابا کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور بھی۔

محلے والوں کے طعنے، رشتے داروں کے طنز اور لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے جب

بابا بے قابو ہو جاتے تو وہ اپنی کالے چمڑے کی چپل سے میری چمڑی اُدھیڑتے۔ اپنے جسم پر چپل سے بنائے گئے نقش لیے میں اس کال کوٹھڑی کی جانب بھاگتا جو پورے گھر میں میری واحد پناہ گاہ بن گئی تھی۔ پٹائی کا دن جب رات میں ڈھلتا تو ماں بابا سے چھپ کر دبے پاؤں آتی۔ مجھے سینے سے لگاتی، اپنے دوپٹے سے میرے زخموں کی ٹکور کرتی۔ میرا سر اپنی گود میں لیے گھنٹوں میرے پاس بیٹھی رہتی۔ مجھے چپ کراتے کراتے اس کی اپنی سسکیاں بندھ جاتیں۔ آہوں اور سسکیوں کی گونج کے علاوہ اس کال کوٹھڑی میں کچھ سنائی نہ دیتا۔ ہم دونوں آنسوؤں کی زبان میں بات کرتے۔ میرے آنسوؤں میں اَن گنت سوال ہوتے۔ کہ آخر کیوں بابا کی نفرت کی خاص عنایت مجھ پر ہی ہے؟ آخر کیوں گھر میں مہمانوں کے آتے ہی اسٹور کے تنگ و تاریک کمرے میں گھر کے ہر فالتو سامان کے ساتھ مجھے بند کر دیا جاتا ہے اور جب تک وہ ہمارے گھر سے چلے نہیں جاتے مجھے رہائی کا پروانہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ مہمان جنھیں ہم 'اتیتھی دیوبھوا' अतिथिदेवो भव کہتے ہیں، وہی مہمان ہر بار میرے لیے زحمت کیوں بن جاتے ہیں؟ مگر ماں میرے ہر سوال کے جواب میں خاموشی سے میرے اوپر محبت بھری نگاہ ڈالتی اور کچھ نہ بولتی۔ بس کبھی وہ میرے ماتھے کا بوسہ لیتی اور کبھی میرے ہاتھوں کو چوم کر اس بات کی گواہی دیتی کہ میں تو اپنے راجہ بیٹے سے بہت پیار کرتی ہوں۔ ایک سوال کرتے کرتے میں تھک جاتا اور نیند کی آغوش میں چلا جاتا کہ آخر مجھ سے ایسی کیا خطا ہوئی جو میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح بابا کے پیار کا حقدار نہیں۔

ہاں میں ماں کی گود میں سو جانے سے پہلے یہ دعا بھی کرتا کہ یہ رات کبھی ختم نہ ہو مگر صبح ہوتی اور وہ پھر اس عورت کا لبادہ اوڑھ لیتی جو بابا اور سماج کے خوف سے مجھے پیار کرتے ڈرتی تھی۔

جس دن بابا نے مجھے گھر سے نکالا، اس دن میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں نے ماں کے سنگھار میز پر رکھی ہوئی لالی سے اپنے ہونٹ رنگ لیے تھے، اس کا سرخ دوپٹہ سر پر رکھے، اس کے ہاتھوں کے کنگن اپنی کلائی میں ڈالے اس کی ٹک ٹک کرنے والی جوتی پہن کر خوش ہو رہا تھا، بس یہ دیکھنے کی دیر تھی کہ بابا نے مجھ پر پھر جوتوں کی برسات شروع کر دی۔ میں نے بار بار معافی مانگی، ہاتھ جوڑے مگر میری شنوائی نہ ہوئی اور پھر گالی گلوچ کرتے ہوئے زمین پر گھسیٹتے ہوئے 'موگا ... موگا' کہتے ہوئے مجھے ہمیشہ کے لیے سب گھر والوں سے دور کر دیا۔

میرے لیے بابا کے آخری الفاظ یہ تھے کہ آج سے تو ہمارے لیے مر گیا۔ یہ جملہ سنتے ہی میرے ہاتھ، جو ابا کے پیروں کو مضبوطی سے پکڑا ہوئے تھے، کی گرفت کمزور پڑ گی۔ میری

گڑگڑاتی ہوئی زبان خاموش ہوگئی، میرے آنسو تھم گئے کیوں کہ میں جانتا تھا کہ بابا اپنی کہی ہوئی بات سے کبھی نہیں پھرتے۔ اور ماں، ابا کے کسی بھی فیصلے کے خلاف جانے کی ہمت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد بابا مجھے ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ گئے جہاں ایک گُرو رہتا تھا۔ میرا نام بدل دیا گیا۔ مجھے ناچ گانے کی تربیت دی جاتی۔ مجھ پر نظر رکھی جاتی لیکن جب کبھی موقع ملتا، میں ماں کی محبت میں گرفتار اپنے گھر کی طرف دیوانہ وار بھاگتا مگر بابا کا آخری جملہ مجھے دہلیز پار کرنے سے روک دیتا۔ دروازے کی اوٹ سے جب ماں کو گرما گرم روٹی اتارتے دیکھتا تو میری بھوک بھی چمک جاتی اور پھر جب وہ اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر میرے بہن بھائیوں کے منھ میں ڈالتی تو ہر نوالے پر میرا بھی منھ کھلتا مگر وہ نوالے کی حسرت میں کھلا ہی رہتا۔ اس حسرت کو پورا کرنے کے لیے میں اکثر گھر کے باہر رکھی ہوئی سوکھی روٹی کو اپنے آنسوؤں میں بھگو بھگو کر کھاتا۔

صحن میں کھڑی بابا کی سائیکل جس کو اکثر میں محلے سے گزرتے دیکھتا تو ہر بار دل میں یہ خواہش ہوتی کہ کاش بابا سائیکل روک کر مجھے ایک بار، صرف ایک بار سینے سے لگا لیں مگر میری یہ خواہش، خواہش ہی رہ گئی۔ گھر چھوڑنے کے عذاب کے بعد میرے اوپر ایک اور عذاب نازل ہوا جس کے کرب نے میری روح تک کو زخمی کر دیا۔ چند 'شرفا' گرو کے پاس آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے زبردستی بے لباس کیا اور اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا ڈالا۔ میں اتنا چھوٹا اور کمزور تھا کہ میں درد کی وجہ سے اپنے ہوش ہی کھو بیٹھا تھا۔ پھر اسی بے ہوشی کے عالم میں مجھے گرو کے حوالے کر دیا گیا۔ پھر یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ میں روز ہی اپنی ہی نظروں میں گرتا رہا مرتا رہا۔ کرتا بھی کیا کہ اب میرے پاس کوئی اور دوسری پناہ گاہ نہ تھی۔

پھر اسی کام کو میرے گرو نے میرے پیشے کا نام دے دیا۔ میں گرو کے پاس سے کئی بار بھاگا، در در نوکری کی تلاش میں پھرتا رہا مگر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ ہر بار گرو کے در پر ہی پناہ ملی۔ پھر ایک دن بابا چل بسے۔

ماں مجھے واپس گھر لے آئی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری گھر واپسی کی قیمت بابا کی زندگی ہے تو شاید میں زندگی بھر گرو کے رحم و کرم پر جینے کو ترجیح دیتا لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ ماں نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول مجھے کافی پسند تھا۔ میں اسکول بلا ناغہ جاتا تھا چونکہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ اسکول کے لڑکے مجھے مارتے تھے کیوں کہ میں دبلا پتلا اور کمزور تھا۔ میرا کوئی ایسا دوست بھی نہیں تھا جو مجھے بچا سکے۔ پھر کیا ہوا کہ جو لڑکے مجھے مارتے تھے، میں نے

انھیں سے دوستی کر لی۔ لیکن وہ اس کے باوجود مجھے مارتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، بلاوجہ۔ شاید اس لیے کہ میں تم سب سے الگ ہوں۔ اپنے دوستوں سے مار کھا کھا کر بھی میں سدھرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دوستی میں تو سب چلتا ہے نا! اسکول ٹرپ پہ دو دنوں کے لیے نوادہ جانا تھا۔ میں بھی چلا گیا۔ ان دو دنوں میں میرے دوستوں نے باری باری میرا بلاتکار کیا۔ ان دوستوں میں وہ ٹیچر بھی شامل تھے جو ہمیں نوادہ لے کر گئے تھے۔ خیر، یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، اس لیے میرے دبلے پتلے جسم نے سب برداشت کر لیا، البتہ میری روح زخمی ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب صرف موت ہی باقی ہے، کسی بھی وقت آ جائے۔ کسی طرح اسکول ختم ہوا۔ ان سب سے میں پھر کبھی نہیں ملا۔ لیکن ایک عجیب سا غصہ اندر چھپا ہے جو تم سب پر آتا ہے۔ کیوں ایسا کرتے ہو میرے ساتھ جیسے میں تم سب کی دوستی کے لائق ہی نہیں ہوں۔

پھر زندگی میں ڈانس آیا۔ میوزک کے ساتھ اپنے آپ کو محسوس کرنا کچھ الگ سا تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ زندگی کا ذائقہ چکھا۔ آزادی اپنے آپ سے۔ آزادی خود کو محسوس کرنے کی۔

میں جانتا ہوں کہ میں تم سب جیسا لڑکا نہیں ہوں۔ شاید میں لڑکا بھی نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ میں کیا ہوں لیکن مجھے لڑکے تو بالکل پسند نہیں، لڑکیاں پسند ہیں۔ مطلب میری ایک گرل فرینڈ ہے لیکن دقت یہ ہے کہ میں بھی خود کو ایک لڑکے سے زیادہ ایک لڑکی مانتا ہوں۔ پتہ نہیں یہ بات سب کو اتنا کیوں پریشان کرتی ہے؟ سب مجھ سے یوں برتاؤ کرتے ہیں جیسے میں نے پیدا ہو کر بہت بڑا گناہ کیا ہو لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا؟ بھگوان کی غلطی کی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے؟ مجھے میرا لڑکی ہونا برا نہیں لگتا، اچھا لگتا ہے۔ سچا لگتا ہوں۔ ایک جھوٹ کی طرح جینے سے بہتر ہے کہ سچ کو پکڑ کر مر جاؤں۔

اس دن رنگیلی ہمارے لیے ایک مثالی انسان تھا۔ اس کا نام رنگیلی بھی ہم لوگوں نے ہی اس رات کو رکھا تھا۔ پہلے تو اسے یہ نام پسند نہیں آیا، پھر اس نے جب ہم سب سے ہمارے خود کے لیے طے کیے ہوئے نام پوچھے تو وہ مسکرا دیا اور اس دن سے رنگیلی اور ہم سب دوست بن گئے۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ دل ہی دل میں مجھے رنگیلی کے لڑکی ہونے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ڈر جو مجھے ہیجڑوں سے بھی لگتا تھا۔ یہ بات میں رنگیلی کو بتا نہیں سکتا تھا اور جب رنگیلی مجھ سے ذرا بھی چپکتا تو میں اسے جھڑک دیتا۔ مجھے قطعی پسند نہیں تھا کہ کوئی مجھے چھوئے، بالکل نہیں۔

ایک دن جب پانی سر سے اوپر چلا گیا تو میں نے اسے اپنے ڈر کے بارے میں بتا دیا۔ رنگیلی کا جواب تھا، ''تم پھٹو ہو جو مجھ سے ڈرتے ہو۔ مجھے دوست کہتے ہو اور مجھ سے ڈرتے بھی ہو، کیوں؟ یا پھر میں بس کہنے کے لیے دوست ہوں؟''

اس کا سوال آج بھی میری یادوں میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔

رنگیلی صرف کہنے کے لیے میرا دوست نہیں تھا۔ اس نے مجھے میرا پہلا کام دلایا تھا؛ ایک چھوٹے بچے کو پڑھانے کا کام۔

رنگیلی بھی بچوں کو پڑھاتا تھا۔ وہ کچھ اور بھی کرتا تھا جس کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔ پورے شہر میں کوئی بھی پروگرام بغیر رنگیلی کے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بندے کی پہنچ مجسٹریٹ تک تھی۔ لیکن وہ حرامی مجسٹریٹ بھی میرے دوست کو بچا نہ پایا۔

رنگیلی کی موت پُراسرار طور پر ہوئی تھی۔ شہر کی انتظامیہ کو معلوم نہیں کیا جلدی تھی، انھوں نے گھنٹے بھر میں ہی رنگیلی کی لاش کو گنگا کنارے بھجوا دیا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بہار میں دارُو پر پابندی نہیں ہوئی تھی۔ یوں تو رنگیلی پیتا نہیں تھا لیکن ایسی افواہ تھی کہ اس دن اس نے اتنی شراب پی کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ شراب زہریلی تھی اور وہ بے ہوش نہیں بلکہ مر چکا تھا۔

لیکن سوال اٹھا کہ باقی بیوڑے کیوں نہیں مرے جنھوں نے رنگیلی کے ساتھ بیٹھ کر شراب پی تھی؟

میں بتاؤں کہ حقیقت کیا تھی جسے آپ اکثر سن نہیں پاتے۔

رنگیلی کو کمرے میں بند کیا گیا۔ اسے ننگا کیا گیا اور اسے ننگا کرنے والوں میں ایک وہ مادر چود مجسٹریٹ بھی تھا۔

عبادت کے لیے خلوت تلاش کی گئی اور بھوک کے لیے بھیڑ۔ ایک پورا شہر ریاضی کے سوال کو روحانیت کی زبان میں حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک تھکا ہوا چہرہ پانی میں ڈوبتا اور بھرم کی ایک اور پرت اوڑھ لیتا۔ یکے بعد دیگرے جانے کتنے چہرے ڈوبتے گئے، بھرم کی پرت دبیز ہوتی چلی گئی۔ اچانک ایک بھیڑ اپنے ضمیر کو ندی کے کنارے چھوڑ پہاڑوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ زندگی کا سرگم پیچھے چھوٹ جاتا ہے اور پہاڑوں کے غاروں میں صرف سائیں سائیں کی آواز باقی رہ جاتی ہے۔

- 10 -

آج آفس جاتے ہوئے اوپر دیکھا تو نیلا آسمان نظر آیا۔ میں اس شہر کے آسمانوں کے بارے میں کبھی بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس بادلوں جتنے لفظ نہیں تھے۔

'بادل روئی کے گالوں جیسے لگتے ہیں۔'

یہ جملہ مجھے اتنا فحش محسوس ہوا کہ میں نے گزشتہ ایک ماہ سے بادلوں کی طرف دیکھنا بند کر دیا لیکن ان دنوں آسمان میں بادلوں کی شکلیں بنتی رہتی ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ پورے ملک میں آسمان میں اس طرح نظر آتا ہے یا نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس شہر کا آسمان اور یہاں کے بادل مجھے بے حد پسند ہیں۔

لفظوں میں بتا پانا مشکل ہے کہ اس آسمان کو جو میں دیکھ سکتا ہوں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پورا آسمان آپ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس پر کسی نے بٹن کی طرح بادل ٹانک دیے ہوں جن کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔

میں نے اپنے گاؤں اور پہاڑوں میں بھی صاف آسمان دیکھا ہے لیکن وہاں وسعت ہے؛ دور تک پھیلا ہوا آسمان۔ یہ آسمان آپ کو اپنی آغوش میں لیے رہتا ہے۔ گزشتہ دنوں مجھ سے کوئی ملاقات کرنے آیا تھا تو اس کی بیوی اور ہم نے دیر تک بادلوں اور آسمان کے موضوع پر ہی باتیں کیں۔

اس گفتگو کے بارے میں سوچتے ہوئے یوں محسوس ہوا کہ میرا آسمان پہلے مردوں والا آسمان تھا اور اب یہ تھوڑا بدل کر عورتوں والے آسمان میں گھس گیا ہے۔ میں ان دو سالوں میں تھوڑا سا عورت ہو گیا ہوں اور ایسا ہونا مجھے اچھا لگتا ہے۔

آج دوسرا دن تھا جب اس نے میرا فون نہیں اٹھایا تھا۔ میں ہر بار بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ فون ہی نہیں اٹھاتا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی اور ٹیکسی نہیں چلائے گا، ایسا اس لیے کہ وہ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا اور میں ایک کارپوریٹ ملازم۔ ہماری ملاقات بھی ٹیکسی میں ہوئی تھی، روز اسی کی ٹیکسی میں آیا جایا کرتا تھا۔ اس نے کبھی نہ کچھ کہا نہ کیا۔ اس کی نظروں کی گرمی ہی کافی تھی، گرے پڑے لفظوں کو میں نے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔

اس کی ٹیکسی میں آتے جاتے ایک سال گزر چکا تھا۔ وہ ہمارے علاقے کا ایک دبنگ آدمی تھا۔ اس سے سب ڈرتے تھے، کچھ نہ ہوکر بھی وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان بہت کچھ تھا۔ بات کے بدلے گالی اور کسی کو جواب دینے سے پہلے وہ اپنا تھپڑ تیار رکھتا تھا۔ اور میں؟ میں ایک دبلا پتلا لیکن اسمارٹ کارپوریٹر۔ مجھے یاد ہے جب وہ پہلی بار مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ یاد ہے جب وہ مجھے دیکھ کر شرما جایا کرتا تھا۔ ایک دبنگ شخص کو یوں شرماتا دیکھ کر بہت اچھا لگتا تھا۔ یاد ہے جب اس نے میرا راستہ روکا تھا، یاد ہے جب میں روز لیٹ ہونے کے باوجود اسی کی گاڑی میں جایا کرتا تھا۔ جو کسی کی بات برداشت نہیں کرتا تھا، وہ میری بچکانی حرکتوں سے خوش ہو جایا کرتا تھا، اتنا جتنا کوئی اپنے بیٹے کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے جب میرا جنم دن سلیبریٹ کرنے ہم باہر گئے تھے، کتنی خوشامد کرنے کے بعد وہ مانا تھا۔ یاد ہے جب اس نے پہلی بار pizza دیکھا تھا۔ اس کے کھانے کے طریقے کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی تھی، اسی دن اس نے مجھے کہا تھا کہ شاید اسے دوسری گاڑی چلانی پڑے جو میرے وقت کے حساب سے میچ نہیں کرتی۔ میں نے اسے بہت منع کیا تھا۔ یاد ہے جب اس نے مجھے گھر چھوڑتے وقت سیلفی لینے کے بہانے مجھے زور سے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا لیکن تب بھی ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی، صرف اس کی زندگی سے بھرپور آنکھیں کلام کرتی رہیں کہ آج مت منع کرو اور میں ہنس کر الگ ہو گیا تھا۔ میرے لیے اس کا ساتھ کافی تھا اور آج پورے تین دن بعد میں نے اسے فون کیا اور یہ پہلی بار تھا جو اس نے میرا فون نہیں اٹھایا۔

میں نے اسے دوسری گاڑی میں دیکھ لیا تھا۔ مجھے لگا شاید مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے ایسا کیا ہو اور مجھے بتایا بھی نہیں کیوں کہ منع کرنے کے بعد بھی وہ ایسا کرے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی دوسری جاب میں، میں اسے نہیں مل پاؤں گا۔ بہت غصہ آیا، پھر بھی میں اس کے ٹائم پر گیا اس کی نئی گاڑی میں، جو مجھے سوٹ نہیں کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں

شرمندگی تھی۔ اس دن میں اس پر بہت بھڑکا تھا، جواب میں وہ بولا تھا کہ وہ میری باتوں سے ڈسٹرب ہوتا ہے۔ یہ ہمارے درمیان ہونے والا پہلا جھگڑا تھا۔ میں نے بھی اس سے 'بریک اَپ' کرنے کی ٹھان لی تھی۔ دوسرے دن میں اس سے ملا تک نہیں، سوچ لیا تھا کہ اپنے دماغ سے اسے باہر نکال دوں گا مگر پتہ نہیں کیوں اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ اب محسوس ہو رہی تھی۔

اس سے نجات پانے کے لیے 'گرائنڈر' پر اپنا پروفائل بنایا۔ دس منٹ میں کتنے آفر آ گئے۔ کچھ پیسے دینے کو تیار تھے تو کچھ زندگی بھر ساتھ، لیکن پتہ نہیں کیوں میں کسی کی طرف راغب نہیں ہو پا رہا تھا۔ آخر خود پر جبر کر کے ایک آفر قبول کر لیا۔ وہ مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل لے گیا۔ جب اس نے مجھے کپڑے اتارنے کو کہا تو پتہ نہیں وہ کہاں سے میرے دماغ میں آن ٹپکا جب کہ آج تک اس نے مجھے چھوا تک نہیں تھا۔ جب فائیو اسٹار والے نے کرنا شروع کیا، مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر دیکھ رہا ہے۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ جیسے جیسے یہ مجھے چھوتا، اس کی پرچھائیں میرے سامنے کھڑے ہو کر مسکرانے لگتی، اس کی مسکراہٹ بالکل ویسی تھی جیسے وہ پہلی بار مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ یوں لگنے لگا جیسے وہ مجھے اپنے پاس بلا رہا ہو۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے اوپر پڑے جسم کو ہٹایا، کپڑے پہنے اور باہر نکل گیا۔

دوسرے دن جان بوجھ کر اس کی گاڑی کے پاس گیا اور اس کی طرف دیکھ کر فون پر بات کرنے لگا۔ مقصد واضح تھا، اسے میں جلانا چاہتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اشاروں میں پوچھا کہ اب تک کہاں تھے؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بار بار مجھے پاس آنے کا اشارہ کرتا رہا لیکن میں نہیں گیا لیکن اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر وہ تھک کر میری طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس رات میں سو نہیں پایا۔ اگلے دن میں اس کے ٹائم پر جان بوجھ کر گیا لیکن اس کو نظر انداز کر دیا۔ وہ بھی پیچھے پلٹ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ آخر کار مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں چپ چاپ اس کے بغل میں بیٹھ گیا۔ اچانک وہ مجھ پر پھٹ پڑا۔ اسے اس بات پر غصہ تھا کہ اس کے بلانے پر بھی میں کیوں نہیں آیا؟ میں بھی اس پر چلا پڑا، ایسے ہی کافی دیر تک لڑنے کے بعد ساری بھڑاس ہم دونوں نے ایک دوسرے پر نکال دی۔ بعد میں جب میں اٹھ کر جانے لگا تو اس نے پھر وہی پہلی والی نظر سے مجھے دیکھا، میں نے نظر انداز کر دیا۔ بعد میں مجھے اپنی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا اور خود پر بہت غصہ بھی آیا کیوں کہ میں نے شاید کنکھیوں سے اس کی آنکھوں میں پانی اترتے دیکھ لیا تھا، ممکن ہے یہ میرا وہم ہو، کاش یہ وہم ہی ہو۔

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ پہلی نظر اور اس نظر میں کافی فرق تھا۔ پتہ نہیں کیوں لیکن اب میں پُرسکون تھا۔ کتنا کچھ ٹوٹ جاتا ہے ٹوٹنے کے عمل میں۔ آسمان کو تکتی نظر، زمین پر چلتے قدم، محبت کرنے کی ہمت، بہتر ہو جانے کا جوش اور واپسی کی امید۔ آپ ایمیل اور وہاٹس ایپ کرنا بند کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ شناسا آئی ڈیز سے آپ کو ہیلو کہنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ ہوا کی تیزی ٹھوکر کھاتی ہے اور پانی اپنی روانی بھول جاتا ہے۔ پھر وہی ٹھہراؤ، وہی یکسانیت، وہی اداسی، وہی سڑاند۔ صبح کی آمد دیر سے ہوتی ہے اور شام بہت جلدی۔ آنکھوں کی پتلیوں میں تاریکی بھر جاتی ہے جس کی انتہائی شکل اماوس کی رات ہے۔ دعاؤں کی سسکیاں فضاؤں میں گھلتی ہیں اور عقیدت کے نغمے مرثیے میں بدل جاتے ہیں۔

- 11 -

ایک خواب روز آتا ہے۔ تاریک راہداری ہے جس کے کنارے ایک لفٹ ہے۔ میں گردن نیچی کیے چلا جارہا ہوں۔ آواز آتی ہے، 'ایک نمبر دبانا، زیرو نہیں۔' کوئی چہرہ نہیں، بس آواز۔ عرصہ گزر چکا ہے، مگر کچھ ہے جو میرے ذہن سے اترنے کا نام نہیں لیتا۔ خوابوں نے میری زندگی کو اُتھل پتھل کر دیا ہے۔

میری زندگی ایک خواب کی سی تو ہے، اُتھل پتھل سے بھری ہوئی گہری نیند میں دیکھے ہوئے خواب کی طرح، جس میں آپ جاگنا چاہتے ہیں، چیخنا چاہتے ہیں مگر گھٹ کر رہ جاتے ہیں، ایک آواز تک حلق سے باہر نہیں آپاتی، ذرا بھی نہیں۔ یہ خواب ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ جب میں ہڑبڑا کر جاگا تو تین بج رہے تھے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی اور کندھے میں سرسراہٹ بھی۔

جب میں پہلی بار ممبئی آیا تھا تو پہلے ہی مونسون میں، میں نے اپنا کندھا فریکچر کرالیا تھا، اس کے بعد کسی اور مونسون نے مجھے اسے فراموش کرنے نہیں دیا۔ وہ میری چھوٹی سی زندگی کے سب سے طویل دردناک دن تھے۔ بارش، کندھا، پہلی نوکری، سیکس، بھیڑ، وڈا پاؤ، ممبئی۔ سب اس وقت مل کر میرے سامنے دھمال مچائے ہوئے تھے، سر پر آسمان اٹھائے ہوئے تھے۔ انھیں قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ لوگ کہتے تھے 'سب' ٹھیک ہو جائے گا مگر 'سب' کبھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ میرا کندھا تک کبھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔

کروٹیں کب تک بدلتا؟ میں باہر بالکنی میں آ گیا۔ صبح ہو رہی تھی؛ اجالے اور اندھیرے گلے مل رہے تھے۔ ایک مدت گزر گئی مجھے جلدی جاگے ہوئے۔ شاید یہ میری واپسی کا آغاز ہو۔ زرد عمارت پر سورج کی پہلی کرن گر رہی تھی۔ یہ زرد عمارت شاید ہمیشہ سے یہیں تھی جس

سے میں ہمیشہ پتہ نہیں کیوں نظریں چرالیتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔ میں گھبرا جاتا تھا۔ ہر بار کنکھیوں سے دیکھتا تھا، پوری پوری رات اس کے فلیٹ میں روشنی جگمگاتی رہتی تھی۔

کیوں وہ اب تک جاگا ہوا ہے، وہ کیا چیز ہے جو اسے جگائے ہوئے ہے۔ اسے تو اب تک بھول جانا چاہیے تھا، پھر کیوں جل رہا ہے وہ؟ اس نے بتایا تو تھا کہ اس کی پہلی شادی کی ہر رات اس نے آنکھوں آنکھوں میں ہی گزاری تھی۔ شاید عادتیں اتنی آسانی سے نہیں بدلتیں۔ دو سال پہلے اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس سے مل کر سچ مچ خوش ہوا تھا۔ ہر چیز الگ تھی۔ اس سے ملنے سے پہلے اتنی گہرائی سے کبھی کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس دور میں ان درجنوں ملنے والوں میں وہ اکلوتا تھا جس کا نام مجھے اب بھی یاد ہے، 'مدھیش'۔ بڑا عجیب سا نام ہے، کبھی سنا نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے، بھنورا یا شاید تتلی... یا شاید کچھ اور... یاد نہیں اس نے کیا کہا تھا۔

دہلی ہائی کورٹ کا فیصلہ آیا۔ ہواؤں میں کچھ ایسا تھا جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم مختار کل ہو گئے ہوں۔ اب کوئی شے ناممکن نہیں رہی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں مجرموں کے کٹہرے سے باہر نکل آیا ہوں۔ جن کو میں نہیں جانتا تھا، وہ بھی خوش نظر آ رہے تھے۔

اسے بھی وہیں میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پہلی نظر میں کچھ محسوس نہیں ہوا، صرف لگا کہ انکل بہت جوش میں ہیں۔ وہ نعرے لگا رہا تھا اور بہت زور زور لگا رہا تھا، لگاتے جا رہا تھا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ لوٹتے ہوئے لوکل ٹرین کی کھٹ پٹ میں میری نظر اس پر پڑی، وہ میرے ہی ڈبے میں تھا، میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں لیکن میں دیکھ پا رہا تھا کہ وہ اب بھی مسکرا رہا ہے۔

اسٹیشن آ گیا تھا۔ بھیڑ تھی، سب ایک دوسرے سے چپکے ہوئے چل رہے تھے۔ ہم دونوں کے ہاتھ بار بار وقفے وقفے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی انگلی سے میری چھوٹی انگلی کو پکڑ لیا یا پورا ہاتھ پکڑا تھا، یاد نہیں۔ بڑا عجیب دن تھا، پہلی بار کسی نے صرف ہاتھ ہی پکڑا تھا۔

''آج پھر جلدی جاگ گئے؟'' سمیر جاگ چکا تھا۔ اندر جانے سے قبل اس نے دیکھا، اس کے یہاں اب بھی لائٹ جل رہی تھی۔ ''وہ آج بھی جاگا ہوا ہے۔'' میرے منھ سے یوں ہی نکل گیا۔

''کون؟''

''وہ۔''

''اوہ وہ! مل کر آ جا۔ آج کندھا ٹھیک ہے؟''

''دل کرتا ہے کہ کہہ دوں معاف کیا تجھے۔ اوپر ہی سے سہی لیکن کہہ دوں۔''

''کس کس کو معاف کرو گے تم؟''

''اور کس کو؟''

''تیرے سفید بالوں والے انکل کو؟''

''مرے ہوئے لوگوں کو by default معافی مل جاتی ہے۔'' نہ جانے میں کیوں ہنسا۔

''کب جا رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں اکتانے لگا، شاید میں بات کو ٹالنا چاہتا تھا۔

''پرسوں۔''

''میں چھوڑنے آؤں؟''

خاموشی۔

''آخری رات تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''میں آؤں گا ناں کل، اگر وقت ملا تو۔''

''پکا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

خاموشی!

''رک جاؤ نا۔'' وہ یہ بات درجنوں بار بول چکا تھا۔

خاموشی!

وہ بولتا چلا رہا تھا، میں بچتا جا رہا تھا۔ بہت عجیب سی باتیں وہ کر رہا تھا، جیسے تم آخر جا رہے ہو، پلٹ کر بھی نہیں دیکھو گے، تمھاری خالی جگہ کوئی اور بھرے گا مگر ایک خالی پن پھر بھی برقرار رہے گا، ہمیشہ رہ جاتا ہے، ڈر لگتا ہے کبھی صرف خالی پن ہی بچا نہ رہ جائے۔ میں نے اس کی ہر بات کا جواب صرف خاموشی سے دیا۔ ایک بار پھر میں اس عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔

آخری دن واپسی کی تیاری میں بہت جلدی اور بغیر کچھ بتائے گزر گیا۔ بھاگ دوڑ میں

کئی بار اس زرد عمارت کے سامنے سے میں گزرا لیکن اندر نہ جا پایا۔ بہت مشکل ہوتا ہے آخری کچھ قدم چلنا۔

اس دن بھی اسٹیشن سے راستے بھر میں خاموش تھا، گھبرایا ہوا تھا اور وہ بس مسکرائے جا رہا تھا۔

اس کا گھر، گھر جیسا تھا۔ پھر باتیں ہوئیں، بہت سی باتیں، کچھ ضروری تھیں کچھ غیر ضروری۔ کچھ یاد ہیں، بہت سی بھول گیا۔ ان باتوں کا خلاصہ یہی تھا کہ اس کا نام 'مدھیش' ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے 'مچھر' یا 'مکھی' یا 'تتلی' یا ایسا ہی کچھ جو مجھے اب یاد نہیں۔ اور ہاں اس کی ابھی ابھی طلاق ہوئی ہے اور یہ کہ اس نے شادی کی ہر رات جاگ کر روتے ہوئے گزاری تھی۔ حالاں کہ 'روتے ہوئے' اس نے نہیں کہا تھا مگر کوئی رات بھر جاگ کر اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ بات چیت کا رخ بدلنے لگا اور جب تک مجھے علم ہوتا، میں کہیں مدفون اپنے بھدے چہرے کو اس کے سامنے بے پردہ کر رہا تھا۔

''بس ہائے ہیلو... اس کے بعد ننگے ہو جانا... مشکل ہوتا ہوگا۔'' اس کا منھ کھلا ہوا تھا۔

''نہیں۔'' میں اور کیا بولتا۔

'' awkward نہیں لگتا؟''

''نہیں۔ you know سب سے awkward پارٹ کیا ہے؟ کسی اجنبی کے سامنے کپڑے اتارنا نہیں، بلکہ کپڑے واپس پہننا، ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے ہوئے۔ ہر بار کچھ نہ کچھ بولا جاتا ہے جو آپ کو مزید حقیر بناتا ہے۔''

''مثلاً؟'' اس کا منھ اب بھی کھلا ہوا تھا۔

''کھیل ختم ہوتے ہی کسی کو اپنی گرل فرینڈ یاد آنے لگتی ہے... کہتے ہیں میرے ہونٹ ان کی 'ایکس گرل فرینڈ' جیسے ہیں۔'' میں بولتا جا رہا تھا، ''کسی کو اس وقت احساس ہوتا ہے کہ وہ تو رائٹر ہے اور یہ سب وہ تجربہ حاصل کرنے کے لیے کر رہا تھا، وہ میرے بارے میں بھی لکھے گا۔ مجھ پر پورا ایک باب نہ سہی مگر ایک پیراگراف تو لکھے گا ہی...

''اور سب سے حد کرتے ہیں تم جیسے شادی شدہ لوگ: گنجے، موٹے، سرخ گالوں والے... جو میرے کپڑے اتارنے کے لیے گڑگڑاتے ہیں اور واپس کپڑے پہنتے وقت وہ یہ بولنا نہیں بھولتے کہ یہ ان کی آخری بار تھی۔'' میں رکا۔

''میں شادی شدہ نہیں، طلاق شدہ ہوں۔'' کھلا ہوا منھ بند ہو چکا تھا۔
مجھے ترس آیا۔ ''اور تم موٹے گنجے اور سرخ گال والے بھی نہیں ہو۔ میں تمھارے بارے میں نہیں بول رہا تھا۔''
تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی، پھر میں نے بولنا شروع کیا: ''معلوم ہے، میں نے کبھی کسی کے ساتھ آنکھ کھول کر نہیں کیا۔''
''تم ڈرتے ہو۔''
''کس سے؟ ان سے؟''
اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا، ''نہیں، اپنے آپ سے۔ کیوں کہ وہ شادی شدہ گنجے موٹے لال گالوں والے مرد تمھارا کل ہیں۔ تم صرف نظریں چرا رہے ہو جب تک چرا سکتے ہو۔''
میں چلنے کو ہوا، وہ کچھ عجیب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خمار چڑھ آیا اور پھر میں آیا بھی تو اسی وجہ سے تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں... آج... ''مد ھیش! کسی اور دن۔ تھکان محسوس کر رہا ہوں۔''
''بس گلے ہی لگ رہے ہیں، کچھ اور نہیں کروں گا۔''
لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اس کی سانسیں تیز چل رہی تھیں۔ اس کی گرفت مجھ پر اتنی مضبوط تھی کہ میں اس کی دھک دھک دھک دھک سن سکتا تھا۔ وہ مسلسل میری ناک کو اپنی ناک سے رگڑ رہا تھا۔ پھر اپنے ہونٹوں سے میرے ہونٹ رگڑنے لگا۔ وہ بوسہ نہیں تھا۔ میں تھک چکا تھا۔ میں اسے پیچھے دھکیل دینا چاہتا تھا مگر وہ مجھے اپنے ساتھ جکڑے ہوئے تھا۔ میں نے زور لگایا، ٹک کی آواز کے ساتھ کچھ ٹوٹ گیا۔ وہ میرا کندھا تھا۔ میں درد سے تڑپ رہا تھا مگر وہ مطمئن تھا کہ میں چیخ نہیں رہا ہوں۔
وہ رکا نہیں، بالکل بھی نہیں، مجھے روندتا رہا۔ اس کے لیے یہ اب زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ ہر دھکے کے ساتھ درد بڑھتا جا رہا تھا، ہر منٹ ہر سیکنڈ صرف درد سے بھرا تھا، جیسے مجھے پگھلے ہوئے سیسے میں ڈبو دیا گیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد سارے محسوسات ختم ہو گئے، کوئی درد نہیں، کوئی تیز لہر نہیں، سب کچھ ختم ہونے کے بعد بھی لمحے گزرتے رہے لیکن درد ہمیشہ کے لیے ٹھہر چکا تھا۔
وہ اب رک چکا تھا، اس لیے نہیں کہ اسے مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ویسے ہی بیٹھا رہا جیسے اسے معلوم نہیں کہ آگے اسے کیا کرنا ہے۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو تھے یا پھر وہ میری

خوش فہمی تھی۔ اس نے میرے ٹیڑھے میڑھے کندھوں کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ میں چیخ پڑا۔ اب وہاں سب کچھ پُرسکون تھا۔

اس کے کچھ الفاظ جو وہ بار بار دہرا رہا تھا، میری کانوں میں اب بھی بازگشت کرتے ہیں، ''نہیں، ٹوٹا نہیں ہے، بس موچ آ گئی ہے۔ رات بھر میں ٹھیک ہوجائے گا۔'' میں اس اندھیری راہداری میں گردن جھکائے چلا جا رہا تھا۔ بہت کچھ ٹوٹ چکا تھا۔ میں روتے ہوئے جا رہا تھا، مڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ کواڑ کی اوٹ سے دیکھ رہا ہے۔ برسوں بعد آج میں اسی دروازے پر تھا۔ میرا دل زور زور دھڑکنے لگا۔ لیکن مجھے واپسی سے پہلے یہ کرنا ہی تھا۔ میں مدھیش کو نہیں، اپنے پورے 'کل' کو معاف کر رہا ہوں۔ گھنٹی بجائی... ایک بار پھر۔

''کون چاہیے؟'' ایک ادھیڑ عورت نے پوچھا۔

میں خاموش تھا۔

''دیکھیے نا، پتہ نہیں کون ہے؟''

گیٹ کے کونے سے میں نے مدھیش کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ گنجا ہوگیا تھا، موٹا ہوگیا تھا، گالوں پر لالی بھی آ گئی تھی۔ میں اس مرجھائی ہوئی عورت کی جھلک دیکھ کر لوٹ آیا۔ اس عورت کی آنکھوں کے نیچے سیاہی نمایاں تھی جیسے وہ گزشتہ کئی راتوں سے رت جگا کر رہی ہو۔ ممکن ہے کہ پوری پوری رات اس نے رو کر کاٹ دی ہو، آخر کوئی رات بھر جاگ کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔

''ایک ہی دبانا، زیرو نہیں... ایک گراؤنڈ فلور ہے، زیرو انڈر گراؤنڈ۔'' پیچھے ایک بچہ کھڑا تھا، اسی طرح جیسے اس دن مدھیش نے راہداری کے دوسرے کنارے سے بتایا تھا۔ میں اس دن بھی لفٹ میں رویا تھا اور آج بھی، نہ جانے کیوں؟ رات جلدی اُتر آئی تھی، یہ ممبئی کی آخری رات تھی۔

ایک بار پھر وہی خواب؛ وہی راہداری، وہی گھبراہٹ، وہی لفٹ، وہی آواز۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں، آواز واضح ہوتی جاتی ہے، چہرہ بھی۔ کوئی اور نہیں یہ میں تھا؛ کواڑ کے پیچھے چھپا ہوا، گنجا موٹا ہوگیا تھا میں، گالوں پر لالی بھی تھی اور کہہ رہا تھا، 'زیرو نہیں...' نیند کھل گئی، تین بج رہے تھے، بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ میں پسینے میں شرابور تھا، کچھ ڈھونڈنے لگا، شاید اپنا موبائل، بات جو کرنی تھی؛ ''ہیلو پاپا! میں واپس نہیں آ سکتا۔''

- 12 -

''بیٹا، اب بھی سوچ لے۔ اگر دل نہیں کر رہا ہے تو گھر چل، وہیں کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ تو نے ٹاپ کیا ہے، کوئی بھی لے لے گا۔ یہاں پتہ نہیں، تمھارا روم پارٹنر کیسا ہوگا، کس مذہب کا، کس فرقے کا، نہاتا بھی ہوگا یا نہیں، سگریٹ پھونکتا نہ ہو، عیاش تو نہیں ہوگا نا، کہیں ہمارے بھولے بھالے بیٹے کو نہ بگاڑ دے...''

''ارے بس کرو، تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ہمارا بیٹا گدھا ہے، کچھ سمجھتا نہیں۔ جاؤ گاڑی میں بیٹھو۔ باپ بیٹے تھوڑا امردوں والی بات کریں گے۔''

''ہاں، جا رہی ہوں، خیال رکھنا بیٹا۔ چلو اب باپ بھی اپنے بیٹے کو نصیحت کر دے تھوڑا سا۔''

''بیٹا، یہ جو روم پارٹنر ہوتے ہیں، وہ ایک couple کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک ایرینج میرج والے جوڑے کی طرح، جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے مگر ایک دوسرے کے نام کے علاوہ دونوں کو کچھ نہیں پتہ ہوتا ہے۔ دونوں کا مزاج ابھی گونگھٹ اور سہرے سے ڈھکا ہوا ہے، جب یہ ہٹے گا تو یا تو تم دوست بنو گے یا پھر صرف روم پارٹنر۔ کچھ بھی ہو، رہنا تو بہر حال دونوں کو ساتھ ہے۔ اختلافات میں بھی مماثلت تلاش کرنا اور ایک دوسرے کے لیے ڈھلنا اس سفر کو آسان بنا دے گا مگر ایک دوسرے کے مطابق نہیں ڈھلنا ورنہ ہمارا بیٹا کہیں کھو جائے گا۔ چلو میں نکلتا ہوں ورنہ تمھاری ماں کہیں پھر سے نہ آ دھمکے۔''

پاپا تو چلے گئے لیکن اپنے مشوروں کا بھاری پن کمرے میں چھوڑ گئے، جیسے ششی تھرور کی انگریزی ہو جو بغیر ڈکشنری کے سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کا نام ارجن تھا، قد کاٹھی میری طرح، سانولا رنگ۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا، اس لیے نہیں کہ وہ خوب صورت تھا بلکہ اس لیے کہ وہ 'وہ' تھا۔

یا اللہ! یہ کون سی آفت میرے کمرے میں آ گئی۔ میرے کمرے میں میرا پارٹنر 'وہ' نکلا۔ اگر گھر میں پتہ چلا تو مجھے واپس بلا لیں گے۔ اپنا کمرہ بدلنے کے لیے مجھے عرضی ڈالنی ہوگی، جلدی، ابھی اسی وقت۔

''ہائے!'' ارجن نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے اپنے پاؤں پیچھے، ایسا جان بوجھ کر میں نے نہیں کیا تھا، بس بے اختیار ہو گیا تھا، ہمت نہیں ہوئی کہ کسی 'ویسے' سے ہاتھ ملاؤں۔ کہاں پھنس گیا میں؟ کون سا گناہ سرزد ہوا تھا مجھ سے؟ لگتا ہے پاپا کی زبان کالی تھی۔ ہم میں سچ مچ couple والے احساسات بیدار ہو رہے تھے۔ بات کو پھیلتے دیر بھی کہاں لگتی ہے۔ سب نے باتیں بنانی شروع کر دیں۔ ادھر عرضی بھی خارج ہو گئی، وجہ دی گئی: ''آپ ایک سیکولر دیش کے نوجوان ہیں، آپ سے یہ سب متوقع نہیں تھا۔''

مجھے بھی اس یونیورسٹی سے یہ توقع نہ تھی۔ ایک طرف چار سال کی انجینئرنگ میرا دماغ کھائے گی اور دوسری طرف اس کا خوف۔

دوستی تو چھوڑو، میں تو 'اس کے' جیسے لوگوں سے دشمنی بھی نہیں کر سکتا۔ شکر ہے ہمارے شعبے الگ تھے ورنہ زندگی جہنم بن جاتی۔ خیر، کسی طرح دن گھسٹتے چلے گئے۔ اس سے باتیں صرف اتنی ہی ہوتی تھیں جتنی ضرورت ہوں ورنہ بقیہ دن لائبریری یا دوسرے دوستوں کے کمرے میں گزرتے تھے جہاں وہ گندے اور بیہودہ سوال کرتے رہتے تھے۔ میں بھی اپنی جھنجھلاہٹ نکالنے کے لیے ان کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔ دو ماہ اسی ورزش میں گزر گئے اور پھر اچانک وہ رات منھ پھاڑے آ گئی۔

میں اور وہ اپنے اپنے بستر پر روز کی طرح لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح میں چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا کہ اچانک میرے پیٹ میں درد کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ کچھ دیر میں پیٹ پکڑے اسے برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا، پھر میری چیخ نکل گئی اور اگلے ہی لمحے میں اسپتال میں تھا۔ درمیان میں کیا ہوا تھا، کچھ یاد نہیں، کچھ بھی نہیں۔

اسپتال میں میری عیادت کے لیے میرے ہاسٹل کے دو تین دوست آئے تھے مگر ان میں 'وہ' نہیں تھا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ پھر دوستوں نے ہی بتایا کہ ارجن نے ہی ایمبولینس بلائی

تھی اور میرے گھر والوں کو خبر کی، پھر میرے دوستوں کی مدد سے وہ مجھے یہاں لے کر آیا۔
خیر اتنا تو ہر کوئی کرتا ہے، مطلب کوئی بھی کرتا، میں بھی۔

بعد میں کچھ ایسا پتہ چلا جس سے یہ سمجھ میں آیا کہ ہر کوئی سب کچھ نہیں کرتا، صرف کچھ ہی کرتا ہے۔ ڈاکٹروں سے پتہ چلا کہ میرے علاج سے پہلے جو پیشگی رقم اسپتال میں جمع کرانی ہوتی ہے، وہ ارجن نے دیے تھے۔ مجھے بدہضمی ہوئی تھی اور فرسٹ ایڈ بھی اس نے ہی دیا تھا۔ جو فارم اس نے بھرا تھا، اس میں مجھ سے رشتہ لکھا تھا مگر وہ رشتہ جو اس نے پہلے ہی دن سے تسلیم کرلیا تھا، میں نے تو کبھی اس بارے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ مجھے کوفت سے بچانے کے لیے میرے ہوش میں آنے سے پہلے چلا گیا تھا جب کہ میں ہر روز اسے کوفت میں ڈالنے کے لیے کمرے سے باہر چلا جاتا تھا۔

ارجن 'وہ' ہے، میں نے ہر روز اسے اس بات کا احساس دلایا مگر اس نے اختلافات میں بھی مماثلت تلاش کرلیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا یہ 'اختلاف' بیماری ہے یا صرف سوچ؟

میں ان کی باتوں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا کیوں آج میرا ہنسنے کا موڈ نہیں تھا۔

''چلو تم ایسے ہی کسی سے اتنی بڑی بات نہیں پوچھ سکتے۔'' نواب بول رہا تھا۔ آفس کی کینٹین خالی تھے۔ ہم چار لوگ تھے۔ نواب اور پریم لڑ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟'' گوتم کو تھوڑی دیر ہوگئی تھی۔

''نواب اور پریم کا نیا روم پارٹنر 'گے' ہے۔'' رمیش نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہا۔

''نہیں، وہ نہیں ہے۔'' نواب بولا۔

''ایک منٹ۔ وہ ہے یا نہیں ہے، تجھے کیسے پتہ؟'' پریم نے اس سے پوچھا۔

''تو کیا اس نے اقرار کیا؟''

''نہیں، اس نے صرف اپنے کندھے اُچکائے۔'' پریم اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکا۔

''نواب تُو تو لُٹ گیا رے۔'' رمیش نے قہقہے میں پریم کا ساتھ دیا۔

''نہیں۔ ایسی بات کوئی کسی سے نہیں پوچھ سکتا۔''

''تجھے تکلیف اس کے 'گے' ہونے سے نہیں ہے بلکہ اس سے پوچھنے سے ہے۔ نواب

گے رائٹ ایکٹیوسٹ۔''

شاید اب نواب کو خفت محسوس ہو رہی تھی، وہ دفاعی پوزیشن میں آ گیا تھا۔

''یار وہ 'گے' ہو سکتا ہے، ہمارا 'گے' اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا۔''

''ہمارا 'گے'؟''

''مگر کوئی نہیں پوچھ سکتا۔'' نواب نے تقریباً ہکلاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو پوچھا اور میں نے یہ بھی کہا کہ اس بغل والے بیڈ پر ایک چکنا لونڈا سوتا ہے۔''

گوتم کو کوئی ضروری کام یاد آ جاتا ہے، وہ وہاں سے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر وہیں ٹھہر جاتا ہے۔

''وہ زیادہ کرے گا تو میں دے دوں گا۔''

''اس کی تو چاندی ہو جائے گی۔''

''بانس دے دوں گا۔''

''اپنے کمرے میں کوئی بانس نہیں ہے۔''

''تو ریموٹ دے دوں گا، چمچ دے دوں گا، جھاڑو دے دوں گا۔'' نواب کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔

رمیش ہنسنے لگا۔

''سالے تُو تو چپ ہی رہ۔ تیری جوائننگ سے پہلے یہ تیری بھی مردانگی پر سوال اٹھاتے تھے۔''

''یار وہ 'ہائی' کیسے کرتا تھا... ہائی ئی ئی ئی...''

''کمینو، میں پولائٹ بن رہا تھا۔'' کچھ تو تھا جو رمیش کی آنتوں میں اٹک گیا تھا۔

وہ اب بھی ہنس رہے تھے مگر دوسری باتیں نکل آئی تھیں، مثلاً پریم کیلی فورنیا کب جا رہا ہے، گوتم کی منگنی کب ہے، نواب کی سرکاری نوکری کی کوششیں اور رمیش کے بارے میں کچھ... نواب کہہ رہا تھا کہ گرمی بڑھ گئی ہے، پریم صرف سر ہلا رہا تھا، رمیش بے چینی میں انگلیاں مروڑ رہا تھا، گوتم کو ضروری یا غیر ضروری کام سے جانا تھا لیکن اس کے قدم جیسے زمین میں چپک گئے ہوں۔

ان میں سے صرف میں تھا جس کے ہونٹ مسلسل مسکراتے ہوئے درد دینے لگے

تھے۔

ان کا نیا روم پارٹنر 'گے' نہیں تھا اور نہ ہی پریم نے اس سے کبھی کچھ پوچھا تھا۔ پریم کبھی کیلی فورنیا نہ جا پایا مگر اس نے اگلے ماہ یہ نوکری چھوڑ دی۔ اسی سال گوتم کی شادی ہو گئی۔ رمیش طویل مدت تک اسی کمپنی میں کام کرتا رہا اور نواب کے چچا نے اسے سرکاری آفس میں نوکری دلا دی۔

برسوں بعد وہ چاروں کبھی ملے یا نہ بھی ملے ہوں، انھوں نے ایک دوسرے کی خیر خبر لی ہو یا نہ بھی لی ہو، لیکن انھیں علم تھا کہ ان کی زندگیاں کہاں پہنچ کر ٹھہر سی گئی ہوں گی... شادیاں اور بچے۔ سب خوش ہوں گے، سوائے اس کے جو اس دن ہنسنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہونٹ مسکراتے ہوئے درد دینے لگے تھے۔

- 13 -

اسکول کی بس سڑک کے کنارے رکی تو ہم تینوں اپنے اپنے بستے سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ بس ڈرائیور نے بٹن دبایا اور ایک تین فٹ کی لمبی سی پٹی باہر نکل آئی جیسے کسی ٹریفک پولیس والے کا بازو ہو۔ اس کے سرے پر سرخ سا ہاتھ، جس پر سفید حروف سے لکھا تھا، 'اسٹاپ!' دونوں طرف کی کاریں جہاں کی تہاں رک گئیں، بچے اتر رہے ہیں۔ رُکنا قانون ہے۔ ڈرائیور نے بس کا دروازہ کھول دیا۔ ورون اور انیس مجھ سے پہلے اتر گئے تھے، میں ان کے پیچھے چپ چاپ چلتا رہا۔ وہ ایسے جا رہے تھے جیسے وہ میری موجودگی سے بے خبر ہوں۔

''ہوم ورک کرنے کے بعد میرے گھر آ جانا، کرکٹ کھیلیں گے۔'' ورون نے بائیں طرف اپنے گھر کی جانب مڑتے ہوئے زور سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تیرے ڈیڈی تو بال پھینک کر ہماری پریکٹس کرا ہی دیں گے۔ کچھ بیچاروں کے گھر میں تو ڈیڈی ہی نہیں ہوتا، بیچارے... چچ چچ...'' انیس میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

دل میں آیا کہ ایک زور کا گھونسا مار کر اس کے سارے دانت توڑ دوں۔ وہ ایسے گھٹیا طعنوں کی گیند میری طرف اکثر پھینکتا رہتا تھا۔ ہم پڑوس میں رہتے ہیں لیکن وہ مجھے کھیلنے کے لیے نہیں بلاتے اور نہ وہ کبھی میرے گھر آتے ہیں۔ حالاں کہ یہ شہر کے سب سے امیر علاقے میں ایک بڑا انجی سا پڑوس ہے۔ پانچ گھر دائیں اور پانچ گھر بائیں اور دونوں قطاروں کے درمیان گیارہواں گھر ہمارا، جہاں آ کر سڑک ختم ہو جاتی ہے۔ میرا گھر نہ دائیں قطار میں آتا ہے اور نہ بائیں قطار میں، وہ قطاروں سے کٹا ہوا ہے۔

انیس کا گھر دائیں قطار میں ہے۔ مڑنے سے پہلے اس کا ہاتھ مجھے 'بائے' کرنے کے

لیے اٹھا مگر سامنے گیٹ پر اس کی می کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انیس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا لیا اور جلدی سے اندر بھاگ گیا۔

میں بھی انھیں نظر انداز کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ رخسانہ می ہمیشہ میرے آنے کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیتی ہیں مگر ان کے کان دروازے کی طرف ہی ہوتے ہیں تاکہ میرے آنے کی آہٹ سن سکیں۔ مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔

می نے قریب آ کر میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، ''میرے بیٹے کا دن آج کیسا رہا؟''

''ٹھیک تھا۔'' کہتا ہوا میں اوپر بھاگ گیا۔ زمین پر بستہ پھینک کر خود کو بھی پلنگ پر پھینک دیا۔ رونا آ رہا تھا۔ ریکھا ماں اور رخسانہ می کو کیا پتہ کہ ان کی وجہ سے میرے ساتھی مجھ کو کیسے کیسے طعنے مارتے ہیں۔ آج مجھے اپنی دونوں ماؤں پر بہت غصہ آ رہا ہے۔ وہ تو بہت بہادر ہیں، کہتی ہیں کہ ہم اپنی شرطوں پر جی رہی ہیں مگر میرے بارے میں کچھ نہیں سوچتیں کہ لڑکے مجھے کتنا تنگ کرتے ہیں۔ آج پلے گراؤنڈ میں ڈیوڈ اور انیس نے مجھے جان بوجھ کر دھکا مارا۔ میری کہنی چھل گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے تو وہ لوگ منھ پھاڑ کر ہنسنے لگے، ''عورتوں کے ساتھ رہے گا تو روئے گا ہی نا!''

میں خاموشی سے اٹھ کر چلنے لگا تو پیچھے سے ببلو نے بھی چلتے ہوئے مجھے ٹانگ مار دی۔ میں غصے میں پلٹا تو وہ بھی ایسے ہی ہنسنے لگا تھا۔ ''ارے! تجھے سنبھلنا کون سی می سکھائے گی؟ بول... بول نا۔''

''میرے ڈیڈ سکھا دیں گے، اس میں کون سی بڑی بات ہے۔'' میکس نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور مجھے کھینچ کر دور لے گیا۔

میں تو چپ رہتا ہوں۔ رخسار می کہتی ہیں: ''دھیان ہی مت دو۔ ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو۔''

اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟ ریکھا ماں تو نرسری کا گیت ہی گنگنانا شروع کر دیتی ہیں۔

میں بھی تو دل ہی دل میں خود کو یہی سناتا رہتا ہوں: "Stick and stones, may break my bones, but words will never hurt me." مگر باتیں ہی تو سب سے زیادہ تکلیف دیتی ہیں۔ کوئی ایسا دوست بھی تو نہیں ہے جس سے میں اپنے

دل کی بات کر سکوں۔ میکس میرا دوست ہے۔ وہ اچھا بھی ہے مگر اس سے یہ خاص بات کہتے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ دوستی ہی نہ توڑ دے۔

میں بے دلی سے اپنی کتابیں اور کامک بکس پلٹنے لگا۔ میرے ہاتھ میں اپنی بنائی ہوئی تصویر آ گئی 'میری فیملی'۔ میں اس وقت کنڈر گارڈن میں تھا، یہ تصویر اسی وقت کی ہے۔ اس تصویر کی وجہ سے میرا کلاس میں کافی مذاق اڑا تھا۔ ٹیچر نے کہا تھا کہ سبھی بچے اپنی فیملی کی تصویر بنائیں، میں نے اپنی فیملی کی یہ تصویر بنائی تھی جس میں دو مائیں میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں اور میں کرکٹ کا بیٹ لیے درمیان میں کھڑا مسکرا رہا ہوں، زارا پاس ہی گھاس پر لیٹی ہوئی ہے۔

ٹونی نے دیوار پر لگانے کے لیے سب کی تصویریں اکٹھی کیں۔ انیس میری تصویر دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی ہنسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

"فیملی میں دو ممیاں تھوڑی ہوتی ہیں بدھو۔"

"مگر میری تو ہیں۔" میں پریشان سا ہو گیا۔

انیس نے ٹونی سے میری تصویر کھینچ کر میرے آگے پھینک دیا۔

"نہیں، بالکل نہیں ہوتیں۔" ٹونی نے انیس کا ساتھ دیا۔

میں نے اپنی تصویر اپنے بستے میں رکھ لی۔

چھٹی کی گھنٹی بج چکی تھی۔

اس دن میں بہت خاموش تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس سے بات کروں؟ یوں تو میری دونوں ہی مائیں مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں کتنا قسمت والا ہوں جو مجھے دو دو ماؤں کا پیار ملا ہے۔ ورون کے ممی ڈیڈی تو ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہمارے گھر تک بھی ان کے چیخنے چلانے کی آواز آ جاتی ہے۔ ایک بار سب کے سامنے ہی انھوں نے ورون کو تھپڑ جڑ دیا تھا۔ میکس نے بتایا کہ وہ تو ورون کی ممی کی بھی پٹائی کر دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں تو کوئی اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتا۔ دونوں ہی ممیاں میرے ہوم ورک میں مدد کرتی ہیں اور جب وقت ملے تو میرے ساتھ کھیلتی بھی ہیں، باتیں بھی کرتی ہیں۔

سب سے پہلے مجھے رخسار ممی نے بتایا تھا کہ 'گے' کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ جب ایک ہی جنس کے دو لوگ آپس میں پیار کرتے ہیں تو وہ لوگ 'گے' کہلاتے ہیں۔ وہ دو ممیاں بھی ہو سکتی ہیں اور دو ڈیڈی بھی۔

بس اتنی سی بات ہے! اس کے بعد مجھے کچھ اور جاننے میں دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے بھلا کیا فرق پڑتا ہے، جب تک ہماری فیملی میں سب پیار سے رہتے ہیں۔ ورون کے ممی ڈیڈی کی طرح ہر وقت لڑتے جھگڑتے تو نہیں رہتے۔

دوسرے دن ٹیچر نے جب میری تصویر کے بارے میں پوچھا تو میں نے دھیرے سے ان کے قریب جا کر بتا دیا کہ انیس اور ٹونی کہتے ہیں کہ دو ممیاں نہیں ہو سکتیں مگر میری دو ممیاں ہیں، اس لیے میں تصویر نہیں دے سکتا۔

ٹیچر چپ ہوگئی۔ اس نے سب کی تصویریں ہاتھ میں پکڑ لیں اور ہم سب کو اپنے قریب آنے کو کہا۔ ایک ایک کر کے وہ سب تصویریں دکھانے لگی۔ سب ایک دوسرے سے الگ تھیں۔ کسی میں ایک ماں اور دو بچے، کسی میں ایک بچہ اور دو ممی ڈیڈی، کسی میں صرف ڈیڈی اور دو بچے۔ ٹیچر سب کو تصویریں دکھاتی گئی۔

''دیکھا تم نے؟ ہر فیملی اپنے آپ میں خاص ہوتی ہے۔ فیملی پیار سے بنتی ہے، اس لیے دو ممیوں والی فیملی بھی ہو سکتی ہے اور دو ڈیڈیوں والی بھی۔''

میں نے اپنی تصویر ٹیچر کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد سے اسکول میں مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔

مگر آج اسکول والے واقعے سے مجھے لگا کہ ہمارے گھر میں شاید کچھ عجیب سا ہے۔ شام کو جب میں ممی اور ماں کے درمیان بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا، شاید کوئی فیملی پروگرام ہی تھا، تو وہی ایک بات مجھے پریشان کیے جا رہی تھی کہ میری فیملی کچھ الگ ہے۔

''ماں! کیا ہم لوگ عجیب ہیں؟ دوسروں جیسے نہیں ہیں؟''

دونوں مائیں چپ ہو گئیں۔ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دونوں ماؤں کے درمیان کچھ ہے، کچھ جادو جیسا۔ وہ صرف ایک دوسرے کی طرف دیکھتی ہیں اور آپس کی بات سمجھ جاتی ہیں۔ کچھ تو ہے ان دونوں کے رشتے کے درمیان کہ اس کا ارتعاش مجھے اور زارا کو بھی چھوتا رہتا ہے۔

رخسانہ ممی نے کھینچ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ میرا سر سہلانے لگیں۔

''نہیں میرے بچے، ہم لوگ بالکل عجیب نہیں۔ جب سے یہ دنیا بنی ہے، ہر وقت، ہر سوسائٹی اور ہر مذہب میں اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی پسند الگ ہوتی ہے۔ وہ جان بوجھ

کر ایسا نہیں کرتے۔ بس وہ ہوتے ہی ایسے ہیں۔ البتہ بیشتر لوگ اس بات کو برداشت نہیں کر پاتے کہ کوئی ان سے الگ طرح کی سوچ یا پسند والا انسان بھی ان کے آس پاس موجود ہو۔ اس لیے کئی ملکوں میں انھیں جیل میں ڈال دیا جاتا ہے، انھیں سزائیں دی جاتی ہیں۔''

''ریت میں سر چھپا کر طوفان کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتے، اس لیے زیادہ تر لوگ اپنے تعلقات کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ ہم چونکہ کھلے سماج میں رہتے ہیں تو کوشش کر رہے ہیں کہ جو ہم ہیں، اسی طرح سے رہیں۔ ہم الگ ہیں مگر غلط نہیں۔''

دونوں ماؤں نے مجھے اچھا خاصہ بھاشن دے دیا لیکن میں تو کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔

''ماں! کیا سچ مچ میرے کوئی ڈیڈی نہیں ہیں؟'' میں جو پوچھنا چاہتا تھا، وہ بے ساختہ میرے منھ سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ رخسار ممی سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔ میں جواب کے انتظار میں ریکھا ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماں مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، اس کی تو گارنٹی دے سکتا ہوں۔ لیکن ماں کی جگہ رخسار ممی نے دھیرے سے اپنا ہاتھ میری پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھ مجھے دیکھا، پھر نہایت ہی نرم لہجے میں یوں بولیں جیسے میں ان کا ہم عمر ہوں۔

''مجھے شروع ہی سے اپنے بارے میں معلوم تھا کہ میں کیسی ہوں۔ ہم جیسے ہوتے ہیں نا، ویسے ہی ہمیشہ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے۔ مجھے مردوں میں کبھی کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔''

میں نے سوچا، یہ لو... یہ کون سی بڑی بات ہے۔

''میں اور رخسار آپس میں ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسے باقی جوڑے کرتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کا بہت سہارا ہے۔ ہم نے بقیہ زندگی ایک ساتھ گزارنے کا وعدہ کیا ہے۔'' ماں نے زبان کھولی۔

ہونھ، یہ بھی میری بات کا جواب نہ ہوا۔

رخسار ممی نے شاید میرے چہرے پر الجھن پڑھ لی۔ میری ٹھوڑی ہاتھ میں لے کر وہ پیار سے بولیں، ''ہم دونوں کو لگا کہ ہمیں ایک پیارا سا بچہ چاہیے جس پر ہم دونوں اپنا پورا پیار انڈیل سکیں۔''

تو وہ پیارا سا بچہ میں ہوں جس پر یہ دونوں مائیں اپنا پیار انڈیلنا چاہتی ہیں۔ مجھے خود

پرفخر ہوا اور میں مسکرا اٹھا۔

''رخسار تمھیں جنم دے گی۔ ہم نے کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا۔ پھر وہ ایک خاص ڈاکٹر کے پاس گئی جو بغیر کسی مرد کے رابطے میں آئے بچے پیدا کرنے میں مدد کرتا تھا۔'' ریکھا ماں بتا رہی تھی۔

''وہ کہنے لگا کہ وہ صرف مرد عورت کے ان جوڑوں ہی کی مدد کرتا ہے جنھیں بچے پیدا کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ پھر وہ ڈاکٹر اپنے نظریے کی روشنی میں مجھے بتانے لگا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ میں ایسا ناجائز بچہ پیدا کرنے میں تمھاری مدد نہیں کرسکتا۔'' وہ واقعہ یاد کر کے رخسار ممی کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

''پھر؟'' مجھے کہانی دلچسپ لگ رہی تھی۔

''پھر میری ایک سینئر ڈاکٹر نے مدد کی۔ اس نے مجھے ایک چارٹ دکھایا جس میں ناموں کی جگہ صرف نمبر لکھے تھے، فوٹو بھی نہیں۔'' ممی ہنس پڑیں۔

''انھیں میں سے میں نے ایک نمبر ۲۴۳ کا انتخاب کیا۔ اس کا قد چھ فٹ تین انچ تھا۔ سڈول جسم اور ہاں وہ حیاتیات پر ریسرچ کر رہا تھا۔ صرف اتنی ہی جانکاری موجود تھی۔ میری اس سینئر ڈاکٹر نے صرف اس کے دان کیے ہوئے اسپرم کو میرے اندر ڈال دیا اور تم میری کوکھ میں آ گئے۔''

اوہ، تو میں رخسار ممی کے پیٹ سے نکلا ہوں۔

''میں نے تجھے جنم دیا ہے تو میں تیری پیدا کرنے والی ماں اور ریکھا نے قانوناً عرضی دے کر تیری پرورش کا حق لے لیا ہے تو وہ ہوئی تیری پالنے والی ماں۔''

ماں اور ممی مجھ سے ایسے ہی مل کر باتیں کرتی ہیں تو میں خود کو خاص سمجھنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میری مائیں بھی خاص ہیں مگر اس بڑے اسکول میں جب لڑکے گھما پھرا کر میری ماؤں کے بارے میں گندی باتیں کرتے ہیں تو میں سلگ جاتا ہوں۔ اس وقت مجھے اپنی دونوں ماؤں پر بہت غصہ آتا ہے۔ انھیں کیا پتہ کہ لوگ ان کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ انیس اور ٹونی تو میرے منھ پر ہی کہہ دیتے ہیں کہ ان کے ممی ڈیڈی نے تاکید کی ہے کہ 'بیمار' لوگوں کے گھر نہیں جانا۔

بیمار؟ میرا پارا چڑھنے لگتا۔ میری رخسار ممی اس شہر کی کتنی مشہور ڈاکٹر ہیں اور ریکھا ماں

کے آرٹیکل تو بڑی بڑی میگزینوں میں چھپتے ہیں۔ میں اپنی کلاس میں سب سے اچھے نمبر لاتا ہوں اور میری بہن زارا تو دنیا کی سب سے پیاری بچی ہے۔ ہم لوگ 'بیمار' بھلا کیسے ہوئے؟ مائیں ہم کو اتنا پیار کرتی ہیں کہ بس ہمیں کچھ اور نہیں چاہیے۔ وہ روز ڈنر کے وقت بیٹھ کر سمجھاتی ہیں کہ کیا بات غلط ہے اور کیا ٹھیک۔ ممی کہتی ہے کہ کبھی کسی کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے جس سے اس کا دل دُکھے۔ یہ لوگ تو روز میرا دل دُکھاتے ہیں، پھر یہ لوگ مجھ سے اچھے کیسے ہوئے؟ اسی لیے میں اپنے گھر کی بات کسی سے شیئر نہیں کرتا، میکس سے بھی نہیں۔

زارا شاید آ گئی تھی۔ رخسانہ ممی اسپتال سے لوٹتے وقت اسے لے کر آئی ہے۔ زارا ہر وقت ہنستی کھلکھلاتی رہتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں دیکھ کر میں بھی ہنس پڑتا ہوں۔ جب کوئی بھی ممی اسے اس کی چھوٹی سی سائیکل میں بٹھا کر سیر کرانے نکلتی ہیں تو لوگ عجیب سی نگاہوں سے اسے پلٹ کر دیکھتے ہیں، شاید اس لیے کہ زارا کالی ہے اور ہم تینوں گورے۔ ممیاں کہتی ہیں کہ وہ دونوں 'کلر بلائنڈ' ہیں، انھیں تو رنگوں میں فرق نظر نہیں آتا۔

جب سے زارا ہمارے گھر آئی ہے، ہمیں لگتا ہے جیسے ہماری فیملی مکمل ہو گئی ہے۔ زارا کی اصلی ممی تو فلوریڈا کی جیل میں ہے اور اس کے ڈیڈی کے بارے میں اس کی ممی کو بھی نہیں پتہ۔ مگر اب تو زارا ہماری بہن ہے، ہماری فیملی ممبر۔

رخسار ممی کہتی ہیں، شکر ہے کہ ہمارے ملک میں ہمیں بچے لینے کا حق حاصل ہے، دوسرے کئی ملکوں میں تو ابھی بھی دو ممیاں یا دو ڈیڈی بچے گود نہیں لے سکتے۔ اچھا ہوا، ورنہ بیچاری زارا کہاں رہتی؟ میں کس کے ساتھ کھیلتا؟

ایک بار مجھے رات میں ڈر لگا تو میں ممیوں کے کمرے میں سونے کے لیے جا رہا تھا مگر ان کا دروازہ بند تھا۔ ممی نے سکھایا ہے کہ کبھی کسی کے بیڈروم میں نہیں جاتے۔ اگر دروازہ کھلا بھی ہو تو ہمیشہ کھٹکھٹا کر، اجازت لے کر ہی جانا چاہیے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ممی کی جھنجھلاہٹ بھری آواز آئی، ''کیا چاہیے؟''

''میرے کمرے میں بھوت ہے، میں وہاں اکیلا نہیں سو سکتا۔'' میں تقریباً رو دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رخسار ممی نے دروازہ کھولا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے گال تھپتھپائے، پھر پیار سے پچکارتے ہوئے کہا، ''میرا بیٹا تو بڑا بہادر ہے، ایک دم سپر مین۔''

''ممم''میں کنمنایا۔

ممی نے ہنس کر کہا،''اچھا جاؤ، زارا کے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔''

میں خوش ہو گیا کیوں کہ ممیاں مجھے کبھی بھی سوئی ہوئی زارا کے کمرے میں جانے نہیں دیتی تھیں کہ وہ جاگ نہ جائے۔ میں مسکراتا ہوا زارا کے کمرے میں آ گیا۔ وہ نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔

ریکھا ماں کچھ دنوں سے بیمار تھیں۔ شاید ان کی طبیعت زیادہ ہی بگڑ گئی، انھیں تیز بخار تھا اور ان پر کپکپی طاری تھی۔ انھیں متلی ہو رہی تھی اور کبھی کبھی وہ پیٹ پکڑ کر کراہ اٹھتیں۔ رخسار ممی ساری رات ان کے سرہانے بیٹھی کبھی ان کا سر تو کبھی ہاتھ پاؤں سہلاتی رہیں۔ ماں نڈھال سی تھیں اور ممی پریشان۔ صبح ممی نے اپنے اسپتال فون کیا،''میری پارٹنر بہت بیمار ہے، مجھے اس کا خیال رکھنے کے لیے کچھ family-leave چاہیے۔''

اُدھر سے کچھ جواب آیا اور ممی زور سے چلائی،''کیوں نہیں؟ باقی سب کو تو ملتی ہے۔''

پھر فون پر جانے کیا باتیں ہوئیں کہ ممی غصے سے فون رکھ کر سیدھے باتھ روم میں گھس گئیں۔ باہر نکلیں تو ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، بغیر کسی کی طرف دیکھے انھوں نے شاید کچھ اور فون کیے۔''ایمرجنسی ہے، بچوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں...''جیسے الفاظ سنائی دیے۔

رخسار ممی کو چھٹی نہیں ملی۔ انھیں کام پر جانا ہی پڑا۔ اس دن ہم ایک نئی baby sitter کے ساتھ رہے اور ریکھا ماں اپنے کمرے میں اکیلی پڑی زور زور سے کراہتی رہیں۔ ممی جلدی کام سے لوٹ آئیں۔ وہ کبھی اتنی آسانی سے پریشان ہونے والی عورت نہیں ہیں مگر آج محسوس ہوا کہ وہ کوئی اور ہی ممی ہیں۔ وہ اندر جا کر کبھی ریکھا ماں کو چھوتیں، کبھی ان کے گلے لگتیں، کبھی آنکھیں پونچھتیں، میں یہ سب باہر سے ہی دیکھ رہا تھا اور کچھ سہما ہوا تھا۔

ممی ایک دم سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئیں، جیسے کچھ فیصلہ کر رہی ہوں۔ پھر انھوں نے baby sitter کو مدد کرنے کو کہا۔ ریکھا ماں کو اپنی دائیں بازو کا سہارا دے کر، تقریباً خود پر لادتے ہوئے انھوں نے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور گاڑی چلا کر اسپتال لے گئیں۔

اس رات ہم baby sitter کے ساتھ رہے۔ ممی نے اسے دو تین بار فون کیا۔ baby sitter نے مجھے دیکھا اور کہا،''بری خبر ہے۔ تمھاری ماں کے گال بلاڈر میں اسٹون ہے۔ آپریشن کی ضرورت ہے مگر رخسار کی انشورنس اس کے اسپتال کا خرچ دینے کو تیار نہیں ہے۔

میرے ڈیڈی کی انشورنس نے تو میری ممی کی بیماری کا سارا خرچ دیا تھا۔'' پھر تھوڑا سوچتے ہوئے بولی، ''شاید یہ لوگ شادی شدہ نہیں ہیں، اس لیے۔''

ممی کا پھر فون آیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ انھیں ریکھا ماں کے علاج کے لیے آپریشن کی اجازت دینے کا حق نہیں ہے، ان کے دستخط قابل قبول نہیں، وہ انتظار کر رہی ہیں۔''

ممی نے مجھ سے بھی بات کی۔ ''بیٹا، تم مت گھبرانا۔ زارا کا خیال رکھنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم کہاں ہو ممی؟'' میں تقریباً رو پڑا تھا۔

''ویٹنگ روم میں بیٹھی ہوں۔ ریکھا کے کمرے میں جانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ میں اس کی فیملی میں نہیں شمار ہوتی۔'' مجھے محسوس ہوا کہ ممی فون پر سسک رہی تھیں۔

دوسرے دن شام کو دونوں مائیں لوٹ آئیں۔ ریکھا ماں بہت کمزور لگ رہی تھیں اور رخسار ممی بہت تھکی ہوئیں۔ رات کو جب میں انھیں 'گڈ نائٹ' کہنے ان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو کاریڈور میں ہی رک گیا۔ رخسار ممی کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ شاید غصے میں تھیں، ورنہ وہ کبھی اتنی اونچی آواز میں نہیں بولتی تھیں۔

''یہ بالکل ناانصافی ہے۔ باقی سب کو family leave مل سکتی ہے تو مجھے کیوں نہیں؟ ہمیشہ ہم سے دوسرے درجے کا برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے؟ ایک تو عورت ہونے کے ناتے ویسے ہی بھید بھاؤ، اوپر سے جب پتہ چلتا ہے کہ میں ان کے طے کیے گئے رشتوں کے سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتی ہوں تو اور بھی قہر ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہم پورے ٹیکس ادا کرتے ہیں مگر ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ملتا جو کسی بھی عام شادی شدہ جوڑے کو حاصل ہے۔ میری بیمہ کمپنی کیوں تمھاری بیماری کا خرچ نہیں دے سکتی؟ آج مجھے کچھ ہو جائے تو نہ تمھیں میری نوکری کی پنشن ملے گی اور نہ ہی دوسرے فائدے جو کہ عام طور پر دوسرے جوڑوں کو ملتے ہیں۔ اس گھر سے بھی نکال دی جاؤ گی۔ وارث بن کر پتہ نہیں کون کون آ جائے گا۔''

ریکھا ماں نے بھی شاید جواب میں کچھ کہا جو مجھے سنائی نہیں دیا۔ میں انھیں 'گڈ نائٹ'

کہے بغیر چپ چاپ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

مجھے پتہ ہے کہ رخسار ممی والے نانا نانی تو کبھی کبھار ملنے آ جاتے تھے مگر ریکھا ماں والی نانی کبھی نہیں آتیں، اس سے ماں بہت دُکھی رہتی تھیں۔

ممیاں مجھے سنڈے اسکول نہیں بھیجتیں جہاں مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے مگر میرے اسکول کے کئی بچے جاتے ہیں۔ میں اور میکس لنچ ٹائم میں کھانا کھا رہے تھے، تبھی جان اور اس کے دوست شرارت کے موڈ میں ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے، وہ سبھی مجھ سے دو کلاس آگے تھے۔ جان ہماری طرف چہرہ کر کے کہنے لگا، ''ہمارے چرچ میں کہتے ہیں، جو بھی رشتہ ایک آدمی اور عورت کے علاوہ ہوتا ہے، وہ گناہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جہنم میں جاتے ہیں۔ وہ آگ کے الاؤ میں بھونے جاتے ہیں اور گرم سلاخوں سے داغے جاتے ہیں۔'' پھر وہ سبھی زور زور سے ہنسنے لگے۔

مجھ سے لنچ نہیں کھایا گیا۔ شاید میرے چہرے پر کچھ تھا جسے میکس نے دیکھ لیا۔

''چلو، باہر چلتے ہیں۔'' وہ مجھے اسکول کیفے سے باہر گھسیٹ لایا۔

میرا چہرہ تپ رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں چھلک رہی تھیں۔ باہر آ کر ہم نے واٹر فاؤنٹین میں پانی پیا اور میں نے تو منھ بھی دھویا۔

''میکس! مجھے تمھیں ایک بہت ہی پرسنل بات بتانی ہے۔ لیکن پہلے پرامس کرو کہ کسی اور کو نہیں بتاؤ گے۔''

''گاڈ پرامس!'' میکس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

''میری دونوں ممیاں 'گے' ہیں۔'' میں نے اپنی ساری طاقت بٹور کر اتنی جلدی سب کچھ اُگل دیا کہ اگر ایک لمحے کے لیے، سانس لینے کے لیے بھی رکتا تو شاید نہ کہہ پاتا۔

میکس کے چہرے ویسا ہی سپاٹ رہا، مجھے حیرت ہوئی۔

''مجھے معلوم ہے۔ میرے ڈیڈ نے کہا تھا کہ لگتا ہے تمھارے دوست کی دونوں ماؤں کے درمیان ہوموسیکشوئل رشتہ ہے مگر جب تک وہ خود نہ بتائے تم اس سے نہیں پوچھو گے ورنہ وہ عجیب محسوس کرے گا۔''

''تمھیں عجیب نہیں لگا؟''

''نہیں۔ انیس کے انکل بھی 'گے' ہیں۔''

''تمھیں کیسے معلوم؟''

''مجھے کیسے معلوم ہوگا، وہ تو پاکستان میں ہیں۔ انیس نے ہی بتایا۔''

میری اُبلی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر وہ بولا، ''ارے ہر جگہ کے لوگ 'گے' ہو سکتے ہیں۔ انیس کے انکل شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ماں باپ نے زبردستی ایک خوب صورت سی لڑکی سے ان کی شادی کرادی تھی۔ شادی کے بعد وہ اسے مارتے پیٹتے تھے۔ کہتے تھے کہ تو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ ایک دن دھکا دے دیا تو وہ روتی ہوئی واپس اپنے میکے چلی گئی۔ انیس کی ممی کہتی ہے کہ شاید وہ 'گے' ہے۔ انیس نے چپکے سے یہ بات سن لی تھی، پھر مجھے بتایا۔ خیر ہمیں ان کی باتوں سے کیا لینا دینا۔ میرے ڈیڈ کہتے ہیں، جو جیسا ہے اسے ویسے وہی قبول کرنا چاہیے۔''

مجھے میکس کی باتیں اچھی لگیں، ایک دم پوچھ بیٹھا، ''تو پھر تم میرے گھر کھیلنے آؤ گے؟''

''ہاں آؤں گا، مگر ایک بات تم بھی میری مانو گے؟''

''کیا؟'' میں اس وقت اس کی ہر بات تسلیم کرنے کو تیار تھا۔

''پلیز اسکول کی کاؤنسلر مسز رچرڈسن سے مل لو اور جو جو باتیں تمھیں پریشان کرتی ہیں، انھیں بتادو۔ تمھیں اچھا لگے گا۔''

اگلے روز میں مسز رچرڈسن سے ملا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ میری باتیں سنیں۔ مجھے لگا کہ جو باتیں میں دونوں ماؤں سے نہیں کہہ سکتا تھا؛ اپنا ڈر، اپنی فکر، اپنے سروکار سب کچھ میں ان سے شیئر کر سکتا تھا۔

میں نے انھیں جان اور اس کے دوستوں کی کہی بات بتائی۔ کیا سچ مچ میری ممیاں پاپ والی زندگی جی رہی ہیں؟ کیا وہ سچ مچ جہنم میں جائیں گی؟ میری دونوں ممی اتنی اچھی اور پیاری ہیں کہ انھیں کوئی تکلیف ہو، اس خیال سے ہی میری آنکھیں بھر آئیں۔

مسز رچرڈسن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرائیں، ''وہ سب لوگ غلط مطلب نکالتے ہیں۔ اچھا تم بتاؤ، جیسز کیا کہتے ہیں؟''

''سب سے پیار کرو۔'' میں زیرلب بدبدایا۔

''تو جیسز سب سے پیار کرتا ہے۔'' انھوں نے 'سب سے' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں خاموش رہا۔

''تو وہ سب سے پیار کرتا ہے، چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ اس کا پیار کچھ خاص لوگوں کے لیے نہیں ہے، اپنے سب بچوں کے لیے ہے؛ اگر جان کی ممی کے لیے ہے تو تمھاری

ممیوں کے لیے بھی ہے۔''

مجھے سن کر اچھا لگا۔ میں مسکرا دیا۔

میں ان کے آفس سے باہر نکلا تو محسوس ہوا کہ جیسز کی بات کا اصلی مطلب تو مسز رچرڈسن ہی سمجھتی ہیں۔ اب میں بھی یہی کروں گا، سب سے پیار کروں گا؛ جان، انیس، ٹونی، میکس سبھی سے۔

دونوں مائیں ایک جلوس میں گئی تھیں۔ شاید کوئی بہت ہی ضروری بات ہوگی ورنہ وہ ہمیں یوں اکیلا چھوڑ کر کم ہی نکلتی ہیں۔ میں اور زارا baby sitter کے ساتھ گھر پر ہی تھے، ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ ممی لوگ تو صرف ایک یا دو پروگرام ہی دیکھنے دیتی تھیں مگر آج baby sitter تھی، پورے کا پورا ٹیلی ویژن ہمارے قبضے میں تھا۔

نیوز چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

''ہوموسیکشوئل کو بھی قانونی شادی کی اجازت ملنی چاہیے۔''

''ہمارے ساتھ بھید بھاؤ بند کرو۔''

''ہمیں بھی وہ حقوق ملنے چاہئیں جو کسی بھی شادی شدہ جوڑے کو ملتے ہیں۔''

ایک بار تو مجھے اس بھیڑ میں رخسار ممی اور ریکھا ماں کے جوش سے بھرے تمتماتے چہرے بھی نظر آئے۔

پھر ٹیلی ویژن پر ایک آدمی دوسری خبریں بتانے لگا۔ ''کینساس سٹی میں ایک ہوموسیکشوئل لڑکے کو کچھ لوگوں نے پیٹ پیٹ کر مار دیا۔'' پھر کچھ پولیس والے نظر آئے، اس لڑکے کی روتی ہوئی ماں کو دیکھ زارا رونے لگی۔

میں نے زارا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''پتہ ہے کچھ لوگ ہوموسیکشوئل سے بہت نفرت کرتے ہیں۔ یہ لوگ 'ہوموفوبک' ہوتے ہیں۔ ارے بابا، جیو اور جینے دو۔'' baby sitter کی کمنٹری جاری تھی۔

اگر کسی نے میری ممیوں کو بھی...؟ میں کانپتا ہوا اپنے بیڈروم میں آ گیا، آنکھوں تک کمبل کھینچ لیا۔ میری سانس بہت تیز تیز چل رہی تھی۔ مجھے لگا کہ کچھ لوگ میری ممیوں کو رسیوں سے باندھ رہے ہیں، ان پر پتھر پھینک رہے ہیں۔ انھیں گندی گندی گالیاں دے رہے ہیں۔ ممیوں کے جسم سے خون بہہ رہا ہے اور ان کی گردنیں ایک طرف لڑھک گئی ہیں۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ پسینے میں شرابور میرے جسم میں میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ محسوس ہوا جیسے ابھی میرے جسم سے باہر آ جائے گا۔ میں نے ممی کو آواز دینی چاہی مگر شاید خوف کے سبب میرے حلق سے آواز تک نکل نہیں پائی۔

میں چپ چاپ چھت کی طرف دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے پردہ اٹھا کر باہر دیکھا۔ ممی کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب ممیاں گھر واپس آ چکی ہیں۔

میں پُرسکون ہو گیا۔ میکس کے ڈیڈی کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے پاگل لوگ بھی رہتے ہیں جنھیں پہچان پانا آسان نہیں ہوتا۔ وہ لوگ اپنے علاوہ سب کو غلط سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی غلطی ٹھیک کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ ایسے سماج کے ٹھیکے داروں سے مجھے دہشت ہوتی ہے۔ اکثر رات کو میری نیند کھل جاتی ہے۔ میں کسی سے کہتا نہیں مگر رات کو سونے سے پہلے اٹھ کر سبھی دروازے چیک کر لیتا ہوں کہ وہ ٹھیک سے بند ہیں یا نہیں۔ معلوم نہیں کیوں رات کو ڈر زیادہ لگتا ہے۔ ریکھا ماں سے بھی کہہ دیا ہے کہ وہ میرے لیے دروازہ کھلا نہ چھوڑیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

آج کل دونوں ممیاں کسی کام میں بہت مصروف نظر آتی ہیں۔ فون پر لوگوں سے باتیں کرتی ہیں تو ایک لفظ بار بار سنائی دیتا ہے: 'gay rights'۔ آئے دن جلسہ جلوس میں حصہ لینے جاتی ہیں۔ ریکھا ماں تو پتہ نہیں کیا کیا دستاویز اکٹھا کرتی رہتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت بڑی جنگ لڑنے کی تیاری کر رہی ہیں۔

ریکھا ماں اس دن کسی سے فون پر کہہ رہی تھیں کہ یہ لڑائی ہم صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دنیا میں رہنے والے سبھی ہوموسیکشوئل کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس تحریک کی شروعات کسی کو تو کرنی ہے۔ ہم جھنڈا لے کر چلیں گے تو باقی بھی ہمارے پیچھے پیچھے آئیں گے۔ کارواں تو ایسے ہی بنتا ہے۔ ہماری دلچسپی، پسند و ناپسند الگ ہو سکتی ہیں مگر غلط نہیں اور درست بات کے لیے ہم پوری طاقت سے لڑیں گے۔''

میں یہ سب باتیں ٹھیک سے نہیں سمجھ پا رہا تھا مگر میری مائیں جو بھی کریں گی، میں ان کا ساتھ دوں گا۔ یہ میرا اپنے آپ سے وعدہ ہے۔

اس دن ریکھا ماں کوئی فارم بھر رہی تھیں، اچانک انھوں نے جھنجھلا کر قلم ہی پھینک

دیا۔

''بارہ سال ہوگئے ہمیں ساتھ رہتے ہوئے اور ابھی تک 'سنگل' پر ہی نشان لگا رہے ہیں۔ پھر الگ الگ، دُگنا، انکم ٹیکس بھی بھرنا پڑتا ہے۔''

رخسار ممی کے چہرے پر بے بسی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں یہ جان جاتا ہوں مگر سمجھ نہیں پاتا کہ میں کس طرح دونوں ممیوں کو خوش کروں؟ میں نے ممی کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور ان کے گال چوم لیے۔ ممی نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کم سے کم یہ تو کر ہی سکتا ہوں۔

صبح اسکول جانے سے پہلے میں اپنی آنکھیں ملتا ہوا نیچے آیا تو وہیں قدم رُک گئے۔ کچن ٹیبل پر آج کا اخبار بکھرا پڑا تھا اور دونوں ممیاں ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوشی سے گول گول گھوم رہی تھیں۔

مجھے دیکھا تو ریکھا ماں نے دوڑ کر مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا اور ناچنے لگیں۔

''جانتے ہو، بل پاس ہوگیا۔'' ان کے منھ سے خوشی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

میں ابھی بھی انھیں ہونق بنا دیکھ رہا تھا۔ کیا میری دونوں ممیوں کا دُکھوں کی وجہ سے دماغ چل گیا ہے، پاگل ہوگئی ہیں؟

''اب نیویارک میں بھی 'گے میرج بل' پاس ہوگیا ہے۔ اب ہم دونوں شادی کر پائیں گی۔''

''کب ہوگی شادی؟'' میں بھی خوش تھا، کیوں کہ میری دونوں مائیں خوش تھیں۔

''جلدی، بہت جلدی۔'' رخسار ممی بس اب اور انتظار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اور پھر ہمارے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ سب کو دعوت نامے بھیجے جا رہے تھے۔ میرے اور زارا کے نئے کپڑے بھی آ گئے۔ میکس کے ڈیڈ نے کہا کہ وہ شادی کی رسم کے بعد ممی اور ماں کو اپنی بڑی والی کار میں گھر لے جائیں گے۔

ممی اور ماں تھوڑی کھسر پھسر کرتی تھیں، شاید کوئی بات ہے جو انھیں پوری طرح خوش ہونے کی رکاوٹ بن رہی تھی۔ میں اپنا ہوم ورک کر رہا تھا تو میں نے سنا کہ ریکھا ماں اپنی خالہ سے بات کر رہی ہیں۔

''میری ماں کو سمجھاؤ۔ یہ دن میرے لیے بہت خاص ہے۔ اگر وہ اس شادی میں نہیں

آئی تو...'' پھر ماں سسکیاں بھرنے لگی تھیں۔

شادی والے دن میں نے اپنا سیاہ ٹکسیڈو پہنا اور زارا نے لیس والی گلابی فراک۔ رخسار ممی نے کریم رنگ کا پینٹ سوٹ اور ریکھا ماں نے بھی اسی رنگ کا اسکرٹ سوٹ۔ رخسار ممی والی نانی نے دونوں انگوٹھیوں کے ڈبے اپنے پرس میں سنبھال کر رکھ لیے۔ سبھی گھر آنے والے مہمان آ چکے تھے اور ممیوں کے دوستوں نے ہمیں سٹی ہال کے باہر ہی ملنا تھا۔ ممی کے آفس کا کوئی آدمی ہماری تصویریں لے رہا تھا کہ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔

آئے ہوئے مہمان کو دیکھ کر ریکھا ماں کے منھ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ وہ دوڑ کر اس بزرگ عورت سے لپٹ گئیں۔ وہ روتی جا رہی تھیں اور بولتی چلی جا رہی تھیں، ''تھینک یو موم، تھینک یو سو مچ۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ ضروری میری دوسری والی نانی ہوں گی۔

رجسٹرار کے دفتر میں ممی اور ماں نے دستخط کیے۔ نانی نے مجھے اور زارا کو ایک ایک انگوٹھی پکڑا دی اور ہمیں ممیوں کو دینے کا اشارہ کیا۔ رخسار ممی اور ریکھا ماں نے ایک دوسرے کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی، وہاں کھڑے سبھی لوگوں نے تالیاں بجا دیں۔ ممی اور ماں نے سب کے سامنے ایک دوسرے کا بوسہ لیا۔ لوگوں نے ان پر پھولوں کی پتیاں پھینکنی شروع کر دیں۔

میکس کے ڈیڈ اپنی کار ہمارے دروازے تک لے آئے۔ اس پر دو بڑے بڑے غبارے بندھے تھے اور پیچھے کے شیشے پر سفید رنگوں سے لکھا تھا: 'Newly Married'۔

رخسار ممی اور ریکھا ماں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ان کے پیچھے والی کار میں رخسار ممی والے نانا ڈرائیونگ سیٹ پر اور نانی ان کے بغل میں بیٹھی تھیں۔ زارا کو بچوں والی سیٹ پر بیلٹ سے باندھنے کے بعد دوسری والی نانی میرے ساتھ پچھلی والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

''تم نے آخری وقت پر آنے کا ارادہ کیسے بنا لیا؟'' بڑی نانی نے پوچھا تو چھوٹی نانی کھو سی گئیں۔

''کیوں کہ... کیوں کہ میری بہن نے کہا کہ جیسے تم اپنے مرحوم شوہر سے ابھی تک اتنی محبت کرتی ہو، ریکھا بھی ویسے ہی رخسار سے پیار کرتی ہے۔ اپنے نجی تحفظات کی وجہ سے اسے کسی بھی طرح سے کمتر نہ سمجھو۔ سوچتی رہی، پھر مجھے لگا کہ ریکھا کی خوشی کے لیے آنا چاہیے، سو آ گئی۔''

اچانک ہم سب کا دھیان بٹ گیا۔ بڑی نانی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ایک دم سے ہمارے آگے کھڑی نئے شادی شدہ جوڑے والی کار کے اوپر ایک آدمی کچھ پھینک کر تیزی سے غائب ہو گیا۔ ہم سب دہشت زدہ ہو گئے، کہیں بم تو نہیں؟ میری سانسیں رکنے لگیں۔
کار کے پچھلے شیشے پر لکھا، 'Newly Married' کا لفظ، انڈے کی زرد اور سفیدی کے نیچے دب گیا تھا۔

- 14 -

نیا شہر تھا، میری نیند آج پھر ٹوٹ گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ وقت تک تو میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں۔ بچپن میں بھی میں یوں ہی اچانک جاگ جایا کرتا تھا۔ دادی مجھ پر چلاتی تھی، ''باہر سلایا کر اسے، نیند خراب...'' ان راتوں کو ماں میرے پاس چلے آیا کرتی تھی، میری الجھن بھری آنکھوں کو بند کرتے ہوئے وہ کہتی تھی، ''سو جا، اپنے ہی گھر پر ہے تُو۔''

دادی کہتی تھی کہ میرے پیروں میں پھیر ہے، یہ کسی ایک جگہ ٹک نہیں سکتا۔ جب میں پہلی بار گھر سے باہر نکلا تو میری عمر بیس سال بھی نہ تھی۔ میں چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھنے لگا تھا، شاید میری شادی کی بات بھی چل رہی تھی مگر میرے پاؤں میں گردش تھی۔ میں نے کئی شہروں میں ڈیرہ ڈالا، مگر وہاں بسنے سے پہلے ہی چل پڑا۔ ان برسوں میں، میں ایک آدھ بار ہی گھر لوٹا۔ شہروں کے علاوہ بھی کافی کچھ بدل گیا تھا، میں اب صرف نیچے دیکھ کر چلنے لگا تھا، کچھ کچھ ناستک ہو گیا تھا، کم بولنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ شادیاں ہونے لگیں؛ بھائیوں کی، بہنوں کی، پڑوسیوں کی، دوستوں کی، کئی بار میں ان شادیوں میں شریک ہوتا اور کئی بار نہیں بھی۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں مدتوں بعد گھر لوٹا تھا، کچھ الجھا سا تھا۔ ماں نے چوکے کے پاس ہی تھالی لگائی تھی، گھی ڈالتے ہوئے ماں نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا، ''بتا کیا چھپا رہا ہے؟'' میں کچھ بول نہ پایا اور نیچے دیکھنے لگا، شاید اپنی آنکھوں کی نمی چھپا رہا تھا۔

رات ختم ہو چکی تھی۔ ہڑبڑا کر جاگا ہوا یہ شہر اب ستانے لگا تھا۔ دن چڑھنے لگا، روشن دان سے ہو کر ایک دھوپ کا ٹکڑا کھسکتے کھسکتے میرے پاس آ پہنچا تھا اور یہیں ٹھٹک گیا تھا۔ مجھے ایسی

ہی ایک دوپہر یاد ہے اور روشن دانوں سے کھسک کر دھوپ بھی، کچھ قہقہے بھی، کچھ سکون بھرے لمحے، کسی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے؛ مگر کتنے ہی دوپہروں سے میں اکیلا ہوں۔ اب تو وہ دھوپ کا ٹکڑا بھی دور کھسکنے لگا ہے۔

میرا دل رونے کا کر رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں لیکن روؤں گا نہیں۔ میں تب بھی نہیں رویا تھا جب دادی گزر گئی تھی۔ مجھے گھٹن کا احساس تو ہوا تھا لیکن رویا نہیں تھا۔ مسلسل دو دن ٹرین میں سفر کر کے پہنچا تھا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہر چیز رکی رکی سی محسوس ہو رہی تھی۔ لوگ اس کے پاس آتے اور کہتے کہ دادی کی آخری خواہش تھی کہ وہ میرا گھر بسا ہوا دیکھیں۔ میں صرف سر ہلاتا رہا۔ ماں نے کچھ نہیں کہا البتہ انھوں نے بہت سی باتیں کیں جیسی دوسری مائیں عموماً کیا کرتی ہیں کہ ''کیا کھاتا ہے؟... اتنا دبلا کیسے ہو گیا؟... نئے شہر میں دل لگ گیا؟... خوش تو ہے ناں؟...'' لیکن انھوں نے دادی اور ان کی آخری خواہش کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

لوٹتے وقت ماں نے جلدی لوٹ آنے کو کہا۔

اور میں جلدی آیا بھی۔ ماں مر رہی تھی بغیر کسی آخری خواہش کا اظہار کیے، اس کا ہاتھ پکڑے میں اسی طرح بیٹھا ہوا جیسا اس دن چوکے پر بیٹھا اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا، ''کیا چھپا رہا ہے؟''

مجھے آج بھی کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں آج بھی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

سب نے ماں سے پوچھا بھی تھا، ''کوئی آخری خواہش؟ چھوٹے کی شادی کرا دیں؟''

ماں خاموش ہی رہی، بس میرے ہاتھوں پر اس کی گرفت تھوڑی اور مضبوط ہو گئی۔ جب بھی لمبی بے ہوشی کے بعد ماں کو ہوش آتا تھا، وہ الجھن بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہتی۔ میں ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے دھیرے سے کہتا، ''سو جا ماں، ہم اپنے ہی گھر میں ہیں۔''

ماں چلی گئی بغیر کچھ مانگے، بغیر آخری خواہش کا اظہار کیے ہوئے۔

میں بھلا اس کو کیا دے پاتا، اب تک خود کو بھی کچھ نہ دے پایا۔

مجھے بھوک لگی تھی۔ بغل والے روم سے ایک سموسہ آیا تھا، اسے کھانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ گنوار عورت دو دن سموسہ دے گی، پانچ دن یوں ہی بالکونی میں اپنے بال بنائے گی، گھنٹوں سجا کرے گی، پھر بے وجہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرے گی، مسکرائے گی، اس کے بعد ہفتہ

دو ہفتہ میں اس کی شکایت شروع ہوجائے گی، ''ہم پریوار والوں کے درمیان یہ بیچلر...'' سموسہ بے ذائقہ تھا۔

میں صرف لیٹا رہا۔ شام کو دھیرے سے اٹھا۔ میرا نیا کمرہ بکھرا ہوا سا تھا۔ نہا دھوکر جینز ٹی شرٹ ڈال کر باہر نکل پڑا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب میری توند نکلنے لگی ہے۔

اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ایک بار پھر میں کسی نئے شہر کے نئے ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ گندگی بکھری پڑی تھی، لوگ پھیلے پڑے تھے مگر میں کہیں نہیں تھا اور نہ مجھے کہیں جانا تھا۔ کئی لوگ مجھے گھورتے ہوئے گزر رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں، ''ہم جانتے ہیں، سب کچھ جانتے ہیں۔'' شاید وہ لوگ بھی برسوں پہلے یہاں یوں ہی کھڑے رہتے ہوں، جب یہ شہر انھیں ٹھیک سے پہچانتا نہ تھا۔ ان نفرت بھری نظروں میں دراصل سوزش اور مجبوری تھی۔

شہر سو رہا ہے۔ رات برس رہی ہے اور چھتیں اندھیرے کی نمی سے گیلی ہوچکی ہیں۔ ایک چھوٹا سا چاند آسمان کے ایک گوشے میں ہینگر سے یوں لٹکا ہوا ہے جیسے ابھی ہوا کے ایک جھونکے سے وہ ٹپک کر زمین پر آن گرے گا۔ چاند جب بھی زمین پر گر کر ٹوٹتا ہے تو اس کے ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی، البتہ اس کے ٹوٹنے کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔

شہر کا ٹوٹنا چاند کے ٹوٹنے جیسا ہے۔ آدھی رات کا آدھا حصہ شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے گزرتا ہے۔ آدھی رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر شہر کے خواب بھی سنتا ہوں اور اس کی کراہ بھی۔ واپسی کے گیت بھی سنتا ہوں اور جدائی کا نوحہ بھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ شہر کیسے بنتے ہیں۔ میں نے کبھی کسی شہر کو بنتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے صرف شہروں سے محبت کی ہے، انھیں بھوگا ہے۔ زندگی کی سب سے خوب صورت کہانی یہی رہی کہ شہر کے سب سے تنہا حصے میں ایک دوست مل جاتا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ میں تمھیں جانتا ہوں اور میں اپنی روح نکال کر اس کی آنکھوں کے دریچے میں سجا دیتا ہوں۔ ہم دونوں مل کر ایک خواب بنتے ہیں۔ شہر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔

آخری لوکل ٹرین جا چکی ہے۔ اس سے اترے ہوئے مسافروں سے بھی اسٹیشن تقریباً خالی ہوچکا ہے۔ پلیٹ فارم اونگھنے لگے ہیں۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں بھی درد کرنے لگتے

تھے، میں اب لیٹنا چاہتا تھا۔

پیچھے سے لڑکھڑاتا ہوا ایک آدمی آیا اور مجھ سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا، پھر مجھے مڑ کر دیکھتا ہوا چل پڑا۔

میں اس لمس اور نگاہوں کو پہچانتا تھا۔ کیوں نہ پہچانتا، کتنا کچھ چھین لیا ہے اس لمس اور نظروں نے۔ میں پھر بھی ہر بار کی طرح وہیں کھڑا رہا؛ نئے مگر مانوس لمس اور نظروں کے لیے تڑپتا رہا، نچوڑے جانے کے لیے۔ میں تیز قدموں سے اسی طرف گیا جہاں وہ شرابی گیا تھا۔ شرابی جو اگلے موڑ پر کھڑا تھا، مسکرا دیا۔ اب میں دھیرے دھیرے قدموں سے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ میں اپنے پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ اندھیری اور بدبودار تنگ گلیاں میری شناسا تھیں، ایسی کئی گلیوں سے کئی بار جان پہچان ہو چکی تھی، ان سے سرگوشیوں میں کئی بار گپ شپ لڑا چکا تھا لیکن ہر بار ان گلیوں میں کچھ کھو گیا۔ کتنی بار میں ان گلیوں میں چیخا بھی ہوں اور کئی بار چیخ بھی نہ پایا۔ کئی بار میں خاموش رہ کر بڑبڑایا، ''تم صرف ایک خواب ہو، میرے برے خوابوں جیسے... میں ہڑبڑا کر جاگوں گا... دادی چلائے گی اور ماں مجھے تھپک کر سلا دے گی،'' سوچا، تو اپنے ہی گھر پر ہے۔''

جب میں چوتھی یا شاید پانچویں کلاس میں تھا، اپنے نانا کے ساتھ رہتا تھا۔ نانا ایک ٹیچر تھے۔ وہ اکیلے ایک روم میں رہتے تھے، ان کے ہاں ٹی وی نہیں تھا۔ میں اکثر پڑوس میں 'شکتی مان' دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ اس گھر میں ایک ۲۵ سال کا لڑکا تھا۔ وہ پہلے میرے انڈرویئر میں ہاتھ ڈال کر میرا عضوِتناسل پکڑتا اور پھر اپنا عضوِتناسل مجھے پکڑا کر جلق لگواتا۔ اگر میں ایسا کرنے سے کبھی انکار کر دیتا تو وہ ٹی وی بند کر دیتا تھا۔ 'شکتی مان' میرا فیوریٹ شو تھا، اتنا پسند تھا کہ مجھے اس کے لیے یہ قربانی دینی ہی پڑتی تھی۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنا عضوِتناسل کو چوسنے کے لیے بھی بولنے لگا، گھن آتی تھی لیکن شکتی مان کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا اور شاید وہ یہ بات جانتا تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب نانا نے بھی ٹی وی خرید لیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس لڑکے کے گھر ٹی وی دیکھنے کمسن لڑکیاں بھی جاتی تھیں، ممکن ہے کہ وہ ان کے ساتھ بھی ایسی حرکت کیا کرتا ہو۔

میں وہ رات یاد کر کے آج بھی ڈر جاتا ہوں جب انھوں نے میرا ابلاتکار کیا تھا۔ ایک

سات سال کے بچے کے لیے وہ چیز کتنی دردناک ہوسکتی ہے جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہ جانتا ہو، یہ بات شاید آپ کبھی نہیں سمجھیں گے۔ گھر میں شادی تھی اور سب لوگ 'میرج ہال' گئے تھے۔ پورا گھر خالی تھا اور میں گھر میں اکیلا سو رہا تھا۔ میرے دو چچیرے بھائی، جن کی عمر اس وقت ۱۷-۱۸ سال رہی ہوگی، مجھے جگانے کے لیے آئے، انھوں نے کہا کہ میری ماں نے مجھے بلایا ہے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ماں کہاں ہے، تو وہ بولے کہ بس وہ آرہی ہوگی اور یہ کہہ کر انھوں نے دروازہ بند کردیا۔ میں نے ان سے کہا کہ دروازہ کیوں بند کردیا؟ انھوں نے مجھے پچکارتے ہوئے کہا، بلّی آجائے گی۔ (شاید انھیں پتہ تھا کہ میں بلّی سے بہت ڈرتا تھا۔)

وہ بستر پر لیٹ گئے اور میں صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ وہ دونوں موبائل پر کچھ کرنے لگے اور پھر ان میں سے ایک اپنا عضوتناسل باہر نکال کر جلق لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا بھی اس میں شریک ہوگیا۔ میں اس وقت نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کررہے ہیں، میں نے ان سے پوچھا بھی لیکن انھوں نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر ان میں سے ایک نے ٹی وی بند کردیا اور دونوں موبائل میں پورن مووی دیکھنے لگے۔ اب میں تھوڑی سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا، میں نے ان سے ماں کو بلانے کے لیے کہا تو ایک نے اٹھ کر مجھے دبوچ لیا اور میرے نیکر کو نیچے کھینچ دیا۔ میں زور زور سے ماں کو آواز دینے لگا۔ ایک نے میرے ننگے چوتڑ پر اپنا عضوتناسل رگڑنا شروع کردیا اور دوسرا اپنا عضوتناسل میرے منھ میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ ایسا وہ ہر دو تین دن میں کرتے تھے۔ کبھی چاکلیٹ دلانے کے بہانے مجھے لے جاتے اور نیچے باتھ روم میں بند کرکے پھر وہی سب کرتے۔ مجھے بہت درد ہوتا، خون بھی نکلتا، لیکن کسی سے کچھ نہ کہہ پایا۔ میں ماں سے کہتا کہ مجھے بھائی کے ساتھ نہیں جانا تو وہ کہتیں، ''چلے جاؤ، بھیا چاکلیٹ دلائیں گے۔'' لیکن ان کا بھی کیا قصور، انھیں کیا پتہ کہ بھیا کون سی چاکلیٹ دلانے کی بات کررہے ہیں۔ سوچتا تھا کہ کس کو بتاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ سب میرا مذاق اڑائیں گے، خاموش رہ جاتا تھا۔

جب میں ۱۲ سال کا ہوا تو مجھے ان کے دوست الگ الگ نام سے پکارتے تھے؛ کوئی میٹھا تو کوئی گیلا کہتا۔ ایک کھلونے کی طرح ہوگیا تھا میں۔ جو چاہتا، وہ استعمال کرلیتا تھا۔ شرم آتی ہے اپنے آپ پر، یہ سوچ کر کہ اس وقت میں نے ان کے بارے میں گھر میں کیوں نہیں بتایا،

افسوس ہوتا ہے کہ ماں کو اس کے آخری وقت میں بھی بتا نہ سکا، کسی کا بے خبری میں مرجانا کتنا درد ناک ہوتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے کچھ چھپا رہا ہوں، میری لڑکیوں میں عدم دلچسپی کو بھی وہ شدت سے محسوس کر رہی تھی لیکن شاید وہ مجھے بتا کر میرا بھرم مجھ سے چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ میں کوشش کے باوجود اسے کچھ نہ بتا سکا، اسے یہ بھی نہ بتا سکا کہ اس دن ہمیشہ کی طرح وہ پوجا گھر میں مصروف تھی اور پاپا آفس میں تھے۔ مجھے غسل خانے سے کسی کے پکارنے کی آواز سنائی دی جو میرے ہی گھر میں کرائے پر رہنے والے ایک 'بھیا' کی تھی۔ میں ان کے بلانے پر دوڑتا ہوا غسل خانے چلا گیا۔ وہاں 'بھیا' کے ساتھ ان کے دو نیم برہنہ ساتھی موجود تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، سبھی نے مل کر میرے کپڑے اتارنے شروع کر دیے اور میرے جسم کو چھیڑنے اور نوچنے لگے۔ میں درد سے کراہ رہا تھا لیکن تینوں نے مل کر مجھے خوب روندا۔ میں سہم سا گیا تھا، کئی برسوں تک ایسا میرے ساتھ چلتا رہا اور ہمیشہ چپ رہنے اور کسی کو نہ بتانے کی تاکید کے ساتھ ایک بڑی سی دھمکی بھی میرے کانوں میں انڈیل دی جاتی۔

مریض کا جسم بیڈ پر اسی طرح اچھلنے لگا تھا جیسے بچے Jumping Bouncer پر جست لگاتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے حواس میں نہیں تھا، اس کے اعضا بے حس و حرکت ہی تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی نیچے سے اوپر اچھال رہا ہو جس پر اس کا قابو نہ ہو۔ نرسوں اور وارڈ بوائز اس کے اچھلتے ہوئے جسم کو پوری طاقت سے بیڈ پر چپکائے رکھنے کی کوشش میں ہیں اور مریض کا جسم ان کی گرفت میں اسی طرح اینٹھ رہا ہے جیسے زنا بالجبر کے وقت کوئی کمزور اور بے بس لڑکی چھٹپٹاتی ہو۔ ایک ڈاکٹر اپنے جونیئر کو تیزی سے حکم صادر کر رہا ہے، اس کی نظر Electro-cardiogram پر لگی ہوئی ہے جہاں مریض کے دل کی برقی پیمائش متحرک گراف کی شکل میں اوپر نیچے ہوتی نظر آ رہی ہے۔ دھڑکنوں کی تال بے قاعدہ ہو رہی ہے لیکن دھڑکنیں بہر حال زندہ ہیں، جدوجہد کر رہی ہیں، شاید don't give up کی آوازیں بھی لگا رہی ہوں جو وہاں موجود لوگ سن نہ پا رہے ہوں۔

- 15 -

don't give up...don't give up...

میں نیچے گر رہا ہوں، گرتا چلا جا رہا ہوں۔ ہوا کی سائیں سائیں نے مجھے بہرہ بنا دیا ہے، حتیٰ کہ اب دیوالی کے پٹاخوں اور راکٹوں کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی ہیں جو میرے جسم کے آس پاس سے اوپر کی طرف جا رہی ہیں لیکن میرا جسم ان کے برعکس نیچے جا رہا ہے۔ سترہ منزلہ عمارت میں واقع اپنے فلیٹ کی بالکنی سے یہ شہر کتنا چھوٹا لگتا تھا، لیکن اب اس کا حجم بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا اسی منظر کو دیکھنے کے لیے میں نے اپنی بالکنی سے نیچے جست لگائی تھی؟ نہیں نہیں میں مرنا نہیں چاہتا تھا، میں دیکھنا چاہتا تھا اس دنیا کو... اونچائیوں سے اور گہرائیوں سے... گولائیوں سے اور چوڑائیوں سے۔

don't give up...don't give up...

مجھے ابھی دیکھنا ہے کہ ایک ادھورے خواب کا کیا ہوتا، کیا وہ دھوپ میں کشمش کی طرح سوکھ جاتا ہے یا کسی کھلے زخم کی طرح پیپ سے بھرا پکتا رہتا ہے... کیا وہ سڑے ہوئے گوشت سا بجبجاتا ہے یا پرانی چاشنی کی طرح پپڑی بن جاتا ہے... کیا وہ کسی بھاری بوجھ کی طرح صرف معلق ہوتا ہے یا پھر... دھماکہ کرتا ہے؟

اس وقت میں دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اگرچہ چھتیس لڑکیاں لڑکے میرے ہم جماعت تھے لیکن میرے دوستوں کی تعداد بہت کم تھی؛ ایک میرا دوست ستیش اور دوسری میری گرل فرینڈ مانسی، یہی میری پوری کلاس تھی۔

ستیش نویں کلاس سے میرا ہم جماعت ہوا جب کہ مانسی میرے ساتھ پانچویں سے پڑھ رہی تھی۔ ستیش میرے گاؤں کا ہی تھا جو کچھ عرصہ پہلے شہر سے اپنے گھر والوں کے ساتھ گاؤں لوٹا تھا۔ اس کا جنم بھی شہر ہی میں ہوا تھا جب کہ مانسی پڑوس کے گاؤں کی تھی۔

ستیش ایک اسمارٹ لڑکا تھا لیکن وہ کبھی کلاس کی کسی لڑکی کی طرف راغب نہیں ہوا اور نہ ان سے دوستی کرنے کی کوشش کی۔ ایک لڑکی نے اسے محبت نامہ بھی بھجوایا لیکن ستیش نے اسی کے سامنے اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کھلم کھلا حادثے کے باوجود اب بھی کلاس کی کئی لڑکیاں اس خوب صورت لونڈے کو اپنے دام محبت میں پھنسانے کے لیے کوشاں تھیں۔ ستیش اور میں اچھے دوست تھے بلکہ یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ میرا تابع تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس کی کچھ حرکتیں مجھے جھنجھلا دیتیں۔ وہ کبھی کبھی کسی بات پر میرے گال پکڑ کر زور سے کھینچ دیتا تھا۔ میں اس کی سرزنش کرتا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتا۔ اس کی معصوم ہنسی میں کچھ تو تھا، جو میرے غصے کو بھی شانت کر دیتا تھا۔

اگر بات صرف گال کھینچنے تک رہتی تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن اب وہ اسے کھینچنے کے ساتھ چومنے بھی لگا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے چومنے کے لیے موقع تلاش کرتا رہتا تھا۔ کلاس میں اس کی ایسی حرکتیں مجھے بے چین کر دیتی تھیں جب کہ میرے ہم جماعت اسے صرف مذاق سمجھ کر ہنستے رہتے۔

ایک بار لنچ کے وقت مانسی اور ستیش دونوں کالج کے میدان میں لگی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک ستیش نے کسی بات پر اچھلتے ہوئے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر میرے گال کو اپنے ہونٹوں سے تر کر دیا۔ میں نے جھٹکے سے خود کو اس سے الگ کیا؛ ''کتنی بار تجھے بولا ہے کہ یہ 'گڑ چال' مجھ سے نہ کیا کر۔'' ستیش حسب معمول ہنس پڑا جیسے اس نے میرے ساتھ مذاق کیا ہو۔ مانسی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ میں اور تپ گیا، ''ستیش! اب تو یہاں سے نکل ورنہ مجھ سے پٹ جائے گا۔'' ستیش اور زیادہ زور سے ہنسنے لگا۔

مانسی نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے مجھے سمجھانے کی کوشش کی، ''تم بھی کیا چھوٹی چھوٹی سی بات اتنا بڑا 'ری ایکشن' دیتے ہو۔''

''ٹھیک ہے بھائی جا رہا ہوں، chill مار۔'' ستیش نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور وہاں سے چلا گیا۔

مانسی بہت دیر تک میرا غصہ کم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ ''یار، تیرا پرابلم کیا ہے؟ کیا

ایک دوست دوسرے دوست کو چوم نہیں سکتا؟ ہم لڑکیاں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسا کرتی ہیں۔کیا یہ کوئی جرم ہے، گناہ ہے؟''

''تو تمھیں کرالیا کرو اس سے یہ سب، مجھے بس اچھا نہیں لگتا۔''

مانسی نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''اب چپ کرو بھی۔ میں نے تمھیں یہ سب کبھی کرنے دیا ہے جو اس کو کرنے دوں گی؟''

میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

لیکن دیکھا جائے تو وہ سچ ہی کہتی تھی، ستیش میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اسے مجھ سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ میرا غصہ رفتہ رفتہ پچھتاوے میں تبدیل ہونے لگا۔ اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ستیش کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

کلاس پہنچا تو دیکھا ستیش وہاں پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی ہنسی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا، ''کچھ زیادہ ہی بول دیا یار، معاف کرنا۔''

''اس بات پر ایک اور ہو جائے!'' ستیش نے میرا منھ چومنے کی پھر کوشش کی لیکن میں بال بال بچ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس معصوم سے شریر لڑکے کا کیا کروں؟ پھر دھیرے دھیرے میں اس کی شرارتوں کو جھیلنے کا عادی ہو گیا۔

بورڈ کے امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ گرمی کا مہینہ چل رہا تھا۔ میں اپنے گھر کی چھت پر سوتا تھا۔ ایک دن ستیش نے مجھ سے اچانک پوچھا، ''یار میں بھی تیرے ساتھ تیری چھت پر سوؤں تو کیسا رہے گا؟ اس طرح ہماری کمبائنڈ اسٹڈی بھی ہو جائے گی۔''

مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں تھا لیکن اس کی حرکتوں کے پیش نظر میں نے اس کے سامنے شرط رکھی، ''ایک ہی شرط پر تو میرے ساتھ سو سکتا ہے، اگر تو الٹی سیدھی حرکتیں نہ کرے۔ جس دن تو نے ایسا کیا، اس دن تجھے رات میں ہی یہاں سے بھگا دوں گا۔'' ستیش نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔

اسی دن شام کے بعد ستیش میرے گھر آ دھمکا۔ گاؤں میں یہ عام بات ہوتی ہے۔ اکثر

لوگ ایک دوسرے کی چھت پر سوجاتے ہیں۔ پورے گاؤں کے بڑے بوڑھے لوگوں کی بیٹھک ایک ہی جگہ پر ہوتی ہے۔ سارے گاؤں کے کنوارے لونڈے ایک دوسرے کی چھتوں پر سوجاتے ہیں۔ ستیش کو دیکھ کر میرے گھر والوں کو بھی حیرت نہیں ہوئی۔

وہ لیٹتے ہی مجھ سے چپک گیا۔ مجھے کسی کے ساتھ چپک کر سونے میں الجھن ہوتی تھی، اسی لیے میں گھر میں سب سے الگ تھلگ سوتا تھا۔ میں نے اسے دور ہٹاتے ہوئے کہا، ''تجھے میرے پاس سونا ہے تو مجھ سے چپک کر مت سویا کر۔'' ستیش مجبوراً مجھ سے الگ ہو گیا اور بولا، ''یار تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی شرط ہوتی ہے۔''

میں نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا لیکن مجھے اس پر تھوڑا ترس آ رہا تھا۔ اس کی حرکتیں بالکل بچوں جیسی تھیں۔ کچھ دیر بعد یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا ستیش مجھ سے ایسا لپٹا پڑا تھا جیسے میں اسے چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔ میں نے اسے خود سے الگ کیا تو اس کی نیند بھی ٹوٹ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں اس کی مسکراہٹ کا جواب دیے بغیر چھت سے نیچے کی طرف کا رخ کیا۔ وہ بھی گھر چلا گیا۔ کلاس میں وہی روٹین تھا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ ہاں، اب روز ستیش مجھ سے لپٹ کر سونے لگا، یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ مجھ سے اسی وقت لپٹتا جب میں سو چکا ہوتا تھا۔

لیکن اس رات تو اس نے تمام حدیں پار کر دیں اور مجھے جو ڈر تھا، وہ مجسم ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ اس رات صبح ہونے سے تقریباً ایک گھنٹے پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔ دراصل کسی کا ہاتھ میرے اندر سنسنی پیدا کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ ستیش مجھ سے لپٹا ہوا میرے ہونٹ چوس رہا ہے اور اس کا ایک ہاتھ میرے انڈر وئیر کے اندر متحرک ہے۔

میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ ادھ کھلی نیند میں مجھے اور کچھ نہیں سوجھا لیکن میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ میں پھٹی آنکھوں سے ستیش کو مسکراتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ مجھے جیسے جیسے ہوش آتا گیا، میرا پارہ بڑھتا گیا۔ مجھے اس سے اب گھن آ رہی تھی۔

میرا غصہ اس وقت آسمان چھونے لگا جب میری آنکھوں سے نیند پوری طرح غائب ہو گئی۔ میں نے ستیش کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں کچھ عجیب سا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھے خمار آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسا کہ عموماً لڑکے اپنی گرل فرینڈ کو دیکھتے ہیں۔ میں زیادہ دیر تک ان آنکھوں کو برداشت نہ کر سکا اور اس کے گال پر میرا ایک زوردار تھپڑ جواب بن کر اپنی چھاپ چھوڑ گیا۔

تھپڑ پڑتے ہی اس کی رہی سہی نیند بھی غائب ہوگئی۔ وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر ہونق بنا مجھے دیکھ رہا تھا، جیسے اسے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں اپنے غصے کو قابو میں کرتے ہوئے غرایا، ''آج کے بعد اگر تو میرے آس پاس بھی نظر آیا تو یاد رکھنا اتنا ماروں گا کہ تیری یہ ساری 'گڑ چال' تیری گانڈ میں گھسا دوں گا۔ بےشرم۔''

اس دن جب میں اسکول کے لیے نکلا تو ستیش میرا انتظار کرتا ہوا ملا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس نے کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس سے سارے رشتے توڑ چکا تھا۔ کلاس میں بھی اس کے بینچ سے الگ بیٹھا۔ ستیش کے لیے یہ سب نیا تھا چونکہ جب کبھی ہمارے درمیان کوئی جھگڑا ہوتا تو دیر سویر پھر نارمل ہو جاتا لیکن اس بار ستیش جیسے امید کھو بیٹھا تھا۔ لنچ کے وقت جب اسکول کے میدان میں اپنی پسندیدہ جگہ بیٹھا تو وہاں بھی ستیش میرے پیچھے پیچھے آ پہنچا۔ اس نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے مجھ سے کہا، ''یار مجھے معاف کر دے۔ میں سچ کہتا ہوں، آگے سے ایسی غلطی نہیں ہوگی، بھگوان قسم۔''

اس سے پہلے کہ میں اس کے جواب میں کچھ کہتا، مانسی وہاں آ پہنچی۔

''اب کیا کر دیا ستیش نے، جو منھ پھلائے بیٹھے ہو۔ یار تم بات بات پر روٹھ جاتے ہو۔ اتنے نخرے تو لڑکیاں بھی نہیں دکھاتیں۔''

میں نے مانسی کو گھورتے ہوئے کہا، ''اگر میری جگہ تم ہوتیں تو اس بےشرم سے کبھی بات ہی نہ کرتیں۔ تمھیں پتہ ہے...''

اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کر پاتا، ستیش نے درمیان میں ٹوک دیا، ''ارے چھوڑ نا اس بات کو یار۔ میں معافی مانگ رہا ہوں نا!''

ظاہر ہے ستیش نے مجھے درمیان میں اس لیے ٹوکا تھا کہ کہیں میں کل رات والی بات مانسی کو نہ بتا دوں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

مانسی میرا موڈ دیکھ کر ستیش کو سمجھانے لگی، ''تو کیوں ایسی حرکتیں کرتا ہے؟ تجھے پتہ ہے نا، اسے یہ باتیں پسند نہیں ہیں۔ اب تم تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے کھسکو، میں اسے دیکھتی ہوں۔''

ستیش کے جاتے ہی مانسی نے مجھ سے سوال کیا، ''ایسا کیا کیا ہے ستیش نے جو وہ مجھے بتانے سے تمھیں منع کر رہا تھا؟''

اب بھلا میں مانسی کو کیا بتاتا؟ اسے آج تک تو 'آئی لو یو' نہیں بول پایا، پھر اتنی چھچھوری بات کیسے بتاتا؟

''ارے چھوڑو یار اب، جو اس نے کیا ہے وہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔''

مانسی نے ضد پکڑ لی، ''ارے اب بتا بھی دو، اتنی گندی بات بھی نہیں ہوگی جو بتانے میں اتنا شرما رہے ہو۔''

میں اس کی ضد کے آگے پست پڑ گیا۔ سب کچھ بتا دیا۔ پوری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ارے یار یہ انجانے میں سوتے ہوئے ہو گیا ہوگا، اور تم دونوں لڑکے ہو، پھر اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟''

اتنی سنجیدہ بات کو اتنا ہلکا لینے پر میں جیسے چڑھ ہی تو گیا تھا۔ ''مانسی تم اسے جتنی چھوٹی بات سمجھ رہی ہو، یہ اتنی چھوٹی نہیں ہے۔ اور یہ سوتے میں 'انجانے' والی بات نہیں تھی، میں نے اسے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے چال چلن اچھے نہیں ہیں یا پھر وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔''

مانسی نے میری دلیل کو خارج کرتے ہوئے کہا، ''یہ سب تمھارے دماغ کا وہم ہے۔ اب یہ سب چھوڑو، ستیش کو معاف کر دو۔''

میں جانتا تھا کہ مانسی سے بحث بیکار ہے، اس لیے چار و ناچار بحث ختم کرنے ہی میں عافیت تھی۔ میں نے ستیش کو معاف تو کر دیا لیکن اس دن کے بعد میں نے اسے کبھی اپنے پاس نہیں سلایا، پتہ نہیں کیوں مجھے اب اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔

دسویں پاس ہونے کے بعد ستیش کے گھر والوں نے اس کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالاں کہ اس کی عمر ابھی شادی کی نہیں ہوئی تھی لیکن گاؤں میں اکثر اس طرح کی کم عمری کی شادیاں عام بات تھی۔ لیکن اس خبر نے ستیش پر جیسے بجلی گرا دی۔ اس نے سب سے پہلے میرے پاس آکر اپنا احتجاج درج کرایا۔ مجھ سے اس نے پوری بات شیئر کی، پھر بولا، ''یار تیرے پاس کوئی ترکیب ہے جس سے میری شادی رک جائے؟'' میں خود مانتا تھا کہ ستیش کے گھر والوں کا فیصلہ غلط تھا لیکن میرے پاس اسے روکنے کی بھی کوئی ترکیب نہیں تھی۔ پھر یوں ہی میرے منھ سے نکل گیا، ''لیکن مجھے یہ بتا کہ تو شادی سے اتنا کیوں گھبرا رہا ہے؟''

ستیش نے تڑپ کر میری طرف دیکھا، ''یار تجھے کیسے بتاؤں کہ مجھے لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔''

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ''تو کیا کسی بھینس سے شادی کرے گا، یا سنیاسی بنے گا۔''
ستیش نے میری بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی، وہ جھنجھلا گیا تھا۔ ''تیرے پاس کوئی ترکیب ہے تو بتا ورنہ رہنے دے۔ یہاں میں مرا جا رہا ہوں اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔''
وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا لیکن مجھے اس کی بے چینی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر ستیش شادی سے اتنا گھبرا کیوں رہا ہے جب کہ اس کی عمر کا کوئی بھی لڑکا شادی کو ایک تفریح یا جشن سمجھ کر خوشی خوشی تیار ہو جاتا ہے۔
شام کو ستیش پھر میرے پاس آیا اور بولا، ''بھائی گھر والے تو شادی نہ کرنے کے نام پر مجھے کھانے کو دوڑتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟''
مجھے اب یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ لگنے لگا۔ اس کا منھ سوجا ہوا تھا اور آنکھیں دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ضرور آنسوؤں میں نہا کر آیا ہوگا۔
''ستیش شانت رہ۔ کچھ نہیں ہوا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
ستیش نے گھبرائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ نہیں بولا۔ مجھے لگا کہ میری باتوں نے اسے شانت کر دیا ہے لیکن یہ میری غلطی تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک اس نے میری طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھا، ''یار، آج میں تیرے پاس سو جاؤں؟ دیکھ منع مت کرنا پلیز۔''
اس کی نظروں میں اتھاہ مایوسی اور بے بسی تھی۔ میں انکار نہ کر سکا۔ رات کو میرے ساتھ ہی اس نے کھانا کھایا اور میرے پاس چھت پر ہی لیٹ گیا۔ اس کے ماں باپ بلانے آئے تھے لیکن اس نے میرے پاس سونے کی ضد لگا دی۔ وہ واپس چلے گئے۔
آدھی رات کو ستیش نے مجھے سوتے سے جگا دیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے جسم کی زبان کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ ''یار، ایک بات بتا، کیا ہم دونوں زندگی بھر کے لیے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ لڑکوں کی آپس میں شادی ہو جایا کرے؟ کیوں صرف لڑکیاں ہی لڑکوں سے شادی کر سکتی ہیں؟ یار ہم دونوں دوست ہیں اور ایک دوسرے کو جانتے سمجھتے ہیں تو ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ ہم ساتھ رہ سکیں؟''
میری آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں، میں اب بھی اونگھ رہا تھا۔ اس کی باتیں اس کے دماغ کا فتور محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے پھر سے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا، ''بھائی تو مان یا نہ مان

لیکن اب تو پورا پاگل ہوگیا ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے، اس لیے پلیز مجھے سونے دے۔''

لیکن نہ تو وہ سویا اور نہ اس نے بولنا بند کیا۔ ''یار میں سچ کہتا ہوں کہ تجھے پریشان نہیں کروں گا، چل ہم دونوں یہاں سے کہیں دور بھاگ چلتے ہیں۔'' ستیش اس کے بعد بھی جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میں نے نیند کی آغوش میں پناہ لے لی تھی۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو ستیش جا چکا تھا۔

مجھے تھوڑا سکون محسوس ہوا کہ اچھا ہوا میرے اٹھنے سے پہلے چلا گیا ورنہ اٹھتے ہی اس کی بک بک سننی پڑتی۔ تقریباً آٹھ نو بجے کے درمیان ستیش کی ماں میرے گھر آئی اور ستیش کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انھیں بتادیا کہ وہ میرے اٹھنے سے قبل ہی چلا گیا تھا۔

اب ستیش کو پورے محلے میں تلاش کیا جانے لگا، شام تک اسی طرح اسے تلاش کیا جاتا رہا ہے۔ اچانک شور اٹھا کہ گاؤں کے باہر تالاب کے پاس ایک لاش پڑی ہے۔ پتہ نہیں وہ لاش کس کی تھی؟ ستیش کی یا میری؟

مریض کا جسم بیڈ پر شانت ہو چکا تھا۔ Electro Cardiogram پر دل کی دھڑکنیں اعتدال میں آنے کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ نرسوں اور وارڈ بوائز نے مریض کے جسم پر اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی، ڈاکٹر نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے اور ایک لمبی سانس چھوڑی۔

- 16 -

رات کے تین بج رہے ہیں اور میں کھڑکی پاس صوفے پر لیٹا ڈھلتی ہوئی رات کا اونگھتا چاند دیکھ رہا ہوں۔ پتہ نہیں چاند مجھ سے کتنے فاصلے پر تھا، لیکن لاہور اور دہلی کے درمیان کی صدیوں کی مسافت سے کم ہی ہوگا۔ رات کے اس آخری پہر میں سب کچھ کتنا پُرسکون، خاموش اور مقدس سا ہوجاتا ہے کہ دل میں ایک تیز خواہش کی ہوک اٹھتی ہے کہ کاش کوئی گناہ سرزد ہوجائے۔ کتنا آزاد، کتنا خودمختار لمحہ ہے جو برسوں پرانی تقسیم اور اٹاری بارڈر پر اپنا تسلط جمانے لگا ہے۔ ہمارا یوں اچانک ایک دن گھومتے پھرتے روبرو ہوجانا، سوچتا ہوں اگر میں اس دن عین اس وقت جنتر منتر میں نہ ہوتا، کہیں اور ہوتا، اگر میں وہاں تمھارے جانے کے بعد آتا یا تمھارے آنے سے پہلے نکل گیا ہوتا، بس ایک اس مخصوص لمحے میں نہ ہوتا تو آج ہماری زندگیاں کتنی مختلف ہوتیں۔ میرا کلچرل ایکسچینج پروگرام کے تحت دلّی آنا اور تمھارا یوں اس جگہ پہنچ جانا محض اتفاق تو نہ تھا۔ مجھے یاد ہے، خاکی رنگ کے کرتے میں تم کس طرح چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے؛ ''کون سا قانون سب سے بدتر؟ تین سوستر، تین سوستر۔''

احتجاج کے بعد جب تم اس گھنے پیپل کے درخت کے سائے میں آنکھیں موندے بیٹھے تھے تو سچ مچ تم مجھے بہت مقدس محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا جیسے سدھارتھ نروان حاصل کے لیے اپنے اندر کی گتھیاں سلجھا رہا ہے اور جیسے میرے اپنے وجود کی گرہیں کھلتی جارہی ہوں۔ میں تمھارے طلسم میں مبہوت کھڑا تمھیں تکے جا رہا تھا۔ جب اچانک تم نے اپنی آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا تو میں پتھر ہوگیا۔ اس ساکت اور بے حس وحرکت پتھر میں تم ہی روح پھونک سکتے تھے۔ تمھاری نظروں میں شناسائی اور قربت کا وہ احساس تھا جس کے

سہارے تمام عمر کاٹی جا سکتی تھی۔ اس لمحے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں تمھیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ جیسے اس لمحے کا نزول ہمیں اکٹھا کرنے کے لیے ہی ہوا تھا۔ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں میں اسی لمحے میں قید ہو کر نہ رہ جاؤں لیکن تمھاری مسکراہٹ نے مجھے آزاد کر دیا اور میں قفس یار میں مقید ہو گیا۔

ایک بار کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب کسی کو دعا یا بد دعا دینا مقصود ہو تو کہنا چاہیے، 'خدا کرے تمھیں عشق ہو جائے'۔ لیکن یہ بات مجھے کبھی ہضم نہیں ہوئی۔ بھلا بیک وقت عشق دعا اور بد دعا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ یہ منطق یہ توجیہہ ایک عرصے تک مجھ پر آشکار نہ ہوئی لیکن اس شام، پیپل کے درخت تلے جب تم نے میرا ہاتھ تھاما تو ٹھیک اسی لمحے اسرار و رمز کے سارے حجاب وا ہو گئے۔ وہ پیاس جو دعا بن کر میرے دل کے نہاں خانوں میں پنپ رہی تھی، اس دن میرے لبوں اور میری آنکھوں میں عشق بن کر ظاہر ہو گئی۔ اس وقت یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ تمھاری جانب یہ بے ساختہ جھکاؤ ہے یا محض چند لمحوں کے جنسی لطف کا تقاضہ ہے یا عمر بھر کے سفر کا عزم؟

تمھارے لمس نے میرے وجود میں بلھے شاہ کا گیت چھیڑ دیا، 'تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا'۔ نارتھ کیمپس کے اس کمرے میں، جہاں ایک گدا، دو کرسیاں، ڈھیر ساری کتابیں اور شراب کی خالی بوتلیں پڑی تھیں، ان کے درمیان تم مجھے اپنی بانہوں میں لے کر اپنے ہونٹوں کی امرت کسی حاتم طائی کی طرح مجھ پر لٹا رہے تھے۔ تمھارے نرم ہونٹ، تمھاری لعاب دار زبان، گہری گرم سانسیں، جسم پر بہتا پسینہ مجھے اس سرد شام میں عجیب لذت کا احساس دلا رہے تھے۔ تمھاری پیشانی سے اُبھرنے والی پسینے کی لکیر کا تعاقب کرنے کے لیے جب میری زبان تمھاری مضبوط گردن سے ہوتے ہوئے سینے تک پہنچی، میرے ہونٹ بے ساختہ اس سے کھیلنے لگے اور تم نے شدت جذبات سے کراہنا شروع کر دیا۔ ایک اجنبی سی شناسائی کے سبب ہماری ذات کے سب دریچے ایک دوسرے پر بغیر کسی پرمٹ، کسی ویزا کے مہر بند لفافے کی طرح کھلتے چلے جا رہے تھے۔

رات کا ایسا ہی وہ آخری پہر تھا اور تم مجھے یقین اور بے یقینی کے عالم میں بار بار ٹٹول رہے تھے، چھو رہے تھے جیسے میں کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں بلکہ تمھارے تخیل کی تخلیق یا پھر کوئی واہمہ ہوں۔ میرے وجود کا ہر حصہ تمھاری موجودگی کی گواہی دے رہا تھا۔ بہتر ہوتا، اگر اس لمحے میں سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلتا، بالکل ویسے ہی، ننگ دھڑنگ، عریاں جذبات کے ساتھ دلّی کی

دھند میں کھو جاتا، پھر شاید کسی کو میرا پتہ، میرا سراغ نہ ملتا، خود مجھے بھی نہیں۔

مجھے اس رات بھی اندازہ تھا کہ ہمارے تعلق کو کوئی معنی دینا کتنا نامناسب، کتنا ناممکن اور کتنا غیر حقیقی تھا۔ بھلا سرِ راہ ایسی محبتیں کہاں ہوا کرتی ہیں؟ جو کچھ ہم نے محسوس کیا، وہ سب محض باہمی جسمانی تقاضوں کا نتیجہ بھی تو ہوسکتا تھا۔ اور پھر میں مسلمان اور تم ہندو۔ میں پاکستانی اور تم ہندوستانی۔ ہماری زندگیاں کوئی فلم تھوڑی ہی ہیں جن میں کم از کم وصل یار کی امید ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ ہم دونوں بالفرض اس رات کے سنجوگ کو اگر محبت کا جامہ پہنا بھی دیتے تو بھی اس وصال کو حاصل کرنے کے لیے کتنوں سے لڑتے، کب تک لڑتے؟ ہم تو وہ لوگ تھے جنھیں ہماری اپنی ہی زمین گود لینے کو تیار نہ تھی۔ ہمارے جوڑے کو تو طوفان نوح کے وقت بھی کشتی سے یہ کہہ کر اتار دیا گیا تھا کہ ہم افزائش نسل سے بالاتر تھے۔ ہمارے تعلق کو بانجھ کہنے والے بھلا ہماری محبت کو کیسے سمجھتے، کیسے منظور کر لیتے؟

اگست کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ گلیوں بازاروں میں جھنڈیاں اور بلے خریدنے والوں کی بھیڑ اُمنڈی پڑی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آیا ہم سب کو واقعی پاکستان بننے کی اتنی خوشی ہے یا یہ بھی باقی تہواروں اور قومی دنوں کی طرح فقط یوم نمائش ہے جہاں جذبے سے زیادہ دکھاوے کو ترجیح دی جاتی ہے، جہاں انسانی جذبات کی نہیں، سیاسی مفادات کی جنگ لڑی جاتی ہے۔ میں اگر پاکستان کا جھنڈا گھر کی چھت پر یا گاڑی یا موٹر سائیکل پر لگا لوں، فیس بک پر پروفائل تصویر بدل دوں، منھ پر سبز رنگ چڑھا کر لاہور کے مال روڈ پر سائلنسر نکال کر چنگھاڑتی ہوئی موٹر سائیکل پر نعرے لگاتا نکل جاؤں تو سب مجھے کتنا بڑا محب وطن سمجھیں گے۔ لیکن اگر میں اس آزادی کے پس منظر میں لاکھوں لاشیں، عصمت دریاں، قربانیاں اور ہجرت کی اذیتوں کا ذکر کروں جس کا شکار سرحد کے دونوں طرف کے باسی ہوئے تھے اور اپنے بزرگوں کی سیاسی سمجھ بوجھ پر سوال اٹھاؤں تو مجھے فوراً 'را کا ایجنٹ' کہہ دیا جائے گا۔

سوچتا ہوں، میری دادی آج زندہ ہوتیں تو کیا انھیں بھی غدار وطن کہا جاتا؟ وہ عورت جس نے اپنی بے دخلی کو ہجرت سمجھ کر، جموں سے لاہور تک کا طویل سفر اپنے پاؤں کے سہارے کیا تھا، شاید پاکستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی سجدۂ شکر بھی ادا کیا ہوگا، اس عورت کو بھی یہ تقسیم کچھ زیادہ پسند نہ تھی۔ دادی کی جموں میں بڑی سادہ سی زندگی تھی۔ جو نیا ملک تشکیل پا رہا تھا اور

سرحدوں اور دلوں کا جو جوڑ توڑ ہو رہا تھا، وہ ان سب سے لاتعلق تھیں۔ انھیں لگتا تھا کہ ان سیاسی چیزوں سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ تو محض ایک عام سی، سادہ سی عورت تھیں۔

بیچاری میری دادی یہ نہیں جانتی تھیں کہ عام آدمی ہی خاص لوگوں کی شکایت کا شکار ہوتا ہے۔ جب اگست کی ایک اندھیری رات میں گٹھری میں چند کپڑے باندھے، اپنی ایک شیر خوار بچی کو سینے سے لگائے اپنا بھرا پورا گھر انھیں چھوڑنا پڑا تب شاید انھیں یہ بات سمجھ میں آئی ہوگی۔ مجھے یاد ہے دادی کو مرتے دم تک لگتا تھا کہ ایک دن وہ اپنے جموں واپس ضرور جائیں گی جہاں ان کا گھر، ان کے کھیت، ان کے پہاڑ، ان کی ندیاں، ان کے چنار سب ان کے منتظر ہوں گے، بالکل ویسے ہی جیسے وہ ان کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ ان کے لیے جموں میں وقت تھم سا گیا تھا۔

گو کہ انھوں نے بے وطنی کے سوا کوئی مصیبت نہیں جھیلی تھی مگر پھر بھی اگست انھیں ہمیشہ اداس کر دیا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے، بہت سال پہلے جب میں چھوٹا سا تھا اور دادی ہمیشہ کی طرح جموں اور سری نگر کے قصے کہانیاں بڑی رغبت سے سنا رہی تھیں، اچانک بولیں: ''بابے نے ونڈ پا کر چنگا نئیں کیتا'' (جناح نے تقسیم کروا کر اچھا کام نہیں کیا)۔ مجھے ان کی وہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کیوں کہ ہمیں تو اسکول میں یہی پڑھایا جاتا تھا کہ ۱۹۴۷ میں جو کچھ ہوا، وہ مسلمانوں کے لیے بہتر تھا۔ اور یہ بھی کہ جناح ہم سب کے قائداعظم ہیں جن سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ میں حیران تھا کہ دادی جناح کے متعلق ایسا کیسے کہہ سکتی ہیں۔

جب میں نے اس بات پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ نظریں آسمان کی طرف یوں اٹھا لیں جیسے کوئی دعا کر رہی ہوں۔ پھر انھوں نے اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے میری جانب دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان آنسوؤں میں بے بسی، بے وطنی اور بے سروسامانی کا وہ کرب تھا جو اگر کسی پہاڑ پر پڑتا تو وہ شاید ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ دادی نے جموں تو چھوڑ دیا تھا، مگر جموں نے دادی کو نہیں چھوڑا تھا۔ آج پیچھے مڑ کر جب اس واقعے کے بارے میں سوچتا ہوں تو سمجھ آتی ہے کہ یہ محض سرحدوں کی تقسیم نہیں تھی بلکہ انسانی وجود کا بٹوارہ تھا۔ جس جس انسان نے سرحد کے دوسری طرف سفر کیا، وہ اپنے وجود کا ایک حصہ پیچھے چھوڑتا چلا گیا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ دادی کی روح ابھی بھی کہیں جموں کے گلی کوچوں میں بھٹک رہی ہوگی۔

سوچ رہا ہوں اس سال ۱۴ اگست کو دادی کی قبر پر جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ ہم

جہاں سے آئے تھے، آخر وہاں واپسی کے راستے ہم پر کیوں بند کر دیے گئے؟ ہم وہاں رہ جاتے تو کیا ہوتا؟ اور اب جو آ گئے ہیں تو کیا ہوا ہے؟ کیا یہ واقعی 'پاک لوگوں' کی سرزمین ہے؟ کیا یہاں بغیر کسی قسم کی تفریق کے ہر انسان کو جینے اور زندگی گزارنے کے یکساں حقوق حاصل ہیں؟ کیا یہاں رنگ و نسل کی بنیاد پر لوگوں کا قتل عام نہیں ہوتا؟ کتنے سارے سوال ہیں جو میں دادی سے پوچھنا چاہتا ہوں لیکن وہ بیچاری کیسے ان کا جواب دے پائیں گی، وہ تو منوں مٹی تلے ابدی نیند سو رہی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو شاید اس ملک کے حالات دیکھ کر ایک بار پھر مر جاتیں۔

مجھے لگتا ہے کہ ہماری محبت بھی میری دادی کی نا آسودہ خواہشوں کا نتیجہ ہے۔ جو کام وہ ۱۹۴۷ کے بعد اس سرحد کو پار کر کے نہیں کر پائیں، وہ اب ان کا پوتا کرے گا، تمھارے لیے۔

وہ کتنی حسین صبح تھی۔ دھند چھٹ چکی تھی اور سورج کی نرم روشنی گزشتہ رات کے نشے کی مانند رفتہ رفتہ چہار سو پھیل رہی تھی۔ وہ نرم دھوپ تمھارے دونوں شانوں پر یوں براجمان تھی، گویا اپنے گرم بوسوں سے تمھیں صبح بخیر کہہ رہی ہو۔ ان بے شمار بوسوں میں ایک بوسہ میرا بھی تھا۔ تمھارے الجھے بکھرے بالوں سے مجھے عشق سا ہو گیا تھا اور جب میں ان کو سہلانے لگا تو تم نے مسکراتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنے سینے پر گرا لیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی اور نمی بھی۔

تمھیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ یہ تمھاری قربت کا احساس ہی ہے جو میرے جینے کی سب وجوہات میں افضل ترین ہے۔ اور یہ بھی مت سمجھنا کہ یہ احساس محض جسمانی سنجوگ کا نتیجہ ہے۔ یہ تو ان لاتعداد باتوں، ملاقاتوں، کہانیوں، آنسوؤں اور قہقہوں کی بدولت ہے جس میں ہم دونوں نے ایک دوجے کو مکمل دیانت داری اور خلوص سے چاہا تھا۔ اتنی ایمان داری کہ ہم ایک دوجے کے سامنے بالکل عریاں تھے اور ہمارے مابین مشترکہ اعتماد اور بھروسے کی وہ شفاف چادر تنی ہوئی تھی جس کے آر پار کسی اماوس کی رات میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ کسی سے محبت ہو تو آپ دل بانٹ لیتے ہیں، جذبات بانٹ لیتے ہیں، روح کی بھی تقسیم ہو جایا کرتی ہے، مگر تم نے تو میرا پاگل پن بھی بانٹ لیا تھا۔ تم سے مل کر احساس ہوا کہ میں مختلف نہیں ہوں، میرے سارے تضادات ہوا ہو گئے جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھے۔

کتنی عجیب بات ہے نا کہ جس محبت کا وجود ازل سے موجود تھا، اسے ہر زمانے میں نظر انداز کیا گیا۔ قربت کے تعلق کی لازمی شرط افزائش نسل کو ٹھہرایا گیا اور یوں مرد اور عورت کے سنجوگ کو ہی محبت کا نام دے کر، کبھی ہیر رانجھا، کبھی سسی پنّو، کبھی سوہنی مہیوال اور کبھی لیلیٰ مجنوں کہہ کر انسانی تاریخ کا حصہ بنا دیا گیا۔ جب بھی محبت کی پاکیزگی اور سچائی کی بات ہوتی تو انھیں کو مثال بنا کر پیش کیا جاتا۔ آخر ان سب میں ہم دونوں کہاں تھے، بلکہ 'ہم جیسے' کہاں تھے؟ ایسا لگتا ہے جیسے ہماری محبتیں کسی نامعلوم خطے میں واقع گمنام جزیروں کی سی ہیں جنھیں اٹلس پر ظاہر کرنا کبھی ضروری ہی نہیں سمجھا گیا۔ اور اگر کبھی کہیں غلطی سے بھی ایسے کوئی دو نام جڑتے، مثلاً کہیں کسی رومی کا کسی شمس کے ساتھ، کسی شاہ حسین کا کسی مادھولال کے ساتھ، تو اسے عشق حقیقی کے کھاتے میں ڈال کر ان محبتوں کی اصل شناخت ہی چھین لی جاتی۔

ہم چھوٹے تھے تو کتنا ڈرتے تھے، ہر چیز سے۔ ڈرتے تھے کہ ہماری حقیقت کسی پر ظاہر نہ ہو جائے۔ ہر وقت خوف زدہ رہتے ہیں، ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ہمیں دھتکار نہ دیا جائے۔ اس وقت اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں تھے بلکہ ہمارے آس پاس ہم جیسے بہت سارے موجود ہیں اور ہر دور میں رہے ہیں تو کتنا حوصلہ ملتا۔ اتنے سال جو ہم نے خود سے اور خدا سے لڑتے ہوئے گزارے ہیں، وہ شاید اپنی ذات کی تکمیل میں خرچ ہوتے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی کہانی ضرور لکھیں گے۔

آج ویزہ اپلائی کیے ہوئے پورے دو مہینے ہو گئے مگر ابھی تک جواب نہیں آیا۔ میرے پاس اس انتظار کا کوئی متبادل بھی تو نہیں ہے۔ انتظار کی کوفت بھی کیا عجیب چیز ہے، ایک طرف جان بخشی کی امید ہوتی ہے تو دوسری طرف مصلوب کیے جانے کی اذیت کا خوف۔ ہر بار جب میں ویزا کے لیے درخواست جمع کرتا ہوں تو اسی وقت سے گنتی شروع ہو جاتی ہے۔ ویزا قبول یا رد ہونے کی کشمکش ایک عذاب بن کر دن رات میرے سر پر سوار رہتی ہے، جان دینا شاید اس سے زیادہ آسان کام ہے۔ لیکن میرے اس انتظار سے دنیا کا کام تو رکنے سے رہا، دنیا تو جاری رہتی ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے کسی دن واہگہ بارڈر پہنچ جاؤں۔ فوجیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں کہ یا تو وہ مجھے گولی مار دیں یا مجھے جانے دیں۔ کئی بار دل کرتا ہے کہ وہ مشکل فاصلہ میں خود ہی طے کر لوں جس کا خدشہ ہمیشہ سے ہمارے دلوں میں موجود ہے مگر شاید پہل کرنے سے ہم دونوں ہچکچاتے ہیں۔ تمھیں آزاد کر دوں یا یوں کہو کہ میں خود آزاد ہو جاؤں۔ پھر ہمارا ایک

دوسرے پر کوئی حق، کوئی فرض، کوئی گمان، کوئی بھرم، کچھ بھی نہ رہے۔ ویسے یہ سب کہنے لکھنے میں جتنا آسان لگتا ہے، اتنا ہے نہیں۔

دیکھو، تم سے باتیں کرتے کرتے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا اور دن چڑھ آیا۔ سوچ رہا ہوں، اس خط کو ختم کر کے لفافے میں ڈال کر میز پر رکھ دوں اور پھر واہگہ اٹاری بارڈر کی سمت نکل جاؤں۔ سرحدوں کے درمیان ایک چھوٹا قطعہ ہے جسے No Mans Land کہتے ہیں۔ ہم شاید وہیں کے باسی ہیں، ہم جیسوں کو وہیں کی شہریت ملنی چاہیے۔ چلو، ایسا کیوں نہ کریں کہ ہم اپنی دنیا No Mans Land میں بساتے ہیں کیوں کہ یہ دنیا ہمیں 'Man' تو تسلیم کرتی نہیں، سو اس جگہ پر ہمارا ہی حق ہے۔

- 17 -

اسے ٹھہراؤ پسند نہیں تھا، ذرا بھی نہیں۔ غضب کی بے چین روح تھی۔ ٹھہرنا اس کی فطرت میں ہی شامل نہ تھا۔ اس کے جسم میں اتنی انرجی تھی کہ خود اس سے سنبھل نہ پاتی تھی، وہ بے پناہ پُرکشش تھا۔ اس کی طرف صرف لڑکیاں ہی نہیں بلکہ لڑکے، مرد، عورتیں بچے، ایسا کوئی نہ تھا جو اس کی طرف کھنچ نہ جاتا تھا، گویا وہ ایک مقناطیسی قوت کا مالک ہو۔

ساگر کا رنگ گندمی تھا، قد کاٹھی کے اعتبار سے بھی وہ کسی کو مرعوب کرسکتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ شوخی اور سوالوں سے لبالب رہتی تھیں۔ خیر سوال تو ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر بھی سجے رہتے تھے، جس کے ساتھ ہوتا، اس کے آگے سوالوں کے ڈھیر لگا دیتا۔ وہ اچھا خاصہ پڑھا لکھا بھی تھا، ہر موضوع پر بے تکان گفتگو کرسکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کے سوال دانشورانہ اور دلچسپ ہوتے تھے۔ ویسے حماقت بھرے سوالوں کی بھی اس کے پاس کمی نہ تھی، مثلاً وہ اکثر اپنی گرل فرینڈز سے پوچھ بیٹھتا کہ جب وہ جانتے ہیں کہ وہ ان کا نہیں ہوسکتا تو وہ کیوں اس پر اپنا وقت اور پیسہ برباد کرتی ہیں؟ اب ایسے سوالوں کے بعد کسی کافی شاپ میں بیٹھی کوئی لڑکی اس کی کافی کا اور اپنی آئس کریم کا نہ جانے کیسے بل ادا کر پاتی ہوگی۔

میں ساگر کو اسکول کے وقت سے جانتا تھا۔ وہ اسکول میں بھی سب کا 'ہیرو' تھا اور وہاں بھی وہ میرے بہت قریب تھا، حالاں کہ ہمارے ساتھی طالب علموں سے لے کر ٹیچرس، لیبارٹری اسسٹنٹ، بس ڈرائیور، چوکیدار بھی اس کا نام جپتے تھے۔ وہ بھی کبھی بس ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ کے داؤ پیچ سیکھتا تو کبھی لیبارٹری میں دو کیمیکل ملا کر دھماکے کرتا اور لیبارٹری اسسٹنٹ کے ساتھ مل کر خوب ہنستا۔ ایک بار میں نے دیکھا، اس نے بستہ بھر کر اپنے نئے پرانے کپڑے

اس لیبارٹری اسسٹنٹ کو دے ڈالے، اس کے چھوٹے بھائی کے لیے۔ میرے پوچھنے پر بولا، ارے سب اولڈ فیشن کے تھے۔ اس کے دماغ میں کس وقت کیا چل رہا ہے، اسے پڑھنا اور سمجھنا بہت مشکل تھا، بیس سکنڈ سے زیادہ کہیں ٹکتا ہی نہ تھا۔

ساگر کی زندگی ایک خالی کتاب تھی، بغیر ماں باپ کے لڑکا تھا۔ خالہ خالو نے اسے پالا تھا۔ خوش حال گھرانے سے تھا۔ اس کے بارے میں سب کو کچھ پتہ ہوتا تھا، وہ اتنا بولتا جو تھا۔ لیکن مجھے پتہ نہیں کیوں، وہ ہمیشہ پُراسرار لگا، ایسا لگتا جیسے ان کھلے صفحوں پر کچھ لکھا ہوا ہے جسے میں پڑھ نہیں پا رہا ہوں، شاید سیاہی ایسی استعمال کی گئی تھی جس سے تحریر نظر نہ آئے۔ میں اس سے کہتا بھی تھا کہ تمھیں کسی دن گہرا کھود کر مجھے دیکھنا ہے۔ وہ مسکرا کر کہتا، ''میں ساگر ہوں، سوائے پانی کے کچھ نہ ملے گا... بہتا پانی... صاف وشفاف... جو چاہے دیکھ لو... اپنا عکس بھی... جتنا گہرا کھودو گے اتنا زیادہ پانی ملے گا اور مت بھولنا کہ موتی ساگر میں ہی ملتے ہیں، ندیوں میں نہیں۔'' وہ بغیر رُکے بولتا چلا جاتا اور میں بغیر سمجھے سنتا رہتا۔ ''دیکھنا، میں بھی ساگر میں مل جاؤں گا اور ڈھونڈ نکالوں گا ایک موتی اور اسے اپنی انگوٹھی میں جڑ لوں گا۔''

کتنا شوق تھا اسے انگوٹھیوں کا، ہر انگلی میں ایک انگوٹھی، پتلی، موٹی، اصلی، نقلی؛ خواہ جیسی، انگوٹھا تک خالی نہیں تھا۔ سچ مچ ساگر تھا وہ... پاگل ساگر۔

ایک روز وہ ماتھے پر بڑا سا تلک لگا کر آیا جو اس کے معصوم چہرے کے اعتبار سے بہت بڑا تھا۔ پھر خود ہی ہنس کر بولا، ''اولڈ فیشن لگتا ہے نا؟'' میں نے سوچا، اُفق سے طلوع ہوتا ہوا سورج کبھی اولڈ فیشن ہو سکتا ہے بھلا؟

اس دن وہ میرے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے لگا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اسے لکیروں کو بھی پڑھنا آتا ہے۔ اس کے بقول میرا پیار کوئی اور ہوگا اور شادی میں کسی اور سے کروں گا۔ واقعی اس کو سب معلوم ہے۔ میں نے کہا، لاؤ تمھارا ہاتھ دیکھوں تو اس نے مٹھیاں بھینچ لیں، ''نہیں، میرے ہاتھ میں کوئی لکیر نہیں، سب پانی میں بہہ گئیں۔''

کبھی کبھی مجھے لگتا کہ ساگر ایک سراب سا ہے، جس کو دیکھو اس کا دیوانہ ہوا جاتا ہے، اسے پانے کے لیے بھٹکتا ہے جب کہ وہ درحقیقت ہے ہی نہیں، وہ صرف ایک وہم ہے۔ اس کی ہنسی مجھے اپنے خیالوں سے باہر لے آتی ہے۔ اسے میں اپنے قریب دیکھتا ہوں، بہت قریب۔ اسے جب کالج میں داخلہ لینا تھا تو وہ میرے چکر کاٹتا تھا کہ ہم اور تم ایک ساتھ پڑھیں گے۔ میں

بھی اسے چھیڑتا، کیوں بھائی، کیا ساری عمر میرے پیچھے لگے رہو گے؟ تم ساتھ رہتے ہو تو کوئی لڑکی میرے پاس نہیں آتی۔ اس روز اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا، ''میں تمھارا ہی ہوں، بس خود کو تمھارے لائق بنانے کی کوشش کر رہا ہوں، پھر میں اپنے آپ کو تمھارے سپرد کر دوں گا۔'' اس وقت اس کی یہ باتیں میری سمجھ سے پرے تھیں لیکن دھیرے دھیرے ان باتوں کی گہرائی کو سمجھنے لگا تھا اور یہ بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی قربت مجھے کبھی تکلیف ضرور پہنچائے گی لیکن مجھے منظور تھا۔

ہم کالج ساتھ ہی جاتے، وہاں ڈھیروں لڑکیاں اس کے آگے پیچھے منڈلاتیں اور وہ کسی سے اپنے نوٹس بنواتا تو کسی سے اپنی بائک کا پٹرول بھرواتا اور سب سے ایک ہی بات کہتا، ''تمھاری نیکی مجھ پر اُدھار۔'' معلوم نہیں کتنی لڑکیاں اس اُدھار کے اُترنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا بھی کہ یہ کیا طریقہ ہے، کیوں ان بچیوں کے دل کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہو اور شاید اپنے دل کے ساتھ بھی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہتا، ''دیکھ کہیں کچھ دھڑک رہا ہے کیا؟ ارے پاگل اس سینے میں دل ہی نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہے؟'' کبھی کبھی میں اس پر غصہ ہو جاتا۔

''کڈنی ہے۔ ایک ایکسٹرا کڈنی... بھگوان نہ کرے تمھیں اس کی کبھی ضرورت پڑی تو دے دوں گا۔ ایک دم مفت۔ تم نے مجھے کل جو برگر کھلایا تھا، وہ وصول سمجھنا۔''

کبھی کبھی مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا لگتا کہ وہ مینٹل ہے، ذہنی طور پر بیمار ہے، نارمل تو بالکل نظر نہیں آتا۔ حالاں کہ وہ پڑھنے میں بہت اچھا تھا اور بہترین فن کار بھی۔ وہ بہت اچھی پینٹنگ کرتا تھا اور ہاں اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی، وہ گاتا بھی بہت اچھا تھا۔ اس کے کمرے میں ہمیشہ میوزک چلتا رہتا، دن رات۔ مجھے اس کی پسند کبھی سمجھ نہیں آئی، کبھی وہ غزل سنتا اور کہتا غلام علی پر عاشق ہو گیا ہوں، سچ مچ۔ کبھی وہ جمی ہونڈرکس یا جم موریسن کو سنتا تو کہتا یار ان میں کیا نشہ ہے، کسی دن کوئی نشہ کر کے میں بھی دیکھوں گا۔ میں ڈر جاتا۔ کبھی وہ صوفیانہ موسیقی پر جھومتا تو کبھی پنڈت روی شنکر کو سنتے ہوئے پینٹ کرتا رہتا۔ ایک پہیلی تھا وہ۔

ہاں، اس کی پینٹنگ ایک جیسی ہوتی تھیں۔ وہ صرف ندیاں پینٹ کرتا تھا، مختلف قسم کی ندیاں، الگ الگ وقت کے منظر۔ کہتا تھا کہ یہ سب میرے سیلف پورٹریٹ ہیں۔ میں خود اتنا اسمارٹ ہوں تو کچھ اور کیوں بناؤں؟ میں اس کا منھ تاکتا رہتا اور وہ مجھے اُکساتا رہتا تھا۔

''تم نارسسٹ ہو۔'' ایک دن میں نے کہہ ہی دیا۔

وہ گلا پھاڑ کر ہنسا تھا۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ وہ واقعی اسمارٹ ہے، ایک خوب صورت ندی کی طرح... صاف وشفاف، ایک بہت گہری اور پُرسکون ندی۔

ایک دن ہم شہر کے باہر دور ایک مندر گئے، اسے بھگوان پر کوئی خاص ایمان نہ تھا، صرف ایک مندر ندی کے کنارے تھے، سو وہ اس کی پینٹنگ کے لیے یہاں آیا تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہم سورج کو غروب ہوتا دیکھتے رہے جس کا عکس ندی پر بڑا حسین لگ رہا تھا۔ وہ اچانک بولا، ''تم اگر سورج ہوتے تو دیکھو ہر شام مجھ میں ڈھل جاتے، مجھ میں جذب ہو جاتے نا؟'' اس کے اس طرح کے اچانک سوالوں کی مجھے عادت تھی مگر پھر بھی میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اس روز میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں اسے مجھ سے پیار تو نہیں ہو گیا؟ وہ پھر بولا، ''مجھے لگتا ہے کہ مجھے ندی نام کی کسی لڑکی سے عشق ہوگا، کیوں کہ ندی ساگر میں ہی تو جا ملتی ہے۔ وہاں اسے پناہ ملتی ہے، وہیں مکتی ملتی ہے۔''

''تجھے کبھی کسی سے عشق نہیں ہوسکتا ساگر، کسی سے بھی نہیں۔ جب مجھ سے نہیں ہوا تو کسی اور سے کیا ہوگا؟''

''اچھا!'' وہ اپنی جگہ سے ایک ذرا کھسکتا ہوا بولا، ''ایسا کیا خاص ہے تم میں؟''

میں بھی اس کے قریب کھسک آیا، ''کیوں؟ اچھا خاصا نظر آتا ہوں، گورا رنگ ہے، آنکھیں نیلی نہیں تو پیلی بھی نہیں ہیں۔ بال گھنے، بکھرے، اور ہاں مسکراہٹ کے ساتھ تیرا والا پسندیدہ ڈمپل... اور کیا چاہیے؟''

وہ مسکرایا، ''نارسسٹ کہیں کے۔'' پھر ہم دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔

جب وہ اس طرح ہنستا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ڈھیر سا پیار نظر آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، تھوڑا بہت نہیں بلکہ بے انتہا، اتنا کرتا ہے جتنا کوئی پاگل کسی آوارہ ندی سے کرسکتا ہے، بے نیاز سمندر سے کرسکتا ہے۔ ندی جو باؤلی ہو کر بہتی ہے اس سمند کی طرف، اس میں سما جانے کے لیے، اس میں سما کر مٹ جانے کے لیے، اپنی مٹھاس کھو کر نمکین ہو جانے کے لیے، اپنی آزادی فراموش کر کے ٹھہر جانے کے لیے۔

کچھ ایسے ہی خیالوں نے مجھے اس روز ہمت دی، جب ہم فلم دیکھ کر لوٹ رہے تھے۔ اس نے بائک میں مجھے زور سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کا لمس مجھے بے چین کر رہا تھا۔ ایسا نہیں کہ اس نے مجھے کبھی چھوا نہ تھا مگر اس دن شاید میرا دل میرے قابو میں ہی نہ تھا۔ میں نے بائک اس کے

گھر کے سامنے روکی، اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا، ''شکریہ۔ تمھاری وجہ سے میرا دن خوب صورت گزرا۔'' وہ جانے کے لیے پلٹا تو میں نے اس کی انگلیوں کو اپنی انگلیوں میں پھنسا کر گرفت مضبوط کر دی۔

''ابے اب کیا؟ جاؤ رات ہوگئی ہے۔ سب فکر کرتے ہوں گے گھر میں۔''

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور بغیر کچھ سوچے کہہ گیا، ''تمھارے دن، تمھاری راتیں، تمھاری پوری زندگی میں خوب صورت بنا دینا چاہتا ہوں۔ جینا چاہتا ہوں تمھارے ساتھ تمھارا ہو کر... ساگر میں تم سے بے انتہا پیار کرتا ہوں۔''

وہ الجھی نگاہوں سے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی انگلیاں میری گرفت سے آزاد کیں اور بولا، ''ایک دن خوب صورت گزرا ہے جناب، یہ خوب صورتی اور تازگی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ جاؤ اب... آہستہ بائک چلانا اور گھر پہنچ کر وہاٹس ایپ کر دینا۔'' اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور چلا گیا۔ میں نے بدحواسی میں بائک دوڑا دی۔ وہ رات شاید کچھ زیادہ ہی اندھیری تھی، یا میری آنکھیں شبنم کے سبب دھندلا گئی تھیں۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کیسے میری بائک فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ میرے سر پر سات ٹانکے لگے تھے، البتہ کوئی اندرونی چوٹ نہیں آئی تھی، سو اگلی صبح میں گھر بھی لوٹ آیا۔

دو روز سے ساگر کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا، نہ وہ ملنے آیا اور نہ اس نے میری کوئی خبر لی۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ تیسرے دن وہ آیا تو میں نے طنز کیا، ''بڑی جلدی فرصت مل گئی؟''

اس نے اپنی جانی پہچانی ادا سے جواب دیا، ''ارے تمھارا سر جس فٹ پاتھ سے ٹکرایا تھا، اس کی مرمت کرنے میں ذرا مصروف تھا۔'' میں اس کا سوجا ہوا چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا اور سمجھنے کی ناکام کوششیں کرتا رہا۔ جب تک میرے ٹانکے نہیں کھلے، وہ روز ملنے آتا رہا، خوب بولتا، اِدھر اُدھر کی ہانکتا رہتا۔ اس رات کا ذکر ہم نے پھر کبھی نہیں کیا مگر وہ مجھے کچھ تڑخا سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید میں نے اپنے پیار کا اظہار کر کے غلطی کر دی تھی۔

خیر، وقت کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اس امید کے ساتھ میں نے خود کو ڈھارس بندھائی۔ نوکری ملنے کے ساتھ ہی گھر میں سب لوگ میری شادی پر زور دینے لگے۔ خاندان کے لیے اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے آخر کار میں اس پر راضی بھی ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب ساگر کے مایا جال سے مجھے نکلنا ہی پڑے گا۔

اس رات اچانک فون کی گھنٹی بجی اور ادھر سے ساگر کی آواز سنائی دی۔ ''سنو آخر کار مجھے عشق ہو ہی گیا ساگر نام کے لڑکے سے۔ تم سن رہے ہو نا؟''

''ہاں سن رہا ہوں اور جانتا ہوں۔ گووا کا سمندری ساحل ہے ہی اتنا خوب صورت۔ بھلا کسے عشق نہیں ہوگا۔''

''شٹ! تم مجھے زیادہ ہی سمجھنے لگے ہو اور یہ بات مجھے ذرا پسند نہیں۔ اچھا کیا تم نے شادی کر لی، میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ اب اس کو سمجھو اور جانو جو تمھارے پلّے بندھی ہے...'' اور اس نے فون رکھ دیا۔

میری شادی کے بعد یہ پہلی رات تھی اور میں اس پاگل ساگر سے بات کر رہا تھا... مگر شاید آخری بار۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کبھی اس سے کوئی ملاقات نہ کروں گا، کبھی نہیں۔

لیکن ہر بار کی طرح یہ فیصلہ بھی اس نے ہی کیا تھا۔

اگلے دن گووا کے ہوٹل سے فون آیا کہ ساگر اپنے کمرے میں ایک نوٹ چھوڑ گیا ہے۔ ''جا رہا ہوں... مجھے تلاش مت کرنا... کسی ماہی گیر کو یا کسی غوطہ خور کو پریشان مت کرنا... مجھے ساگر کے پریم میں پوری طرح ڈوب جانے دو، اس کی گہرائی ماپنے نکلا ہوں میں۔''

ایک خط میرے نام بھی اس نے چھوڑا تھا۔ اس نے کہا تھا:

''تمھارا نام ندی ہوتا یا سورج، لیکن میں پھر بھی کبھی تم سے پیار نہ کرتا۔ پتہ ہے جس روز میں پیدا ہوا، اسی روز میرے ماں باپ دونوں کی موت ہوگئی۔ ماں ڈیلیوری ٹیبل پر اور پاپا روڈ ایکسیڈنٹ میں۔ خالہ خالو نے سہارا دیا تو بیچارے بے اولاد رہ گئے۔ یہ اتفاق نہیں ہے۔ یہ اشارہ تھا بھگوان کا۔ میں بہت بدقسمت ہوں، منحوس ہوں۔ ہم اگر ایک ہو گئے ہوتے تو تم کبھی خوش نہ رہتے۔ یاد ہے تمھارے ایکسیڈنٹ والی رات؟ تم نے صرف مجھ سے اپنے پیار کا اظہار کیا تھا ...اور دیکھا تھا اس کا نتیجہ؟... لیکن تم فکر نہ کرنا، واپس آؤں گا... تمھارے لیے... ہر جنم میں ساگر ہی بنوں گا، اب ایسا بھی بدقسمت نہیں ہوں میں۔''

روایت ہے...

وہ دیکھتا رہتا تھا اس سبز آنکھوں والے لڑکے کو جو ریت کے گھروندے بناتا اور اسے توڑتا رہتا تھا۔ اسے اس انجام اور عجیب سے لڑکے سے ایک لگاؤ کا احساس ہو گیا تھا جو اکثر سرخ

مفلر باندھے رہتا اور کبھی کبھی سیاہ بھی۔

برسوں سے سمندر کے کنارے رہتے رہتے اس ماہی گیر کو پہلے کبھی ایسا کوئی لڑکا نظر نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں، کہاں سے آیا تھا وہ اس ویران جزیرے میں۔ دیکھنے میں بھلا لگتا تھا مگر کچھ عجیب سا، بے نیاز، خود سے بھی بے پرواہ۔ پتہ نہیں یہاں اسے لہریں بہا کر لائی ہیں یا کسی مچھلی کے پیٹ سے وہ نکلا ہے، ماہی گیر اپنے خیالوں میں بہا چلا جا رہا تھا۔

ہر شام لڑکے کو نہارتے رہنے کی ماہی گیر کو عادت پڑ چکی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے لڑکے کو سمجھنے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔

ایک روز وہ اس لڑکے کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکا بھی اس ماہی گیر کی موجودگی کا جیسے عادی ہو چکا تھا، اس نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا، گھروندہ بناتا رہا توڑنے کے لیے۔

''تم اتنا خوب صورت گھروندہ کیوں بناتے ہو؟ اور یہ سرخ و سیاہ مفلر کیوں بدلتے رہتے ہو؟'' ماہی گیر نے ایک ساتھ کئی سوال داغ دیے۔ شاید اسے ڈر تھا کہ لڑکا اس کے سوالوں پر روک نہ لگا دے۔

گھروندہ بناتے ہوئے لڑکا بغیر اپنا چہرہ اٹھائے ہوئے بولا، ''جب میں گھروندہ بناتا تو عشق کی گرفت میں ہوتا ہوں اور اس وقت یہ سرخ مفلر پہن لیتا ہوں۔ گھر کے بنتے ہی میں سراپا نفرت ہو جاتا ہوں اور سیاہ مفلر پہن لیتا ہوں اور پھر مجھے گھروندا توڑنا اچھا لگتا ہے۔'' اس کی آواز جیسے کسی سنکھ کے اندر سے باہر آئی ہو۔

''تو تمھارے اندر دو شخصیتیں ہیں؛ ایک اچھا، ایک برا۔ آخر کیسے جی لیتے ہو یہ دوہری زندگی؟''

لڑکے نے پہلی دفعہ پلکیں اوپر اٹھائیں۔ سمندر کی گہرائی جیسے ان آنکھوں کے سامنے کم پڑنے لگی ہو اور چہرہ جیسے تراشا ہوا سیپ ہو۔

''تم سے سچ کہا ماہی گیر۔ تھک گیا ہوں اس دوہری زندگی کو جیتے جیتے۔ کیا تم میری ایک زندگی جینا پسند کرو گے؟''

اس سے پہلے کہ ماہی گیر اثبات یا نفی میں جواب دیتا، اس لڑکے نے اس کی گردن میں سیاہ مفلر لپیٹ دیا اور کہا، ''اب اس گھروندے کو تم توڑو... میرے اندر کے برے کو تم جیو۔''

نم آنکھوں کے ساتھ ماہی گیر نے گھروندا توڑ دیا اور سبز آنکھوں والے لڑکے کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔

اس سے پہلے ماہی گیر نے کبھی ایک سیپ میں دو موتی نہ دیکھے تھے اور نہ سنے تھے۔

اب تو یہ معمول سا بن گیا۔ سبز آنکھوں والا لڑکا ساحل سے دور خوب صورت گھروندا بناتا، اسے سمندری لہروں سے بچاتا اور پھر خود ماہی گیر سے توڑ ڈالنے کو کہتا، اور پھر ان دونوں کی آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو نکل آتے۔

سبز آنکھوں والے لڑکے کے ساتھ ایک خوب صورت خوابوں کا گھر بنانے کی خواہش رکھنے والے ماہی گیر کے لیے یہ ایک سزا سے کم نہ تھا مگر پاگل لڑکے سے عشق کی قیمت بھی تو اسے ہی چکانی تھی۔

ماہی گیر اس لڑکے سے کہتا کہ اگر تمھیں گھر توڑنا ہی ہے تو ساحل کے قریب کیوں نہیں بناتے، سمندری لہریں خود اسے بہا لے جائیں گی مگر سبز آنکھوں والے لڑکے نے اس کی ایک نہ سنی، وہ کہتا "تم توہو توڑنے کے لیے، سمندر کی لہر ہی ہو تم۔" اور اس کا یہ سفاک کھیل جاری رہتا۔

ماہی گیر اسے سمجھاتے مناتے تھک سا گیا تھا مگر وہ نہ مانا۔ ماہی گیر نے خود ہی دل ہی دل میں سوچ لیا کہ شاید یہ کسی پہلے پیار کی ناکامی ہو جس نے اسے پاگل بنا دیا ہوگا اور اب اس کے دل میں کسی اور کے پیار کی گنجائش بچی نہ تھی۔ ہاں، مگر وہ ہر شام سمندر کنارے ماہی گیر کا انتظار کرتا رہتا تھا اور اس کی کشتی کنارے لگتے ہی گھروندا بنانا شروع کر دیتا۔

اس شام سورج غروب ہو گیا، ماہی گیر نہیں لوٹا۔ سبز آنکھوں والا لڑکا اس کا انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ آسمان میں تارے نکل آئے مگر کوئی کشتی کنارے نہیں لگی۔

اس روز سمندر ماہی گیر کو نگل گیا تھا؛ کیا پتہ سمندر کی سرکش لہروں نے اسے ڈبو یا یا اس نے خود کو ہی سمندر کے سپرد کر دیا۔

سبز آنکھوں والا لڑکا پہلے ہی سے پاگل تھا، وہ اب بھی ساحل سے دور گھروندے بناتا تھا مگر گھروندے تیار ہوتے ہی ایک لہر جانے کہاں سے سر اٹھاتی اور وہاں تک آتی اور اپنے ساتھ گھروندا بھی لے جاتی اور سبز آنکھوں والے لڑکے کے دو آنسو بھی۔

لوگ کہتے ہیں، اس سے پہلے نہ سمندر اتنا نمکین تھا اور نہ ہی سیپ کے اندر سے دو موتی نکلا کرتے تھے۔

- 18 -

ایک دن امیر المومنین معتصم نے مجھے بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ ایک نقاشی کی ہوئی صدری پہنے ہوئے تھے۔ سونے کا ٹپکہ لگائے تھے اور سرخ جوتا پہنے تھے۔ ان کا رنگ گورا مائل بہ سرخی تھا۔ سرخ داڑھی تھی اور طویل تھی، نیچے سے چوکور تھی۔ اپنی خوب صورت آنکھوں سے انھوں نے میرے سراپے کا جائزہ لیا اور کہا، ''میں تمھارے ساتھ چوگان کھیلنا چاہتا ہوں مگر تمھیں میری زندگی کی قسم ہے کہ تم بھی ایسا ہی لباس جیسا کہ میں پہنے ہوئے ہوں، پہننا پڑے گا۔ میں نے معذرت کی مگر وہ بضد رہے۔ میں نے ان جیسا لباس پہن لیا۔ ایک گھوڑا جس پر سونے کا زین اور دیگر سامان تھا، ان کے لیے لایا گیا۔ وہ سوار ہوئے۔ اب ہم دونوں کھیلنے کے لیے میدان میں اُترے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمھیں کسلمند پاتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ یہ لباس تمھیں پسند نہیں۔ میں نے کہا، جی ہاں واقعہ تو یہی ہے۔ یہ سن کر وہ اُتر پڑے، میرا ہاتھ تھاما اور مجھے ساتھ لیے ہوئے حمام کے حجرے میں آئے۔ مجھ سے کہا، ''میرے کپڑے اُتارو۔'' میں نے کپڑے اتارے، وہ برہنہ ہو گئے۔ پھر مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ میں نے اس کی بجا آوری کی۔ اب ہم دونوں حمام میں داخل ہوئے، ہمارے ساتھ کوئی غلام نہ تھا۔ میں نے ان کا جسم ملا، پھر انھوں نے میرا جسم ملا۔ اگرچہ میں ان سے برابر کہتا رہا کہ آپ ایسا نہ کریں لیکن وہ نہ مانے۔ حمام سے نکلے تو میں نے ان کے کپڑے ان کو دیے اور خود اپنے کپڑے پہن لیے۔ اب پھر انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور چلے۔ اسی طرح ہم ان کے ایوان میں آئے۔ مجھ سے کہا، دو تکیے اور مصلّی لا دو۔ میں نے لا دیے۔ وہ تکیے رکھ کر لیٹ گئے۔ پھر مجھ سے کہا، ایک مصلّی

اور دو تکیے اور لاؤ۔ میں لے آیا۔ مجھ سے کہا، تکیے رکھ کر میرے برابر تم بھی سو جاؤ۔ میں نے قسم کھا کر کہا کہ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ایتاخ الترکی اور اشناس آئے۔ معتصم نے ان سے کہا، اس وقت یہاں سے جاؤ، میں آواز دوں تو آ جانا۔

انھوں نے ایک بار کہا تھا، جب انسان پر خواہش غالب ہوتی ہے، اس کی عقل معطل ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا، یا امیر المومنین! میں چاہتا تھا کہ کاش میری جوانی ہوتی تو میں آپ کی وہ خدمت کر سکتا جو میں چاہتا ہوں۔ کہنے لگے، تم اب بھی اپنی کوشش سے میری خدمت کرتے ہو، لہٰذا تمھاری جوانی اور پیری میں کچھ فرق نہیں۔

رات نیند اچھی نہیں آئی۔ نیند کی گولی کھانا شاید بھول گیا تھا۔ یوں بھی نیند میں رات بھر سپنوں کی ایک انجان بستی میں بھٹکنا ہی تو ہوتا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے اس بستی کا باشندہ رہا ہوں۔ نہ جانے کون سی بستی ہے جہاں کی سڑکیں تقریباً سنسان ہی ہوتی ہیں۔ سڑکوں سے کئی گنا زیادہ گلیاں ملتی ہیں جو اچانک بلاسبب بند ہو جاتی ہیں۔ دروازے سب کھلے ملتے ہیں جس میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتا ہوں۔ اندھیرے بند کمرے ملتے ہیں یا پھر ان کی کھڑکیوں پر دبیز پردے گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ملتا جس سے آگے کا راستہ پوچھ سکوں، البتہ کہیں کہیں اچانک سیڑھیاں ضرور مل جاتی ہیں جو پتہ نہیں کہاں جا کر رک جاتی ہیں، نہ وہاں کوئی چھت ہوتی ہے اور نہ کوئی صحن۔ اترنے کے لیے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو سیڑھیاں غائب ملتی ہیں۔ اونچائی اتنی ہوتی ہے کہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اب کیسے اُترا جائے۔ پھر اچانک محسوس ہوتا ہے کہ یہ سیڑھیاں تو کسی پرانی مقفل عمارت کی سیڑھیاں تھیں، ان پر میں کیسے چڑھ آیا۔ یہ کوئی سیڑھیوں کی اونچی مینار جیسی ہے جو زمین میں بہت نیچے سے اوپر نکلنے کے لیے بنی ہے۔ پھر اچانک محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت پرانے زمانے کا بنا طلسمی مکان ہے جس کی سبھی منزلیں زمین میں نیچے سے اُوپر آنے کے لیے بنی ہیں۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں ضرور کسی طلسم کی گرفت میں ہوں۔ ایک بات ہے کہ زمین کے اندر ہونے کے باوجود ہوا کا احساس قائم رہتا ہے، سانس نہیں گھٹتی۔ ڈر بھی نہیں لگتا کہ یہ سب اتنا سنسان کیوں کر لگ رہا ہے۔ اتنے وسیع پیچیدہ مکان میں لوگ کیسے رہ سکتے ہیں، اور بھلا زمین کے اندر اتنی گہرائی میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن یہ سوال بے کار محض ہے کیوں

کہ کہیں کوئی نظر آتا تو اس سے پوچھ بھی سکتا تھا۔ میں نیچے سے اوپر کی منزل در منزل سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے خود کو تھکا ہوا کم، حیران زیادہ محسوس کرتا ہوں۔ اتنی بڑی عمارت، اتنی منزلیں، اتنی سیڑھیاں، اتنے کمرے لیکن ان میں رہنے والے لوگ کہاں ہیں؟

اسی وقت مجھے ایک بوڑھا آدمی ایک برآمدے میں بیٹھا نظر آتا ہے، عمر مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی لیکن اس کا چہرہ اندھیرے میں ہے اور اپنی آنکھیں اس نے بند کر رکھی ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ کسی مجاہدے میں ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا ٹھیک نہیں ہے، میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ میں ایک چھت کے فرش پر کھڑا ہوں۔ وہاں چاروں طرف لمبے لمبے پتلے مربع نما کھمبے کھڑے نظر آتے ہیں جو ابھی ادھورے ہیں۔ شاید ان کی بالائی منزل بنی ابھی باقی ہے۔ میں وہاں سے لوٹنے لگتا ہوں، مگر اب چھت کے کسی طرف اترنے کے لیے سیڑھی نظر نہیں آتی۔ زمین کے اندر کی سیڑھی نما میناروں والی عمارت بھی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ میں اب اس چھت پر کب تک معلق رہوں گا۔ دن بھی ڈھل چکا ہے۔ میں کہاں، کیسے جاؤں گا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں گھبرا کر وہیں بیٹھ جاتا ہوں۔

نیند کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں دھوپ نکل آئی ہے۔ بہت دیر تک بستر پر ویسا ہی پڑا رہتا ہوں، یوں ہی ایک ٹک چھت کو گھورتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔ دھیرے دھیرے دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نظر جاتی ہے، ساڑھے چھ بج چکے ہیں، سیکنڈ کی سوئی رینگ رہی ہے، باقی دونوں سوئیاں خاموشی سے اپنی اپنی جگہ سے اس کا مسلسل رینگنا دیکھ رہی ہیں۔ سکنڈ کی سوئی کو رینگتا ہوا دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے، مجھے صبح کی چہل قدمی کے لیے جانا ہے، سستی کو لات رسید کر کے اٹھنا ہوگا۔

میرے فلیٹ سے تھوڑی دور پر ہی ایک چھوٹا لیکن خوب صورت پارک ہے۔ میں روز وہاں چار پانچ چکر لگا لیتا ہوں۔ پارک کی چار دیواری کے برابر ایک walk way چہل قدمی کرنے والوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس پر مستطیل نما، سیمنٹ سے ہی بنے کھردرے ٹائلس لگائے گئے ہیں تا کہ بطور خاص بوڑھے لوگ آرام سے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے چہل قدمی کی اپنی روٹین مکمل کر سکیں۔ اکتوبر آ گیا ہے اور ہوا میں اس کی آمد کی مہک اور کھنک محسوس ہونے لگی ہے۔ walk way کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھل آئے ہیں۔ میں اکثر شام کو بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی چار سالہ نواسی کو یہاں سیر کرانے کے لیے لے کر آتا ہوں۔ شام میں پارک میں بچوں، ان کی ممیوں اور ان کی آیاؤں کا اچھا خاصہ مجمع لگا ہوتا

ہے۔ صبح میں زیادہ تر ادھیڑ اور بوڑھے لوگ ہی یہاں ٹہلنے آتے ہیں۔ کچھ جینز، ٹی شرٹ پہنے جوان لڑکیاں بھی آتی ہیں، وہ بوڑھوں سے بچتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ بوڑھے لوگ ان کو صرف کنکھیوں سے دیکھنے پر قناعت کر لیتے ہیں۔ صبح شام پارک میں لگی بنچوں پر کچھ بوڑھے، کچھ ادھیڑ اور کچھ نوجوان جوڑے بھی بیٹھے نظر آتے ہیں اور یہ تقریباً روز کا سلسلہ ہے۔

لگتا ہے مجھے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ علی الصبح چہل قدمی کرنے والے بیشتر بوڑھے جا چکے ہیں۔ ادھیڑ اور نوجوان لوگوں کی چہل قدمی جاری ہے۔ کسی کسی دن لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ میرا یہ پہلا چکر مکمل ہو رہا ہے۔ میں گیٹ کے پاس پہنچ رہا ہوں جہاں سے میں چکر لگانے کا آغاز کرتا ہوں۔ کچھ لوگ ابھی آ رہے ہیں، اندر پہنچ کر وہ لوگ آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے تیزی سے مجھ سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر میں اپنی گھڑی دیکھتا ہوں؛ ٹھیک آٹھ منٹ میں میرا پہلا چکر پورا ہوا ہے۔ پانچ چکر لگانے میں چالیس یا بیالس منٹ لگتے ہیں۔ میرا فلیٹ پارک سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر ہے۔ پارک تک آنے جانے میں مجھے صرف پانچ منٹ لگتے ہیں۔ کُل ۴۵ منٹ میں میری چہل قدمی مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ میری کافی پرانی روٹین ہے۔ عموماً سات بجتے بجتے میں گھر واپس پہنچ جاتا ہوں، حالاں کہ آج تھوڑی دیر ہو گئی ہے اور نیند پوری نہ ہونے سے تھوڑی سستی بھی حاوی ہے۔

گیٹ سے اندر آنے کے بعد میں بائیں طرف سے ٹہلنا شروع کرتا ہوں۔ بیشتر لوگ، بطور خاص بوڑھے لوگ اسی طرف سے اپنی چہل قدمی کا آغاز کرتے ہیں۔ اس طرف تھوڑی دور پر ایک فوارے کا خوب صورت دائرہ نما چبوترا بنا ہوا ہے۔ اکثر تھکے ہوئے کچھ بزرگ اس چبوترے کی منڈیر پر بیٹھ کر سستایا کرتے ہیں۔ اس کا فوارہ اب نہیں چلتا۔ حوض بھی ہمیشہ خشک ہی نظر آتا ہے۔ لیکن اس طرف گلاب کے پھولوں کے پودے مسلسل walk way کے کنارے کنارے قطار بند ہیں جن پر کبھی کبھار سرخ گلاب نظر آ جاتے ہیں۔ اس علاقے میں اکثر بزرگ لوگ ہی ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ ادھر پارک کا ایک گوشہ بھی موجود ہے جس کے بعد کالونی کے مارکیٹ والی طویل سپاٹ دیوار ہے جس پر صابن کا ایک اشتہار بنا ہوا ہے جو کافی دھندلا پڑ چکا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی ادھر کا ایک آدھ چکر لگا لیتا ہوں۔ مرکزی walk way پر جاگنگ کرنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں ادھر کبھی نہیں جاتے۔

لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں زیادہ تر پارک کے walk

way پر دائیں طرف سے ہی جاگنگ کرتے ہیں ورنہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہیں۔ چار چکر لگاتے لگاتے ان جاگنگ کرنے والے لڑکے لڑکیوں سے میرا کئی بار سامنا ہوجاتا ہے۔ کچھ ادھیڑ لوگ یا جوڑے بھی دائیں طرف سے چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ بائیں طرف گلاب والے چبوترے کے پاس walk way کے قریب تقریباً سات بجے وہیل چیئر پر ایک بوڑھے شخص کو اس کا نوکر روز لے کر آتا ہے۔ اس کی وہی جگہ طے ہے... چبوترے کے پاس وہیں walk way کی دوسری طرف گھاس والے میدان میں۔ شام میں اس میدان میں اکثر کچھ لڑکے فٹ بال کھیلتے ہیں۔ صبح میں جب تک میں چکر لگاتا رہتا ہوں، دیکھتا ہوں وہ آدمی ایک موم کے پتلے کی طرح بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی گردن ایک طرف مستقل جھکی ہوئی رہتی ہے۔ اس کا نوکر بھی بغل میں اس کی کرسی تھامے کسی مجسمے کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دونوں بھی اس پارک کی سجاوٹ کا حصہ ہوں۔ شام میں وہ جگہ خالی خالی سی لگتی ہے۔

پارک میں ٹہلنے والے لوگ اسی کالونی کے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، حالاں کہ ان میں بہت سارے اپنی کاروں سے ہی وہاں تک آتے ہیں۔ سبھی اپنے لباس اور چال ڈھال سے خوش حال طبقے کے لگتے ہیں۔ لڑکیاں بھی آج کے فیشن والی نیچی کمر والی جینز یا کیپری اور تنگ قمیص یا ازار بند والی جیکٹ پہنے آتی ہیں۔ لڑکے زیادہ تر شارٹس یا برموڈا اور بغیر آستین والی ٹی شرٹ پہنے ہوتے ہیں۔ ادھیڑ عورت مرد بھی سجے دھجے پہنچتے ہیں۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی شاپنگ مال کے کچھ خریدار بھٹکتے ہوئے ادھر نکل آئے ہیں۔ میں اسی خیال میں غلطاں و پیچاں آگے بڑھ جاتا ہوں لیکن میں اس وقت دہشت زدہ ہوجاتا ہوں جب دو لڑکوں کا جوڑا ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے میرے سامنے سے گزرتا ہے، ان میں سے ایک لڑکے کا سر غائب ہے اور دوسرے کے دونوں بازو نہیں ہیں۔

پہلے لڑکے نے اپنی قمیص کے اوپر ایک نئے فیشن کا جیکیٹ پہنا ہوا ہے جو سامنے سے آدھا کھلا ہوا ہے جس سے اس کا چوڑا سینہ صاف جھلک رہا ہے۔ گلے میں اس نے نیلا اسکارف لپیٹا ہوا ہے۔ دوسرے لڑکے نے بغیر آستینوں والی سرمئی رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی ہے اور اس نے نہایت ہی تنگ جینز چڑھا رکھی ہے، اس کی جینز کمر سے اتنی نیچی ہے کہ دونوں سرین کے اُبھار کی شروعات تک کھسک آئے ہیں۔ میں اپنی آنکھیں فوراً نیچی کر لیتا ہوں۔ ایک لمحے کے چھوٹے سے ٹکڑے میں اتنا ہی دیکھ پاتا ہوں۔ میں اتنا گھبرا جاتا ہوں کہ مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

میرے پاؤں مجھے جلدی جلدی آگے دھکیلتے ہوئے بڑھالے جاتے ہیں۔ سامنے سے آرہے ایک بوڑھے آدمی کی چھڑی سے ٹکراتے ٹکراتے میں سنبھل جاتا ہوں۔ میرا سر گھومنے لگا ہے۔ تھوڑی دور چل کر میں بغل کی ایک خالی بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں، پھر اپنے پاؤں سامنے کی طرف پھیلا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہوں، آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہوں۔ سر کا چکرانا بند ہو چکا ہے لیکن بند آنکھیں جیسے کھلنا بھول چکی ہوں۔

رفتہ رفتہ آنکھوں کے پردے پر ایک روشنی ابھرتی ہے، پھر سلو موشن (slow motion) میں کچھ تصویریں مونتاژ کی طرح ایک پر ایک بنتی مٹتی محسوس ہوتی ہیں؛ لیکن اسی درمیان لگتا ہے جیسے میری آنکھیں غیر ارادی طور پر کھل گئی ہیں۔ حالاں کہ میرا جسم اب بھی ویسے ہی بنچ پر نڈھال پڑا ہوا ہے۔ اس میں کوئی جنبش نہیں، کوئی حرکت اب بھی نظر نہیں آرہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جو تصویریں میری بند آنکھوں کے پردے پر بن اور مٹ رہی تھیں، بالکل ویسی ہی اب مجھے میری کھلی آنکھوں کے سامنے نظر آرہی تھیں۔ مجھے اسی وقت احساس ہوتا ہے کہ میں جب گھبرا کر اس بنچ پر بیٹھا تھا، تب سے اب تک کے درمیان وقت کا کوئی فاصلہ حائل نہیں ہوا ہے۔

بنچ پر بیٹھے بیٹھے میں دیکھتا ہوں کہ دونوں لڑکے اسی طرح لیکن زیادہ تیز قدموں کے ساتھ قہقہہ لگاتے باتیں کرتے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے کپڑے وہی ہیں، پہلے لڑکے کی قمیص کے اوپر وہی نئے فیشن کا جیکیٹ اور گلے میں لپٹا ہوا نیلا اسکارف، اور دوسرے لڑکے کا وہی بغیر آستین کا ٹی شرٹ اور وہی تنگ جینز جس سے اس کے سرین باہر اُبلے پڑ رہے ہیں، لیکن اس بار ان پر پسینے کی بوندیں جھلک رہی ہیں۔ پہلے لڑکے کا چہرہ، اس کی قمیص، دوسرے لڑکے کا ٹی شرٹ بھی پسینے میں تر بتر نظر آرہے ہیں۔ شاید یہ ان کا آخری راؤنڈ ہے، کیوں کہ وہ فوراً بغل کے چھوٹے گیٹ کی طرف مڑ گئے جہاں سے انھیں باہر نکلنا ہے۔ میری آنکھیں کچھ دیر تک انھیں پر جمی رہیں جب تک وہ باہر نہ نکل گئے۔ گیٹ کا پلّہ بھی ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک جھولتا رہتا ہے اور میری آنکھیں وہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ میں سوچنے لگتا ہوں، شاید یہ نیا جوڑا ہے جو آج پہلی بار نظر آیا کیوں کہ روز پابندی کے ساتھ یہاں آنے کے سبب میں اکثر لوگوں سے واقف ہوں۔

آج دیر ہوگئی ہے، پھر بھی ٹہلنے والے ابھی بھی آ ہی رہے ہیں۔ مجھے اپنا پانچواں اور آخری راؤنڈ پورا کرنا ہے۔ میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ ابھی سوا سات بجے ہیں۔ لگتا ہے، گھڑی اسی وقت

بند ہوگئی تھی جب میں گھبرا کر یہاں بیٹھ گیا تھا، بیٹھا کیا تھا گر پڑا تھا۔ لیکن اب تھکاوٹ دور ہو چکی ہے اور پانچویں راؤنڈ کے لیے چل پڑتا ہوں۔ دھوپ نکل آئی ہے، لیکن بائیں طرف سے چکر لگانے پر دھوپ زیادہ دیر تک سامنے نہیں پڑتی۔ اور یوں بھی چاروں طرا ونچے پیڑوں کے ہونے سے دھوپ زیادہ تر چھن کر آتی ہے اور walk way کے اکثر حصے میں چھاؤں ہی ہوتی ہے۔

بہت سے لوگ جا چکے ہیں، لیکن کچھ دیر سویر والے تو ابھی آ ہی رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ضعیف اور ادھیڑ لوگ ہیں اور کچھ نوجوان بھی ہیں۔ ایسے لوگ عادتاً دیر سے آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گروہ میں زور زور سے باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے تیز قدموں سے چلتے رہتے ہیں کیوں کہ پھر دفتر کا وقت بھی تو ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ میرا پانچواں اور آخر راؤنڈ مکمل ہونے والا ہے، لیکن اس بار جو لوگ میری طرح بائیں طرف سے ٹہل رہے ہیں، وہ شاید دیر سے آنے کے سبب زیادہ تیزی سے ٹہل رہے ہیں۔ پانچویں راؤنڈ میں یوں بھی میری رفتار سست ہو جاتی ہے۔ دیر سے آنے والے لوگ مجھ سے آگے بڑھ جاتے ہیں، لیکن میں ہر روز کی طرح اپنے معمول کی رفتار سے چلتا رہتا ہوں۔ تبھی اچانک محسوس ہوتا ہے جیسے ٹہلنے والے کئی لوگوں کی پیٹھ پر 'بارکوڈ' (Barcode) جیسی موٹی پتلی باریک لکیریں چھپی ہوئی نظر آ رہی ہیں جیسا کہ عموماً آج کل بازار میں بکنے والی ہر قابل فروخت شے کے پیکٹ پر نظر آتی ہیں۔ ان تمام لوگوں کی جینز یا برموڈا یا شارٹ، سب کی سب کمر سے نیچے کھسکی ہوئی ہیں جن سے ان سب کے سرین باہر اُبلے پڑ رہے ہیں۔

میں غور سے دیکھتا ہوں تو ان موٹی پتلی باریک لکیروں کے نیچے کچھ اعداد بھی نظر آنے لگتے ہیں، جو تاریخوں جیسے لگ رہے ہیں۔ لیکن پھر میں سوچنے لگتا ہوں کہ آج پہلی بار ایسے بہت سے لوگ ایسے عجیب و غریب کپڑے پہنے یہاں چہل قدمی کرنے کیسے آ گئے؟ ان میں سے زیادہ تر تو آس پاس کے جانے پہچانے لوگ ہی محسوس ہو رہے ہیں۔ میرا آخری راؤنڈ اب مکمل ہونے والا ہے، اور میں اسی سوچ میں چلتے چلتے گیٹ کے پاس پہنچ جاتا ہوں اور ان بہت سارے الم غلم سوالوں میں الجھا بے دلی سے اپنے فلیٹ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں کیوں کہ صبح کی دوا لینے کا وقت ہو چکا ہے بلکہ کچھ دیر ہو گئی ہے۔

"It's not healthy، مجھے تمھاری عادت پڑ رہی ہے۔" ایک نصف گنجا، نصف

بوڑھا جواب تک ایک ننگی لاش کی طرح پڑا تھا، اندھیرے کمرے میں بڑبڑایا۔

''میں کیا کوکین ہوں؟'' میں گردن نیچی کیے سمٹ کر بیٹھا تھا۔ اب بستر کی سلوٹوں پر انگلیوں سے کچھ بنانے لگا تھا۔ ''اور سنی جرمنی کب جا رہا ہے؟'' جب بھی مجھے اس بوڑھے کو ناراض کرنا ہوتا تھا، میں اس کے خاندان کے بارے میں پوچھتا۔

''اگلے ہفتے۔ مگر یہ سنی کہاں سے آ گیا درمیان میں؟'' بوڑھا ناراض ہو جاتا۔ ''سنو میں سوچ رہا تھا کہ یہ تمھارے لیے بھی اچھا نہیں ہے کہ تم اپنے احساسات مجھ پر خرچ کرو۔ تمھیں اپنی عمر کا...''

''تمھاری بیوی کے گھٹنوں کا آپریشن ہونے والا تھا نا؟ ہوا؟''

اس بوڑھے اس طرح سر ہلایا جیسے لوگ اکثر اس وقت ہلاتے ہیں جب انھیں کہنا ہو کہ تمھارا کچھ نہیں ہو سکتا۔

''تمھاری بیٹی پریگننٹ تھی نا؟ کیا ہوا؟''

بوڑھے کی قوت برداشت شاید جواب دے گئی، وہ دھیرے سے اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں اب اسی طرح بیٹھا رہا۔ میں نے بستر کے بغل میں سے ایک ٹرین جیسا چھوٹا کھلونا نکالا اور اسے بستر پر چلانے لگا۔ مجھے یاد ہے باتوں ہی باتوں میں بوڑھے نے ایک بار پوچھا تھا کہ اسے کیا بننا ہے؟ یہ ان کچھ راتوں میں سے ایک تھی جو انھوں نے صرف باتیں کرتے گزاری تھیں۔ وہ بوڑھے کے سینے پر سر رکھ کر اپنی ہتھیلیوں سے اس کے بازوؤں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا، جب تھک جاتا تو تکیوں سے لپٹ کر سو جاتا تھا، حتیٰ کہ جب وہ دن آیا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ وہ بازو نہیں ہیں، بغیر پٹھوں کے، گوشت کے لوتھڑے سی۔

''بتاؤ نا، مجھے تمھاری نوکری نہیں کرنی، اس شہر میں نہیں رہنا، واپس نہیں جانا، اپنا فیملی بزنس نہیں کرنا، ترقی نہیں کرنا، آگے نہیں پڑھنا... تو تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اپنا سر اٹھایا جو اب تک بوڑھے کے سینے پر یوں ہی پڑا تھا، ادھ موندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

جب میں گھر جاتا تھا تو راستے میں ایک اسٹیشن پڑتا تھا؛ مدھیہ پردیش کے بارڈر پر چھوٹا سا اسٹیشن۔ سورج بس طلوع ہونے کے لیے اپنے پر تول رہا ہوتا تھا اور میں اپنی آنکھیں مل کر اس اسٹیشن کو دیکھتا تھا، ایک خوب صورت خواب کی طرح۔ ہر بار کچھ نیا نظر آتا تھا۔ دھند میں آگ تاپتے

ہوئے وہ سفید بالوں والاقلی اور اس کا کتا، برسات میں بھیگتا وہ پرانا سا زنگ آلود تنہا لیمپ پوسٹ، بھاگتی ہوئی اور سر پر ٹوکری لیے وہ عورتیں، جھلسا دینے والی گرمی میں مونگ پھلی کھاتے ہوئے گاؤں چھوڑ کر آیا ہوا وہ لڑکا؛ یوں لگتا تھا جیسے انھیں میری کہانی میں ہونا چاہیے مگر وہ نہیں ہیں۔ ٹرین بس رکتی بھر ہے، پھر چل پڑتی ہے... ہر بار... میرا کچھ پیچھے چھوٹ جاتا ہے ہر بار۔

''تو؟''

''مجھے اس اسٹیشن کا اسٹیشن ماسٹر بننا ہے۔''

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے، پھر بوڑھا ہنسنے لگا۔ میں اس رات کو اور شاید ان باتوں کو بھول ہی جاتا، اگر بوڑھا میرے لیے ٹرین جیسا وہ کھلونا نہ اٹھالاتا۔

''کیوں، کیوں، کیوں؟'' میری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''بھئی، کھلونا دکان میں نظر آیا تو اچانک اسٹیشن ماسٹر کی یاد آگئی۔''

''مگر کھلونے کی دکان پر گئے ہی کیوں تھے؟''

ماحول میں گھٹن گھل سی گئی تھی۔ معلوم نہیں اس دن، مجھے بار بار کیوں لگ رہا تھا کہ میں بوڑھے کے روتے ہوئے پوتے کے ہاتھوں سے کھلونا چھین رہا ہوں اور اس درمیان بوڑھا میری پھنسیوں بھری پیٹھ کو چومے جا رہا ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ منھ میں ایک لبلباتا ہوا کیڑا ہے جو اس سے اُگلا نہیں جا رہا۔

میں اس کا کبھی اقرار کروں یا نہ کروں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ مجھے بوڑھے سے پیار ہے اور اس بات کے لیے مجھے خود سے اتنی ہی نفرت بھی ہے۔ کئی بار میں ہر چیز مٹا دینا چاہتا ہوں، اپنا نام کھرچ دینا چاہتا ہوں، سب سے دور ہو جانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ محسوس ہو رہا ہے، وہ مجھے نہیں بلکہ کسی انجان، بے نام اجنبی انسان کو ہو رہا ہے۔ مجھے خود سے کبھی کبھی سڑاند اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

بوڑھا کب کا جا چکا تھا مگر میں اب بھی اس بستر کے ایک کنارے سمٹا ہوا بیٹھا تھا اور ایک موہوم سی مسکراہٹ بڑے دنوں بعد میرے چہرے پر اُتری جو مونچھوں کی رگڑ سے ایک بارکوڈ (Bracode) کی طرح نظر آ رہی تھی۔

- 19 -

''میں نے شاید بتایا ہوگا اپنے TCS کے دوست ورون کے بارے میں، جو میرے پہلے والی آفس کا برانچ منیجر تھا۔'' سنجے نے کہا۔

بارش ہو رہی تھی، سو آج دونوں کو ایک ہی آٹو رکشہ کرنا پڑا تھا۔ سورج ایک عرصے اسی بینک میں تھا اور سنجے ایک آئی ٹی کمپنی چھوڑ کر کچھ اور کی تلاش میں وہاں آیا تھا، پھر اس نے شادی کی، پروموشن لیا، بچے پیدا کیے، بینک سے قرض لیا، گاڑی لی، گھر لیا لیکن تلاش اب بھی جاری تھی، پتہ نہیں کس کی؟ مونگ پھلیاں ختم ہونے کو تھیں، آٹو رکشہ اب بھی رُکا ہوا تھا۔

''وہ اب کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہو گیا ہے۔'' سنجے نے کہا۔

''کیسے؟ تم بھی ٹرائی مارلو۔'' سورج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خاموش ہو جاؤ... اپنا ختم ہے۔''

''تو؟'' سورج نے سوال کیا۔

ایسے ہی کسی 'تو' ('تو تجھے وہ سب کرنا ہے جو سب کر رہے ہیں؟') کے جواب میں اس نے ورون کو بتایا تھا کہ اسے زندگی میں کچھ نہیں چاہیے۔ وہ ختم ہے، صرف یہ سوزش ہی ہے جو اس سے یہ سب کرائے جا رہی ہے۔ پھر اس نے وہ سب کیا جو سب کر رہے تھے، اس نے سرکاری نوکری کر لی، اس نے شادی کی، پروموشن لیا، بچے پیدا کیے، قرض لیا، گاڑی لی، گھر لیا، پھر ان برسوں میں سب بدل گیا مگر سوزش نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور اب وہ بنا کچھ کیے چپ چاپ جلتا ہے۔

''تو؟'' سورج نے سوال کیا۔

''میں نے بھی بول دیا، اپنا بھی مست چل رہا ہے، اتنا سکون ہے جو مجھے ہمیشہ چاہیے

تھا۔'' سنجے نے لا پرواہی سے کہا۔

''کیا پتہ، وہ بھی جھوٹ بول رہا ہو؟'' سورج نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا پتہ؟''

''رین کوٹ کھیل رہے ہو؟'' سورج نے پوچھا۔

''کیا رین کوٹ؟'' سنجے نے اس کی طرف دیکھا۔

''اجئے دیوگن والی... پوری پکچر میں ایک دوسرے کو چوتیا...''

''ہاں رین کوٹ!'' سنجے نے ٹھنڈی سانس لی۔

''لیکن ایک فرق ہے... وہ دونوں اس مووی میں lover تھے۔'' سورج نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں بھی تو سالا lover ہی تو تھے۔'' لیکن سنجے یہ بات نہ کہہ سکا، نگل گیا۔ بول بھی کیسے سکتا تھا؟ لیکن آج بہت دنوں بعد سنجے سختی سے بند کیے گئے اپنے کلوزیٹ کے دروازے کی چوکھٹ کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔

سنجے کو بھی میرا 'وزڈم ٹیتھ' بہت پسند تھا۔ لیکن اس کی بات الگ تھی۔ اسے مجھ میں اور بھی بہت کچھ پسند تھا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگتا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ ہم نے ایک ساتھ کافی وقت گزارا۔ آج ہم آخری بار مل رہے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔

یوں بھی ہم نے کبھی زیادہ باتیں نہیں کی تھیں۔ یوں بھی میرا شروع سے ماننا تھا کہ آپ جن کے ساتھ باتیں کرتے ہیں، ان کے ساتھ آپ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم دونوں گزشتہ دو سال سے ایک ہی آفس میں تھے۔ سنجے ابھی ابھی نوکری پر لگا تھا اور اس کی چیخ چیخ کر بات کرنے کی عادت تھی۔ میں ہمیشہ سے اس آفس کا برگد تھا، ہمیشہ سے وہیں اور ہمیشہ وہی، بوڑھا برگد، سنجے کا مونچھوں والا برگد۔ مہینوں تک ایک دوسرے کا نام تلک نہیں جانتے تھے، حالاں کہ ہم اب بھی نام کے سوا ایک دوسرے کے بارے میں کچھ خاص نہیں جانتے۔

ہم صرف ایک دوسرے پر لیٹے ہوئے تھے، رات ہمارے نصیب میں نہیں تھی۔ ہلتے ہوئے پردوں سے گرم ہوا کے ساتھ کچھ اور بھی کمرے کے اندر آ رہا تھا۔

سنجے نے بہت کچھ پوچھا تھا، ''کیا کوئی مسئلہ ہوتا ہے تمھاری بیوی کے ساتھ...''
''نہیں تو۔ کیا مطلب؟''
سنجے نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا، ''اب تک کتنے؟''
میں نے بھی ایک بار اس سے پوچھا تھا، ''لڑکی سے؟''
سنجے نے پوچھا تھا، ''کبھی گروپ میں؟''
سنجے نے کبھی بتایا تھا، ''ایک دن میں پانچ بار۔''
میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا، ''میں بھی پہلے بہت کیا کرتا تھا مگر ایک دن میں پانچ بار؟''
میں نے اس سے پوچھا، ''پہلی بار کیسے؟''
سنجے نے ایک لجلجی سی اپنے روم پارٹنر والی کہانی سنائی تھی اور اس پہلی بار کو شراب، بارش اور سردی کے متھے مڑھ دیا۔

اور ایسی ہی کئی باتیں جو ہونی تھیں، وہ کب کی ہو چکی ہیں اور جو نہیں ہوئی ہیں، ان کا وقت گزر چکا ہے۔ اب خاموشی ہے۔

میں سنجے کے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ میں نے خود کبھی اتنے لمبے بال نہیں رکھے تھے اور نہ کبھی اپنے بیٹے اعجاز کو رکھنے دیے تھے۔ میں نہ جانے کیا سوچنا چاہتا ہوں لیکن ہر بار یہی سوچ پاتا ہوں کہ سنجے ابھی اعجاز سے بھی چھوٹا ہے مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ اعجاز کبھی اتنا معصوم رہا ہو، اتنا ناسمجھ ہو۔ مجھے کئی بار لگتا تھا کہ ابھی میں سنجے کو بٹھا کر سمجھاؤں، دو باتیں کہوں، اس کی الجھی ہوئی زندگی کی دو چار گانٹھیں کھولوں لیکن وہ ہمیشہ گہری سانس لے کر رہ جاتا تھا۔

مجھے ہمیشہ کی طرح زکام ہوا تھا۔ میں اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ چپکانا چاہتا تھا مگر میری ناک بج رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی ہنسی نہ روک پائے۔ سنجے مجھے ہلاتے ہوئے بالوں سے بھرے میرے بڑے پیٹ کو دیکھتا رہا۔ بالوں سے بھرا بڑا پیٹ، جس پر آج تک کوئی نظم نہیں لکھی گئی، نہ کبھی اس کی امید ہے لیکن سنجے کے لیے اگر عشق کا مطلب کچھ ہے تو یہی ہے اور صرف یہی ہے۔

بالوں سے بھرا میرا پیٹ، میری ریچھ کے بالوں سی مونچھ، میرے سفید سر کے بال اور یہاں وہاں سے اپنا منھ نکالتا گنجاپن، چہرے پر اُتری سیاہ لکیریں، میرا زکام، بہتی ہوئی ناک، بھاری آواز، میری تنہائی اور اس کی کبھی نہ اُترنے والی تکان، سب کچھ پانے کی خواہش اور نہ پا

سکنے کی کسمساہٹ، میری آنکھوں میں بکھری اداسی؛ ان سب سے سنجے کو والہانہ پیار تھا۔

گھڑی کی سوئیاں بغیر رُکے کھسکتی رہیں۔

ہم دونوں اپنے کپڑے پہن رہے تھے۔

میں نے پوچھا، ''کب ہے؟''

''سات تاریخ کو۔ یہ لاسٹ ہے۔'' سنجے نے جواب دیا۔

''میں نے بھی کبھی سوچا تھا کہ یہ لاسٹ ہے... تین سال پہلے... مگر لاسٹ نہیں آتا... کبھی نہیں ہوتا۔''

ہم دونوں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید ڈوبتے سورج کی بتدریج گم ہوتی روشنی میں ایک دوسرے میں ایک دوسرے کو تلاش کر رہے تھے، ایک آنے والا کل اور ایک اپنا گزرا ہوا۔

اس نے اپنے کپڑے پہنے اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے آخری بار دیکھا اور اسے ایک مسکراہٹ کے ذریعہ الوداع کہنا چاہا لیکن رو پڑا۔

وہ اتوار کی دوپہر تھی، سورج کی گرمی ہواؤں میں گھل گئی تھی۔ میں اس سے آخری بار اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ملا، اسی اپارٹمنٹ میں جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے پچھلے دو سال سے وابستہ تھے، شاید اسی لیے میں خود کو سمجھا نہیں پا رہا تھا کہ بس کچھ دیر بعد وہ ڈائری کے گمشدہ صفحات کی طرح ہو جائے گا۔ ہم نے اس دوپہر میں آخری بار پیار کیا جس میں جوش تھا، غصہ تھا، مختلف جذبات کا آمیزہ تھا جسے ہم نے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ہم الگ ہو رہے تھے۔ ہم دونوں اتنے جذباتی ہو گئے کہ منھ سے ایک لفظ نہیں پھوٹا، صرف اشاروں کنایوں میں باتیں ہوئیں۔ اس کی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چاہتا تو تھا کہ میرے ساتھ رہے مگر وہ مجبور تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے ایسے پکڑتا جیسے وہ مجھے چوٹ پہنچانا چاہتا ہو اور کچھ دیر بعد اس نے خود کو میرے سپرد کر دیا۔ اس نے مجھے آخری بار چوما تھا، آنسو کا ایک قطرہ میرے ہونٹوں کو نمکین کر گیا تھا۔

- 20 -

جب میں گھر سے نکلا، سب اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ تھوڑے سے بادل بکھرے ہوئے تھے، جیسے آدمی باہر نکلتے ہوئے تھوڑا سا بکھر جاتا ہے۔ اسٹیشن کے پاس بھیڑ تھی، جس میں لوٹ آنے والے لوگ تھے اور جانے والے کے دل میں لوٹنے کی توقع۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہوسکتا ہے کہ اس بھاگتے ہوئے ٹھہرے وقت میں، میں کیا کر رہا تھا؟ یہ جان لینا ضروری ہے کہ میں یہ نہیں لکھ رہا تھا جو آپ پڑھ رہے ہیں۔ میرے پاس بیگ تھا جس میں دو کتابیں اور ایک نوٹ بک تھی۔ اس میں ایک قلم بھی ہونا چاہیے تھا، لیکن شاید میں اسے گھر پر ہی بھول گیا تھا۔ ٹرین میں بیٹھا تو سہم گیا۔ اتنے سارے چہرے اور اتنے سارے رنگ۔ یوں بھی میں بچپن سے رنگوں کو پہچاننے میں کمزور رہا ہوں۔ ماں دھوبی کو دینے کے لیے پیلی ساڑی کہتی، میں اسے زعفرانی دے آتا۔ ایک دن میں نے کلاس میں دوستوں کے درمیان کہا کہ سفید رنگ اچھا ہوتا ہے، دوسرے دن کلاس کی سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھنے والی لڑکی سفید رنگ کی قمیص پہن کے آئی۔ اس نے میری طرف دیکھا لیکن چونکہ تب تک میں گلزار صاحب کو نہیں جانتا تھا، اس لیے سمجھ نہیں پایا کہ عشق کا رنگ سفید بھی ہوتا ہے۔ شام کو گھر لوٹتے وقت اس لڑکی کی جھیل بھری آنکھیں دیکھ کر میں سمجھ نہیں پایا کہ اس کی خواہش کا پاپ مجھے لگ جائے گا۔ اب میں ہمیشہ سفید رنگ کو پہچاننے میں غلطی کر جاتا ہوں۔ مجھے سفید کے سوا سب کچھ نظر آتا ہے۔ عشق نے بھی اتنے رنگ اختیار کر لیے تھے میں خوف زدہ اور خاموش ہو گیا۔ ٹرین میں میرے مر جانے کا دن تھا۔ میں اتنے رنگوں کی آوازیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور چیختے ہیں۔ یہ چیخ مجھے یوں سنائی دیتی جیسے مسجد کے اذان اور مندر کی گھنٹیوں کے ایک ساتھ مل جانے کے

بعد آتی ہے۔ میں نے ایک کتاب نکالی اور آنکھیں اس کے سپرد کر دیں۔

بورڈ کے امتحانات تھے۔ 'پری-بورڈ' کے بعد ہی میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ عجیب سے خشک دن تھے۔ میں پورا دن کتاب لیے چھت پر پڑا رہتا تھا۔ فریدہ گاہے گاہے اپنی چھت پر سے مجھے دیکھ لیتی تھی، اماں کھانا دے جاتی تھی، پاپا ڈانٹ پلا جاتے تھے، نیند جھپکیاں دے جاتی تھی۔ گھر والے کہتے تھے کہ کبھی تو جا، ورنہ حاضری کم پڑ جائے گی۔

آخر ایک صبح میں نے سائیکل اٹھائی اور اسکول کی طرف نکل گیا۔ آج اماں صبح سے بہت خوش تھی، آلو کے پراٹھے بنائے تھے۔ اسکول کے موڑ سے ہی دھڑکن بڑھنے لگی تھی۔ میں لیٹ نہیں تھا، لائن لگنی ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ مگر وہاں میرے کلاس کی لائن نہیں تھی، میں تلاش کرتا رہا۔

لیلا میڈم اپنے پتلے سے منھ کو پورا کھول کر گویا ہوئیں، ''کہاں تھے تم؟ پچھلے ہفتے تمھاری آخری کلاس تھی۔''

مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میرا اسکول کب ختم ہو گیا۔ کسی دن آخری گھنٹی بجی ہوگی، وہ ایک ساتھ مل کر چلائے ہوں گے، ''ہرررررے''، ان کلاسوں کے بیچ سے وہ گزرے ہوں گے، کسی جنگجو کی طرح جیسے انھوں نے سب کچھ فتح کر لیا ہو اور اب کچھ باقی نہ رہا ہو۔ ان پرانے ٹیچرس سے ہم ملے ہوں گے جنھیں ہم تھوڑا تھوڑا بھول چکے تھے اور اب جنھیں ہمیشہ بھول جانے والے تھے۔ لیکن مجھے پتہ ہی نہ چلا، یہ سب کب ہوا؟ ہوا بھی یا نہیں؟

میں تیز قدموں سے لوٹ رہا تھا۔ اپنے پتلے منھ پر موٹا سا چشمہ سنبھالتے ہوئے لیلا میڈم نے کہا تھا، ''اگلے ہفتے آنا، الوداعی تقریب میں۔''

مجھے کبھی الوداع کہنا نہیں آیا۔ میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

اسکول کے آخری کچھ ماہ بچے تھے۔ 'پری بورڈ امتحانات' ہونے تھے۔ فریدہ اور قیصر مجھ سے دور رہنے لگے تھے، یا شاید میں ہی ہر کسی سے بیزار رہنے لگا تھا۔ وہ دن بہت خشک تھے۔

فریدہ اب سجی دھجی رہتی تھی، کچھ زیادہ ہی ہنسنے لگی تھی مگر مجھے کنکھیوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ اتنے برسوں سے اس پر میرا ہی حق تھا مگر اب نہیں۔ پچھلے ہفتے ہی اس نے اپنا پہلا 'لو لیٹر' (love

(letter) لکھا، جس کا جواب میں نے اب تک اسے نہیں دیا، کبھی دے ہی نہ پایا۔ اور قیصر... قیصر اور میرے درمیان اب بات چیت بند تھی، ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہ تھے۔

تقسیم انعامات کی تقریب تھی۔ میں وہاں اونگھ رہا تھا۔ دوسرا کوئی وقت ہوتا تو میں ان دونوں کے ساتھ کسی خالی کلاس روم میں گپیں لڑا رہا ہوتا۔ اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہوا، میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ بلاوجہ کی گھبراہٹ تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ میں ان خالی کمروں کے درمیان دوڑنے لگا۔ بھڑاک سے دروازہ کھولا۔ وہ ہڑبڑا کر رہ گئے تھے حالاں کہ تھوڑی دیر پہلے وہ قہقہے لگا رہے تھے لیکن اب خاموش تھے، البتہ فریدہ کے ہونٹوں کے کنارے ہنسی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھی تک پھنسا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر ہنس رہی تھی، وہ قہقہے مجھ پر ہی لگائے گئے تھے۔

''تڑاخ!''

قیصر وہیں کھڑا رہا، نہ اس نے پہلے کچھ کہا اور نہ بعد میں۔ فریدہ کے گال سرخ ہو چکے تھے بلکہ سوج گئے تھے، بال بکھر گئے تھے اور آنکھیں بھر آئی تھیں مگر وہ روئی نہیں۔ سب کچھ غائب سا ہو گیا۔ اتنے دنوں میں میرا غصہ، میری جلن کا کوئی مطلب بھی نہیں رہا۔ میں ہونق بنا وہیں جم سا گیا۔

''کیا ہوا؟ کس نے مارا؟'' ٹیچر بار بار اس سے پوچھ رہی تھی۔

وہ خاموش تھی۔ وہ میری طرف نہیں، کہیں اور دیکھ رہی تھی۔

بڑے دنوں بعد میں گھر لوٹا۔

محلے کے لڑکے اس کی چھت پر شامیانہ لگا رہے تھے۔ میں بھی وہیں تھا، اچھے پڑوسی کی طرح ہاتھ بٹانے کے لیے، مگر میں اونگھ رہا تھا۔

کیا اسے وہ دوپہر یاد ہوگی؟ پھر وہی بات میرے ذہن میں سرسرائی۔

ہاں بالکل، کیوں نہیں یاد ہوگا۔ ہر ایک پل یاد ہوگا مگر کیا ان لمحوں کو وہ بھی یاد کر رہی ہوگی؟ اس روز اسی چھت کی چھوٹی سی کوٹھری میں وہ مجھ سے بے ساختہ لپٹ پڑی تھی۔ وہ ہمیشہ سے میرے قریب تھی، مگر اتنا قریب کبھی نہ تھی اور نہ پھر کبھی ہو پائی۔

لوگ شامیانہ لگاتے رہے، دریاں بچھاتے رہے، دوڑتے بھاگتے رہے اور میں صرف اونگھتا رہا۔

بارات آئی۔ بارات جیسی بارات تھی، وہی باجا، وہی گانا، وہی بھیڑ، کچھ بھی الگ نہ تھا، ذرہ برابر بھی نہیں۔

وہی رسمیں، وہی رواج۔ میں تھک چکا تھا، جھپکیاں آرہی تھیں۔ اس پنڈال میں، میں اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اسے کسی اور کے لیے سجا ہوا دیکھنا چاہتا تھا مگر میری آنکھ کب بند ہوئی، پتہ ہی نہیں چلا۔

جب ہوش آیا تو میں سرد شبنم میں بھیگ چکا تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے اس کا نکاح دیکھا جسے میں نے کبھی قبول نہیں کیا، پھر بھی وہ میری تھی۔ آنکھوں میں شبنم گھس آئی تھی۔ ایک بار میری نظریں اس سے ٹکرائی تھیں، وہ اب بھی ہنس رہی تھی، یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ میری زندگی کا ایک باب ختم ہوا۔ شاید یہی وہ لمحہ ہے جس سے پہلے میں کچھ اور تھا اور اس کے بعد کچھ اور ہونے والا تھا یا شاید کچھ بھی نہیں۔

صبح کا اجالا چاروں طرف بکھرنے لگا۔ رخصتی کی تیاری ہو رہی تھے۔ لوگ سب کچھ سمیٹ رہے تھے، دوڑ بھاگ رہے تھے، میں صرف اونگھ رہا تھا۔ وہیں گلاب جامن کا تھال پڑا تھا۔ رات بھر کھلے آسمان میں پڑے پڑے وہ جم چکے تھے۔ میں نے منھ میں ایک گلاب جامن ڈالا ہی تھا کہ:

''جا اندر گلاب جامن دے آ۔''

وہ سہیلیوں اور بھابھیوں کے درمیان کھانا کھا رہی تھی۔ تھالیاں پکوانوں سے بھری پڑی تھیں۔ قیصر کی ماں نے طعنہ مارا، ''نگوڑی دو بات کرلے، کھانا تو کھلا ہی دے گا وہ۔''

''ارے چاچی، وہ کہاں کھانے دے گا، میرا تو کھایا پیا نکال دے گا وہ سانڈ۔''

وہ ہنس رہی تھی۔ اس مہنگی ساڑی اور وزنی گہنوں سے لدی وہ ایک ٹوکری ہی تھی۔

''ٹھیک سے رہنا۔'' گلاب جامن رکھتے ہوئے میں نے یوں ہی رسماً کہہ دیا۔

اس نے میری طرف نہیں دیکھا، کسی اور جانب دیکھتی رہی۔ میں ہونق بنا وہیں کھڑا رہا۔

اس کی شادی سے پہلے بھی میں لوٹا تھا۔ اس کی چھت پر ہمیشہ چادریں سوکھتی رہتی تھیں جو ہوا کے ساتھ 'سڑ سڑ' کی آوازیں کرتی تھیں۔ میں اور فریدہ گھنٹوں چھت پر بیٹھے رہتے تھے۔

''تمھیں پتہ ہے میں ہمیشہ ڈرتی تھی تم دونوں کی دوستی سے۔ لگتا تھا کہ میں اکیلی چھوڑ

دی جاؤں گی۔''اس نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔
''اب تو کوئی ڈر نہیں ہے، اب تو ہم تینوں اکیلے ہیں۔''میں ہنسا لیکن وہ ویسی ہی سنجیدہ بنی رہی۔
وہ میرے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بولی،''تم بہت بدل گئے ہو۔''
''سب بدلتے ہیں۔''
''مگر میں تمھاری بات کر رہی ہوں۔تم بدل گئے ہو۔''وہ اس طرح بولی جیسے میں وہ جزیرہ ہوں جہاں دنیا کی کوئی لہر نہیں پہنچتی، جس پر دنیا کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔وہ دُہراتی رہی۔
میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں خود بدلنا نہیں چاہتا، وہی رہنا چاہتا ہوں، اس کا ہی بنا رہنا چاہتا ہوں۔وہ بھی تو بدل رہی ہے، اب وہ پہلے کی طرح مجھ پر اپنا حق نہیں جماتی، محلے میں چوکڑیاں نہیں بھرتی، سبک رو ہوگئی ہے۔اب وہ مجھ سے شیشے کی گولیاں اور ہوم ورک کے علاوہ بھی کچھ چاہتی ہے اور اسی سے میں گھبرا گیا ہوں۔وہ مجھے وہیں چھوڑ کر اٹھ گئی، چادریں سمیٹنے لگی۔ پھر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔
''تمھیں کچھ دکھانا ہے۔''میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ادھوری کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ایک پرانا ٹرنک تھا۔
''بتاؤ کیا ہے؟''پھر پہلے ہی کی طرح میری جواب کی پرواہ کیے بغیر بول پڑی،''ہمارے بچپن کے کھلونے... تھوڑے سے میرے اور بہت سارے تمھارے جو تم ہمارے گھر چھوڑ...''
''تھینک یو۔''میں نے کہا۔
''کیوں؟''
''میرے بچپن کو سنبھالے رکھنے کے لیے۔''
''آگے کون سنبھالے گا؟''اس نے سر جھکائے ہوئے پوچھا۔
''اب سنبھلنے کی عمر بھی کہاں رہی، ٹھوکریں ہی کھانی ہے۔تُو چلی جائے گی۔''وہ مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی اور اسی کا مجھے ڈر تھا۔
اس کمرے میں بہت ساری کھڑکیاں تھیں۔ہم خاموشی سے ان کھڑکیوں پر چادر لگا رہے تھے۔مجھے پتہ تھا کہ چادر کیسے لگانی ہے۔ان کھڑکیوں سے شام کی گلابی روشنی چھن کر اندر آ

رہی تھی۔ اس کے بالوں میں بھی یہ روشنیاں رنگ بھر رہی تھیں۔ روشنیوں میں اس کا رواں رواں نہار رہا تھا، مجھ پر بھی کچھ پرانا نشہ چڑھ رہا تھا۔ نیچے سے اس کی ماں کو چلاتے ہوئے سن رہا تھا،
''کہاں گئی؟ بتا کر بھی نہیں گئی۔ ندیم، فریدہ کا کچھ پتہ ہے؟''

میں خاموش تھا مگر وہ وقفے وقفے سے ہنس دیتی تھی، یوں ہی یا شاید اس کے اندر کچھ چل رہا ہو۔ وہ کانپ رہی تھی، اس کے پیٹ کی سلوٹوں کی کپکپاہٹ یہ راز افشا کر رہی تھی۔ میرا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا اور یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا۔ پھر اچانک وہ لمحہ آیا اور سب کچھ پُرسکون ہوگیا۔ اس کی ماں کی آواز، میری تیز دھڑکن، اس کی کپکپاہٹ، سب کچھ۔ نہ اس نے کہا 'رک جاؤ' اور نہ میں نے کہا 'مجھے روک لو'، وہ جانتی تھی کہ ان سب کا کوئی مطلب نہیں ہے، صرف یہ لمحے ہیں، اس کے بعد شاید کچھ بھی نہیں۔

شام ڈھل گئی، اندھیرا پھیلنے لگا۔ وہ خود کو سمیٹتے ہوئے نیچے لوٹ گئی۔ اس نے پوچھا تھا، ''کل مل کر جاؤ گے نا؟'' میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ وہ اندھیرے میں جذب ہوگئی۔ شاید قیصر اس کی چھت پر بیٹھا تھا۔ اندھیرے میں، میں نے اسے دیکھا تو نہیں مگر محسوس کر سکتا تھا۔ کتنا عجیب تھا نا؟ فریدہ اور میری کہانی بھی اسی کوٹھری میں ختم ہوئی، قیصر اور میری بھی۔

لوگ سوچتے ہیں کہ قیصر اور میرے درمیان نفرت ہے، حسد ہے، غلط فہمی ہے؛ لیکن اگر ہمیں زبان کھولنے سے کوئی روک رہا ہے تو وہ ہے شرم۔ شرم ان شاموں کے لیے۔ قیصر اور میری وہ عجیب شامیں... جب ہم اسکول کے بعد اسی کوٹھری میں ملتے تھے... گلابی شامیں۔ جب اس کے بالوں میں روشنی رنگ بھرتی تھی، اس کا رواں رواں روشنی سے نہایا ہوتا تھا، وہ وقفے وقفے سے ہنس رہا ہوتا تھا۔ ہم بے شمار چادروں سے کھڑکیاں ڈھانپ رہے ہوتے تھے۔ وہ عجیب شامیں جو میری چھوٹی سی زندگی کا اکلوتا لیکن مکمل تجربہ ہے، جس پر وہ شرمندہ ہے اور جسے میں بھولنا نہیں چاہتا۔

اگلے دن جانے سے پہلے میں فریدہ سے ملنے نہیں گیا۔ سورج کے لمبے اور تیز نیزے اس گلی کو چھید رہے تھے۔ میں اپنا بیگ کندھے پر ڈالے نکل رہا تھا۔ قیصر اس کی چھت پر بیٹھا تھا مگر وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دیوار کے پار تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر محسوس ضرور کر سکتا تھا کہ ان ہلتے ہوئے پردوں کی اوٹ میں فریدہ تھی۔ مجھے کبھی الوداع کہنا نہیں آیا، میں اپنے پاؤں گھسیٹتا ہوا نکل پڑا۔

فریدہ شادی کر کے رخصت ہوگئی۔ فریدہ کے ساتھ میرا بھی وہ شہر چھوٹ گیا۔ اُڑتی

اُڑتی خبر سنی تھی کہ فریدہ کو لڑکی ہوئی ہے۔ قیصر نے پچھلے سال شادی کر لی؛ نہ میں گلاب جامن کی تھال تھامے اس کے سامنے کھڑا رہا اور نہ وہ رویا۔

وقت گزرتا رہا، یہ نیا شہر مجھ سے انجان ہی رہا، دوسری طرف میرے اپنے شہر نے مجھے اجنبی کر دیا۔ میں بھاری قدموں سے ان انجان گلیوں سے گزرتا ہوں تو لگتا ہے کہ پیچھے چھوٹے ہوئے اس موڑ پر کسی کی نقرئی ہنسی میرا تعاقب کر رہی ہے۔

زندگی کی اس شام میں اس سے ایک بار ملنے کی خوش ہے، ان فلموں کی طرح جن میں دو پیار کرنے والے بچھڑنے کے برسوں بعد ملتے ہیں؛ لیٹ ہو چکی ٹرین کے انتظار میں تیز بارش کی گرفت میں اس چھوٹے سے اسٹیشن کے چھوٹے سے ویٹنگ روم میں۔ اس کی نئی زندگی میں خوشیاں ہوں اور میں پریشانیوں میں گرفتار نظر آؤں۔ میرے بالوں میں چاندی کی ایک ہلکی سر پرت چڑھ گئی ہو مگر وہ اب بھی خوب صورت ہو۔ چڑھتی ہوئی رات میں وہ کچھ کہے اور میں کچھ بتاؤں اور آخری لمحوں کے کسی نقطے پر اسے بتا ہی دوں کہ اسکول کے آخری دنوں میں کیا بدلا تھا جس نے مجھے بدل دیا لیکن میری یا اس کی زندگی میں بارش کی گرفت میں جکڑا ہوا اس چھوٹے سے اسٹیشن کا ویٹنگ روم کبھی نہیں آیا۔

- 21 -

''تم نے تاج محل دیکھا ہے؟''

''ہاں۔''

''ایسے نہیں، رات کو؟''

''نہیں۔ کیوں؟''

''پچیس سال پہلے، میری...''

''میں چوبیس کا ہوں۔''

''ارے سنو تو سہی، پچیس سال پہلے میری پوسٹنگ آگرہ میں تھی۔ ان دنوں آج جیسی سکیوریٹی و یکیوریٹی نہیں ہوتی تھی۔ میں اسے روز دیکھتا تھا، ہر موسم میں۔ کبھی دھوپ میں سلگتا ہوا، کبھی سردی میں ٹھٹھرتا ہوا تاج محل۔ کبھی گنگناتی جمنا، کبھی پرندوں کا شور تو کبھی سناٹا۔ ہر شام غروب ہوتے سورج کے ساتھ وہ تھوڑا سا بدل جاتا تھا۔ ہر روز کچھ نیا لگتا تھا۔ ایک نیا سا رنگ ... کبھی سرخ، کبھی جامنی، کبھی معمولی سا نیلا، کبھی معمولی سا زرد۔ لیکن ہر رنگ میں وہ خوب صورت لگتا تھا۔''

اس نے اس چوبیس سال کے کبھی نہ بڑے ہونے والے بچے کو اپنی بانہوں میں لے کر دیکھا جو شاید وہ ان رنگوں کو کبھی نہ دیکھ پائے گا۔ وہ چوبیس برس کا بچہ صبح میں خود کو سمیٹ کر نکل جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں کبھی نہیں ملتے ہیں۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ دھندلے پڑتے نشان رفتہ رفتہ مٹ جاتے ہیں۔ اس رات کے ہر داغ پر وقت کے گرد کی ایک موٹی تہہ چڑھ جاتی ہے۔ وہ ان کا ملنا، تاج محل کی باتیں، پھر لمبی سی رات؛ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، کبھی ہوا ہی نہ ہو۔

وقت کے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھنے پر کئی باتیں مجھے بے چین کرتی ہیں جو

کہی نہیں گئیں، محسوس نہیں کی گئیں۔ صرف مٹ گئیں یا مٹادی گئیں۔ جیسے وہ دولوگ جو ٹیوب لائٹ کی فلوریسنٹ روشنی میں نہائے ہوئے پبلک ٹوائلٹ میں ملتے ہیں مگر جو چاندنی میں نہائے ہوئے گلابی تاج محل کی باتیں کرتے ہیں۔

اس نے کہا تھا۔

میں ہر کام میں ڈسپلین پسند کرتا ہوں، سیکس بھی۔ بے قاعدگی آپ کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور آپ کی اخلاقیات پر بھی۔ یہ اور بات ہے کہ قاعدے آپ کو اپنے بنانے ہوتے ہیں، دوسروں کے بنائے ہوئے قاعدوں پر چلنا ریپ سے زیادہ تکلیف دہ اور اس سے بڑا جرم ہے۔

سموار کی رات میں ایک سماج سدھارک کے ساتھ سویا۔ اسے 'لَو جہاد' کرنے والوں کو سبق سکھانا پسند ہے۔ اسے اس کام میں مہارت بھی حاصل ہے۔ وہ ایسے جہادی جوڑوں کو اذیت دینے کے نئے نئے طریقے سوچتا رہتا ہے اور میرے ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے مزے لیتا ہے۔ ہم کچھ کھاتے ہیں، ٹی وی دیکھتے ہیں، اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے زیر ناف حصوں کو ٹٹولتے ہوئے ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے کیوں کہ میں کون سا اس کے پیار میں مرا جا رہا ہوں۔

منگل کی رات میں نے ایک ایسے نوجوان کو برداشت کیا جو پوری سنجیدگی کے ساتھ بیمار تھا۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، اس لیے اس نے سب کچھ جلدی ختم کیا۔ اس کے بعد اس نے کافی کے کپ میں خون کی قے کی اور بولا کہ وہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں اسے یاد دلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن سب کو جانا ہے۔ اسے کاغذی تسلی دینے کے لیے میں 'مرنے کے بعد کیا ہوگا' کا ایک باب بآواز بلند پڑھتا ہوں۔

بدھ کو میرا سابق عاشق پرانے دنوں کی طرح میرے ساتھ سیکس کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا، لیکن وہ اپنے ماضی سے یوں ہی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

جمعرات کی شام میں نے اپنے آفس سے 'اُوبر' لیا اور اپنے بیسٹ فرینڈ کے بھائی کے ساتھ رات گزاری۔ ہم نے اپنے کپڑے نہیں اتارے۔ ابھی میں نے اپنا جینس نیچے کھسکایا ہی تھا کہ وہ بول اٹھا کہ اس کا چھوٹا بھائی اس سے جلتا ہے۔

جمعہ کی شب میرے لیے صبر آزما تھی۔ وہ لڑکا اپنے عضو تناسل کو ایستادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے اس سے گندی اور فحش باتیں کیں اور اس کے عضو تناسل کو پکڑ کر بے شرمی سے اس کی پینٹ سے باہر نکالا، لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ مجھے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک میں نے اسے ثابت نہیں کر دیا اور اپنا عضو تناسل کو رگڑ اور مسل کر تسکین حاصل نہیں کر لی۔

سنیچر اپنے عاشق کے ساتھ گزارا۔ اس کے باوجود کہ ہم دونوں الگ الگ لوگوں کے ساتھ مباشرت کرتے رہے ہیں، وہ ابھی بھی میرا عاشق ہے۔ ہم اپنے پسندیدہ آسنوں کو آزماتے رہے۔ بریڈ پر مکھن لگاتے ہوئے اپنے رشتوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

اپنے عاشق کی نظر میں، میں ایک عورت ہوں۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی غلط فہمی میں اس کا ساتھ دیتا ہوں۔

وہ مجھے اکثر سوئیٹی، پارٹنر، کیوٹی وغیرہ جیسے لفظوں سے مخاطب کرتا ہے۔

میری سالگرہ پر وہ سٹی شاپنگ سنٹر کے عورتوں کے سیکشن سے میرے لیے تحفہ خریدتا ہے؛ کبھی فوم والا براتو کبھی جالی والی پینٹی۔

وہ مجھے لزبیئن والا گریٹنگ کارڈ دیتا ہے۔

وہ مجھے ہم جنس عورتوں والا مرض دیتا ہے۔

ہم پیار کرتے ہیں لیکن اندر جذب کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس سے باہر نکلنے کے لیے۔

اس نے کہا تھا۔

اس چھوٹے سے شہر کے بار میں جاؤ، وہاں ایسے مرد ملیں گے جن کے عضو تناسل بیدار نہیں ہو پاتے۔

وہاں جو مرد سب سے زیادہ اُداس نظر آئے، اس کے ساتھ ٹیبل شیئر کرو۔

اس کے کان میں دھیرے سے کہو، مباشرت ہی سب کچھ نہیں ہے دنیا میں۔

اس سے کہو کہ تمھیں بارش میں ہاتھ پکڑ کر چلنے میں اس سے زیادہ مزہ آتا ہے۔

اس سے کہو کہ سیکس کا تمھارا سب سے پسندیدہ آسن ایک دوسرے سے لپٹ کر بوس و

کنارکرنا ہے۔

اس سے کہو کہ شاید اسے اب تک اس کے لائق کوئی عورت نہیں ملی۔

اسے اپنے ساتھ گھر چلنے کی دعوت دو۔

تھوڑی دیر بعد اس سے بستر میں بولو کہ تم سچ مچ اس کے ساتھ ہم بستر ہونا چاہتے ہو۔

اسے حکم دو کہ وہ کوشش کرے ورنہ دفع ہو جائے۔

یہ سب ہو جانے کے بعد اس سے پھر پوچھو کہ اس نے ابھی تک کوشش نہیں کی۔

اس پر الزام لگاؤ کہ وہ نامرد ہے۔

اس سے کہو کہ تم اس سے بعد میں مل سکتے ہو لیکن تم سوچتے ہو کہ وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں تبدیلی کی کوئی امید نہیں بچی۔

اسے کرائے کے پیسے دیے بغیر آدھی رات بیچ سڑک پر چھوڑ دو۔

اس نے کہا تھا...

- 22 -

شکر ہے دکانوں میں خریداروں کی بھگدڑ نہیں مچی تھی۔ وکاس کے چشمے پر بھاپ جم گئی تھی، وہ ابھی ابھی ۲۲۴ نمبر کی ٹھنڈی ایئر کنڈیشنڈ بس سے موتی محل اسٹاپ پر ممبئی کی نم اور چپچپی مانسونی ہوا میں اُترا تھا۔ چوڑی سڑک پر گاڑیاں اسٹاپ پر ٹھہری بس سے آگے نکلنے کے طریقے تلاش رہی تھیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی ان سے انتظار نہیں ہوتا۔ کان بہرے کرنے والے ہارن وہ یوں بجاتے جیسے زیادہ ناز و نعم میں پلے ہوئے رئیس زادے اپنے والدین کو چیخ کر الٹے جواب دیتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر چڑھنے والی تیز رفتار موٹر سائیکلوں سے بچ کر وہ چل رہا تھا۔ بارش کا موسم تھا، ہلکی پھواریں زور پکڑنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ وکاس اب ایک چوراہے پر تھا جہاں ایک طرف سنہرے حرفوں میں سفید پتھروں پر لکھا تھا، 'سنجے بھگورام تامبے چوک'۔ تختی کے اوپری کنارے پر بیٹھے کبوتروں کی بیٹوں کے بہتے جھرنے تامبے صاحب کا لحاظ کر کے سنہرے حرفوں کے کچھ انچ اوپر ہی سوکھ گئے تھے۔

آج وکاس کی چھٹی کا دن تھا۔ کھار اسٹیشن کے پاس ہوٹل میں وہ ویٹر تھا۔ وہیں ہوٹل کی چھت پر دوسرے ویٹروں کے ساتھ چھجے کے نیچے سوتا تھا۔ چھٹی کے دن وہ 'گھر'(؟) سے نکلا کرتا تھا۔ شہر کی سڑکیں، ان پر ہونے والے غیر متوقع واقعات اس کی تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے اور وہ اس کے لیے کافی تھے۔ اسے سنیما، تھیٹر پر پیسے خرچ کرنا فضول لگتا تھا اور پھر ہوٹل میں نیچے والے بار سے چوبیس گھنٹے شراب کی بدبو آتی تھی جس سے اس کی انتڑیاں متھنے لگتی تھیں۔ بائیں طرف لال 'کیپے سٹر باکس' (Capacitor Box) پر کمر کے بل ٹینک دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ایڑی پر ہوائی چپل کی چر چراہٹ محسوس کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ باکس تقریباً فلموں کے پوسٹر اور

دسویں کلاس کی کوچنگ کلاسوں کے اشتہار سے ڈھکا ہوا تھا۔

سامنے سے ایک کالا پیلا آٹو رکشا آتا نظر آیا۔ چوک پر پہنچتے ہی اس کی رفتار کم ہوگئی۔ وکاس کے پاس آ کر 'ٹرر' سے چلنے والا آٹو کا انجن کچھ دھیما ہوا۔ وکاس نے عادتاً نیچے جھک کر کنکھیوں سے ڈرائیور کو تاڑا۔

رکشہ والے کی عمر ۴۰ سال کے قریب ہوگی۔ گھنی مونچھیں، تھوڑی گھسی ہوئی تنگ خاکی رنگ کی پتلون۔ برگد جیسی مضبوط ٹانگیں۔ آنکھیں چاروں طرف دیکھ کر سواری تلاش کرنے میں ماہر۔ لنکنگ روڈ کے پسنجر اپنی برانڈیڈ خریداری کی نمائش کرنے والی تھیلیوں کو اس انداز سے پکڑتے تھے جیسے اسکولی ناٹک میں دُرگا ماں بنی ہوئی لڑکی اپنے ہاتھوں میں تھرموکول کے ہتھیار پکڑتی ہے، گاڑیوں سے نکلتے ہوئے دھویں سے ہراساں، رکشے والے پر اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے اور لڑنے بھڑنے کے لیے ہمیشہ تیار۔

کہتے ہیں کہ رکشاوالوں کی نظریں ۳۶۰ کی ڈگری کی ہوتی ہیں، وہ بہت کچھ ایک نظر میں دیکھ لیتے ہیں، ایک ساتھ کئی منظر سمیٹ لیتے ہیں۔ ہر راہگیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی اسکین تک کر ڈالتے ہیں، جیسے وہ اسے اپنے رکشہ کے اندر بیٹھنے کے لیے مسمرائز کر رہے ہوں۔ رکشہ والے نے اوپری ترپال کے نیچے سر جھکا کر، 'کیپے سٹر باکس' (Capacitor Box) پر لگائے گئے نندی سنیما میں لگے بھوج پوری پوسٹروں کو اور پھر وکاس کو دیکھا۔ وکاس نے پچھلے مہینے کی ایک تہائی تنخواہ خرچ کر کے 'گلوبس' سے خریدا ہوا نارنگی رنگ کی اسٹائلش ہاف شرٹ، تپلی ٹانگوں میں تحلیل جینز پہنے ہوئے تھا۔ وکاس نے دھیرے سے عینک اتاری اور شرٹ سے اسے صاف کیا، پھر احتیاط سے اسے پہنا اور ڈرائیور سے نظریں ملائیں۔ ڈرائیور نے اس کی ٹکٹکی میں لپٹی خواہش کو محسوس کیا۔ عادتاً وکاس کی زبان کی نوک ٹھوڑی کے بالوں کے خشک لمس سے کانپنے لگی۔

آٹو والے نے نائٹ ڈیوٹی پر بھی رکشہ چلائی تھی۔ وہ باندرا کے قدیم کنڈیشوری دیوی مارگ پر رہتا تھا۔ ماؤنٹ میری کے بومن جی سیڑھیوں کے پاس، محبوب اسٹوڈیو کے پیچھے، بینڈ اسٹینڈ پر یا پھر کارٹر روڈ کی جھاڑیوں میں اکثر رات دو سے پانچ بجے تک لونڈے سڑکوں کے کنارے کھڑے رہتے۔ کوئی کچھ نہیں کہتا، جیسے اس وقت شہر ایک جنگل ہو اور یہ جانور اپنی معمول کی حالت میں اپنے مقررہ اڈّوں پر تعینات ہوں۔ لیکن ابھی تو دوپہر کا وقت تھا۔ کچھ لمحوں کے

لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ وکاس کی نظریں متجسس تھیں، رکشہ والے کی سپاٹ۔

رکشا والے نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھایا اور 'ٹرنگ' کی آواز کے ساتھ میٹر آدھا گھمایا جیسے کسی لیڈر کی موت پر آدھا جھنڈا مستول کرتے ہیں۔ یہ اشارہ دراصل سواری کی خواہش رکھنے والے کے لیے ہے کہ 'رکشہ خالی نہیں ہے'، کیوں کہ مستقل ہونے کی یہاں کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ کچھ ہی لمحوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ایک اور بس آنے کی جلد بازی میں، گاڑیوں کے ہارنوں کا شور سن کر آٹو کو مجبوراً وہاں سے نکلنا پڑ سکتا تھا یا پھر غصے میں بھرا بس ڈرائیور ماں بہن کی گالیوں کے علاوہ دو چار تھپڑ بھی لگا سکتا تھا۔ پیڑ کے پیچھے سے اچانک کوئی پانڈو (حولدار) ڈنڈا اہلاتے، سیٹیاں بجاتے، ہاتھوں سے بھاگنے کا اشارہ کرتے نمودار ہوسکتا تھا، جوجیب سے لائسنس کھینچ کر واپس دینے کے لیے رشوت کھانے کا کوئی موقع نہیں گنواتا۔

وکاس بھی منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ اس نے اگر چہ گھاٹ گھاٹ کا تو نہیں لیکن کم از کم اسٹیشن اسٹیشن کا پانی ضرور پیا تھا۔ بھوجپوری فلموں اور میتھ کے کلاسوں کے پوسٹروں سے لدی لال بس سے آگے نکلتا ہوا وہ سر جھکائے اور ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر آٹو کی طرف بڑھا، پھر اندر بیٹھ گیا۔ بغیر کچھ کہے آٹو رکشہ کا ڈرائیور بائیں طرف جھکا، اسٹارٹر راڈ کو دو تین بار اوپر کھینچا اور اسٹارٹ ہونے پر لنکنگ روڈ کی طرف موڑ دیا۔

ان حالات میں بھی عموماً تہذیب کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ کچھ سکنڈوں کے لیے دونوں نے اپنی بکھری سانسوں کو قابو میں کرلیا۔ اس ڈھٹائی میں دونوں کے جسموں میں 'ایڈرنا لین' (Adrenaline) کا جیسے سیلاب بہہ رہا تھا۔ 'ایڈرنالین' جانوروں کی گردوں سے نکلتا ہوا وہ مائع ہے جو تناؤ، غصے یا خوف کی موجودگی میں رستا ہے۔ دھیرے سے انھوں نے دائیں ریویو شیشے میں آنکھیں ملائیں، دونوں مسکرائے۔ وکاس کی مسکراہٹ آئینے پر چپکائے پلاسٹک کے گہرے دبیز اور سرخ لال ہونٹوں کی اسٹیکر میں تحلیل ہوگئی۔

''کہاں جائیں گے؟'' رکشہ والے نے پوچھا۔

دراصل یہ سوال نہیں تھا، محض بات شروع کا ایک طریقہ تھا، جیسے شطرنج کی پہلی چال ہوتی ہے۔

وکاس آگے کی طرف جھکا۔ ڈرائیور اور سواری کے درمیان کی سیاہ پارٹیشن پر مندمل سفید حرفوں میں دو ہدایتیں لکھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ سے سفید رنگ کے ذریعہ لکھی ہدایتوں کے حروف

کی تحریر خراب تھی۔

(۱) کرائے کی ادائیگی صرف Tariff Card کے مطابق کریں۔

(۲) برائے مہربانی پاؤں اوپر نہ رکھیں۔

وکاس نے ایک ہاتھ ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے کی ریلنگ پر رکھا۔ وہ ریلنگ جیسے شائستگی کی خلیج میں گرنے سے بچنے کے لیے بنایا ہوا لوہے کا ایک جنگلہ تھا جو کسی بھی لمحے وکاس کی انگلیوں کی شرارت کے سبب نیست و نابود ہوسکتا تھا۔ وکاس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس جنگلے کے پیچھے وہ عدالت کے کٹہرے میں بیٹھا ہوا ہے اور آٹو رکشہ والا جیوری، جسٹس اور جلاد تینوں ہو، یا پھر وہ دونوں کٹہرے میں کھڑے مجرم ہوں، اور رکشہ کے باہر کی دنیا جلاد ہو۔ لوہا ٹھنڈا تھا۔ وکاس کو ایسا لمس اچھا لگتا تھا، ہاتھوں میں لوہے کا، ایڑی میں چپل کا اور زبان پر ٹھوڑی کے بالوں کی چرچراہٹ۔ جینز میں اس کے دُبلے پتلے کولھوں کی صرف ریکسین کی بے آرام اور گرم سیٹ کے سبب جیسے پپڑیاں نکل رہی تھیں۔ ایک درجن پھٹی جگہوں پر دھاگے سے مرمت کی گئی تھی۔

وکاس نے اپنا دوسرا ہاتھ رکشہ والے کے کندھے پر رکھا۔ رکشہ والے کے کندھے بھالو جیسے بڑے اور بوجھل تھے۔ وکاس کے لمس سے کندھا تھوڑا سا تنا اور تھوڑا سا اُچکا بھی۔ کچھ ہی لمحوں میں کندھوں کا تناؤ کم ہوگیا۔ وکاس کی انگلیوں نے ہلکا سا دباؤ ڈالا، جیسے کوئی جانوروں کا ڈاکٹر کسی زخمی پرندے کے پاؤں کے فریکچر کا معائنہ کر رہا ہو۔ وکاس نے سامنے آئینے میں دیکھا۔ اس بار اس کی نظروں کو ڈرائیور نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

رکشہ والا مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی تھی۔ آئینے پر ایک رسیلے اور سرخ ہونٹوں کی تصویر کا اسٹیکر چسپاں تھا۔ ان ہونٹوں نے وکاس کے گال کے عکس پر بے ارادہ ہی سہی، بوسہ ثبت کردیا۔

''جہاں تم لے چلو۔'' وکاس نے سادگی سے جواب دیا۔ شہران کے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ اب وہ لنکنگ روڈ پہنچ چکے تھے۔ نیشنل کالج کے قریبی گیٹ سے کالج کے طلبا گروہوں کی شکل میں باہر نکل رہے تھے۔ سُرمالگائے جوتے بیچنے والے فٹ پاتھ پر اپنی حکومت جمائے ہوئے تھے۔ وہ جارحانہ آواز میں گزرتی ہوئی ہر فیشن ایبل کالج گرل کو اونچی ایڑیوں والی جوتیوں کو اپنے ہاتھوں سے سہلا کر پرچار رہے تھے، انھیں پھنسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹپوری بچے جوں بھری اپنی چپچپی کھوپڑیوں کو مسلسل کھروںچتے ہوئے نئے فلمی گیتوں کو گاتے گاڑیوں اور

خریداروں کے درمیان یہاں وہاں بلا وجہ دوڑ رہے تھے۔

رکشہ کھار ٹیلی فون ایکسچینج کے سگنل پر رُکا۔ ایک بھکاری نے وکاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ باہر نمی سے بوجھل تیز ہوا کے جھونکے چلنے شروع ہو رہے تھے۔ بارش ہونے کے مکمل آثار تھے۔ بھکاری نے رکشے کے اندر وکاس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان آنکھوں کی تنہائی شاید اسے چھو گئی اور اس نے وکاس کو اکیلا چھوڑ دیا۔ آسمان میں کالے گھنے بادلوں کا جیسا دھما کہ ہونے ہی والا تھا۔ سگنل کی بتی سرخ سے سبز ہوئی، رکشہ والا بائیں طرف جھکا اور اس نے اسٹارٹر کا ڈنڈا کھینچا۔ رکشہ ٹریفک میں بے لگام ہو کر گھسا۔ وکاس کی انگلیوں نے رکشہ والے کے کندھے پر اپنی ڈھیٹ مگر مہذب موجودگی کو برقرار رکھا۔ انگلیوں نے رکشہ والے کے کالر تک کا سفر کیا۔ راستے بھر قریبی گاڑیاں اور رکشے سڑک کی ہر انچ پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے ہارن کا ہلّہ بول دیا تھا۔

رکشہ والے کے حق میں یہ کہنا ہوگا کہ اس نے میٹر چالو نہیں کیا تھا۔ میٹر اب بھی تعزیتی مدت میں لہرائے جانے والے جھنڈے کی طرح نصف مستول تھا، رکشہ والے کی میلی سفید پینٹ میں لپٹی رانوں کی ٹوکری میں ایستادہ اس کی مردانگی کی طرح۔ جوتا بازار سے آگے ٹریفک کچھ کم ہوئی۔ رکشہ والے نے دایاں موڑ کاٹا اور ایک گہری سانس لی۔ باہر بارش کی ہلکی پھواریں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ دو منٹ کے اندر، راستے کے بچے کھچے راہگیروں نے بھی گھروں اور دکانوں کے اندر پناہ لے لی اور سڑک غیر انسانی ہو گئی۔ آوارہ کتے بھی ان دکانوں کے چھجوں کے نیچے گھسنے لگے جہاں سے، وہ جانتے تھے کہ مالک یا اس کا خاندان انھیں نہیں بھگائیں گے۔

''تمھارا نام؟'' وکاس کی انگلیوں کی جگہ اب زبان نے لے لی۔

''شیکھر!''

''آپ کا؟''

''وکاس!''

اگر چہ وکاس کی عمر رکشہ ڈرائیور سے نصف تھی لیکن بہر حال وکاس پسنجر تھا، آمدنی کا ذریعہ، لہٰذا وہ جمع کے صیغہ 'آپ' کا حقدار تھا، بلا سے وکاس نے اسے 'تم' سے مخاطب کیوں نہ کیا ہو۔ شیکھر کی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اس کی بھنویں عقاب کی چونچ جیسی لمبی اور ناک کے اوپر سیدھی لکیر سے ملی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوب صورت اور تیز تھیں۔ اس کی مسکراہٹ کسی پتھر دل کو موم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وکاس دو لفظوں کی مختصر گفتگو میں جان گیا کہ ڈرائیور ایک 'بھیّا'

تھا؛ ممبئی میں اتر پردیش اور بہار کے لوگوں کو دیا جانے والا نام، 'بھیّا'۔ رکشہ والوں سے آنکھیں لڑانے کا پختہ تجربہ رکھنے والے وکاس کو معلوم تھا کہ 'یوپی' والے اکثر محنتی اور سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ ایسے اتفاقی واقعات کی طرف ان کا رویہ پُرسکون ہوا کرتا ہے۔ وکاس کا خیال تھا کہ اپنے گاؤں اور گھر والوں سے دور خوش حال ہونے کی امید میں وہ نائٹ شفٹ میں یہاں رکشہ چلاتے ہیں۔ جسمانی ضرورتوں کو اس طرح نمٹانا ان کے لیے معمولی بات تھی۔

وکاس، شیکھر کے سینے کے گھنے بالوں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آگے جھک کر شیکھر کی قمیص کا پہلا بٹن کھولا۔ اس نے بنیان نہیں پہنا تھا۔ وکاس نے اپنی قمیص کا اوپری بٹن کھولا اور ہاتھ کو شرٹ کے اندر ڈال کر گلے میں پڑی چین کو اپنی شہادت کی انگلی پر لپیٹنے لگا۔ شیکھر نے سر جھکایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ دونوں کچھ دیر تک ویسے ہی بیٹھے رہے۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ رکشہ کے کنواس پر بارش دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں کی طرح پلے بیک میوزک دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مگر مسلسل تین پہیوں والے رکشے کے کھلے دروازوں سے بارش کی بے باک اور بے شرم بوندیں اندر آنے لگیں۔ وہ پہلے تو پیچھے کی سیٹ پر آپس میں گتھم گتھا ہوئیں اور ایک سازش کے تحت چھوٹی ندیوں میں تبدیل ہوگئیں، پھر عیاشی کی خاطر انھوں نے وکاس کے جینز کی طرف رُخ کیا۔ شیکھر نے دونوں دروازوں کے اوپر بندھے ریگزین کو لہرایا اور ان پر بندھی ہوئی چھوٹی سی نم رسیوں کے ذریعہ انھیں لوہے کی سلاخوں کے ساتھ باندھ دیا۔ اگرچہ یہ پردہ ناکافی ہی سہی لیکن بارش کے چھینٹوں کی روکنے میں کامیاب رہا۔ اب وہ اپنے 'ریگزین محل' میں تنہا تھے۔ بارش نے انھیں یہ تحفہ دیا تھا۔

تیز بارش کے باوجود شیکھر نے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑی اور وکاس کے ساتھ پیچھے کی سیٹ پر آگیا۔ اب وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ وکاس نے شیکھر کا بازو سہلایا۔ اس کا بازو سرد اور نم تھا۔ وکاس کے خشک اور گرم ہاتھوں کا لمس شیکھر کو اچھا لگا، اس نے ایک لمبی سانس لی اور پیٹھ ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کی لمبی پلکوں کے گوشوں پر چھوٹی جگمگاتی کانپتی بوندیں تھیں۔

''آٹو... آٹو...'' دو بچوں کی چہکتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔

سامنے کے شیشے پر بارش کے پانی میں سے وہ قریب آتے نظر آئے۔ بارش میں گھر سے باہر ہونے کا مزہ وہ راستوں کے پانی بھرے گڑھوں میں کود پھاند کر کے لے رہے تھے۔ لڑکا اور لڑکی ہر گڑھے میں چھلانگیں لگاتے آخر کار رکشے تک پہنچے۔ دو بچے؛ فی الحال تو دورنگین دھبے

لگ رہے تھے، شیشے پر چلتے وائپر کی بدولت کبھی دھندلے نظر آرہے تھے تو کبھی واضح۔ ان کی ماں پرس اور چھاتے کو بمشکل ایک ساتھ سنبھالتے ہوئے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کو نظر انداز کرنے کے لیے اس نے بچوں کو ٹوکا ضرور، لیکن اس ٹوکنے میں اس کی لاپرواہی نمایاں تھی۔

وکاس نے شیکھر کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ایک لفظ کہے بغیر وکاس نے ریگزین کی ڈور کھولی۔ رکشہ سے نکل کر وہ باہر بارش میں آ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے شیکھر بھی بارش میں اُترا اور ڈرائیور کی سیٹ سنبھال لی۔ اس نے میٹر کو اوپر کیا، 'ٹرنگ'۔ اس کے گال پر بارش کی ایک اکلوتی بوند گری لیکن شاید اس دہکتی ہوئی بوند کی کہانی کوئی نہ لکھ پائے گا۔

- 23 -

عرصہ پہلے، یہاں سے بہت دور، ایک چھوٹا سا بچہ رہتا تھا۔ وہ بالی ووڈ کی فلمیں دیکھتا ہوا بڑا ہوا تھا اور اپنی شادی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ رنگ برنگے کپڑے پہننے اور سری دیوی کے گانے 'میرے ہاتھوں میں نونو چوڑیاں' پر ڈانس کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اسے مہندی لگانا بھی بہت زیادہ پسند تھا۔ آپ صحیح سمجھ رہے ہیں، وہ چھوٹا بچہ میں ہی تھا۔

ہندوستان میں جب کوئی بڑا ہوتا ہے تو مغربی ممالک کے اکثر لوگوں کی طرح اس کے لیے 'ایرینج میرج' کا خیال اتنا خوفناک نہیں ہوتا۔

ہر ایرینج میرج زبردستی کی گئی شادی نہیں ہوتی۔ یہ تھوڑا ویسا ہی ہے جیسے آپ کے گارجین آپ کے لیے معقول ساتھی کا بندوبست کرتے ہیں۔

وید بھی رضامندی کے بغیر والی شادی کو رد کرتے ہیں، جیسے 'راکھشس بیاہ' اسے کہتے ہیں جس میں ایک آدمی جبراً کسی عورت کو اپنی بیوی بناتا ہے۔ 'پشاچ بیاہ' اسے کہتے ہیں جس میں ایک آدمی ایک ایسی عورت سے جبراً تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ذہنی اپاہج ہو یا نشے میں ہو۔

بقیہ دنیا کی طرح ہی ہندوستان بھی آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہماری ثقافت رفتہ رفتہ نئے تصورات کو قبول کر رہی ہے۔ جب میں چھوٹا تھا، پڑوس میں اگر کوئی 'لو میرج' کر لیتا تو یہ ایک چھوٹا موٹا اسکینڈل جیسا ہوتا تھا جب کہ اب والدین اپنے بچوں کو اپنا ساتھی خود منتخب کرنے کی آزادی دے رہے ہیں۔

میری عمر زیادہ ہو رہی تھی اور میری ماں پدما کو فکر کھائے جا رہی تھی کہ ''جب میں نہیں

رہوں گی تو میرے بیٹے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

جب میں ۳۵ سال کا ہو گیا، خود بھی عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو گیا۔ کیا میں ایک تنہا 'گے' کی طرح مر جاؤں گا؟

ماں نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا اور ایک اخبار میں شادی کا اشتہار دے دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ مجھے جانوروں کو پسند کرنے والے ایک سبزی خور مرد کی تلاش تھی۔

ماں میرے لیے ایک ایسا انسان چاہتی تھیں جو معاشی طور پر خود کفیل ہو کیوں کہ میرے سابق مرد دوستوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا جیسے میں کوئی 'اے ٹی ایم' مشین ہوں۔

اشتہار کا مضمون تیار کرتے ہوئے، جس میں اپنے 'بیٹے کے لیے دولہا چاہیے' لکھا تھا، میری ماں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کوئی انقلابی کام کر رہی تھیں، یہ کوئی علامتی کام بھی نہیں تھا۔

کچھ بھی ہو، وہ ایک ماں تھیں جو جانتی تھیں کہ جب بچے خود سے اپنے ساتھی نہیں تلاش کر پاتے تو والدین اشتہار دے کر متوقع ساتھی تلاش کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ جب میری ۸۰ سالہ دادی کو اس بارے میں پتہ چلا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں 'ایر' لڑکا تلاش کرنا چاہیے۔ جنوبی ہندوستان میں 'ایر' ایک برادری ہے۔

اس پر ہم بہت ہنسے کیوں کہ میرے پریوار میں کوئی بھی ذات پات یا مذہب کی بنیاد پر امتیاز کرنے کا قائل نہیں تھا۔ ہم تمل ہیں لیکن میرے پریوار میں مہاراشٹر کے لوگ بھی ہیں۔ میں خود ناستک ہوں، جب کہ میرے والدین ہندو ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میرے پریوار میں عیسائی اور مسلم بھی ہیں۔ میری ماں نے اشتہار میں 'ذات پات کی بندش نہیں' کے آگے 'ایر کو ترجیح' جوڑ دیا، تا کہ یہ خالص شادی کا اشتہار لگے۔ اس میں ان کا مذاق بھی پوشیدہ تھا، دراصل یہ ذات پات پر ایک طنز تھا۔ ہندوستان میں اکثر شادی کے اشتہارات میں واضح طور پر ذات، گوتر، زبان وغیرہ کی جانکاری لکھی ہوتی ہے۔

اس اشتہار کو اکثر بڑے اخباروں نے شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن ماں نے ہار نہیں مانی، ایک 'ٹیبو لائڈ' اخبار بلا کسی عذر کے اسے چھاپنے کو تیار ہو گیا۔

یہ کہانی اسی وقت شروع ہوئی۔ میری ماں اور میری تعریف بھی ہوئی اور تنقید بھی۔ ایک طرف پریس نے اس طرح کے ایک دلیرانہ اشتہار کے لیے میری ماں کی تعریف کی تو کئی لوگوں

نے اس کے 'اَیَر کوترجیح' والی شق کی تنقید کی۔ ہمارا ایک لطیف مذاق الٹا ہم پر بھاری پڑا اور اچانک مجھے اور میری ماں کو 'نسل پرست' ٹھہرایا جانے لگا۔

ہم جنسی کمیونٹی (LGBTQ) کے لوگوں کی تنقید شدید تھی، حتیٰ کہ کئی لوگوں نے کہا کہ 'سبزی خور' کی شرط لگانا دلت اور مسلموں کے خلاف جاتا ہے کیوں کہ ان میں بیشتر غیر سبزی خور ہوتے ہیں۔

ہاں، مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی پلیٹ میں چکن اور مرے ہوئے جانوروں کا گوشت بالکل برداشت نہیں کرسکتا اور میں اس شخص کو قطعی نہیں چوم سکتا جو مردہ جانوروں کو کھاتا ہو۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ اس میں کسی کے توہین کا پہلو یا عزت نفس کو مجروح کرنے کا ارادہ شامل نہیں تھا۔ بات صرف میری پسند اور ناپسند کی تھی اور اسے مجھے ہی طے کرنا تھا۔ مجھے کیا کھانا ہے، کیا پہننا ہے، اس کا فیصلہ کوئی دوسرا کیسے کرسکتا ہے۔ خیر، میں ان سب بیہودہ ریمارکس سے اُوب چکا تھا، اس لیے میں نے اشتہارات کے جواب میں ان متوقع ساتھیوں کی پیشکش ایمیل پر دیکھنے لگا جو مجھے بھیجی گئی تھیں۔

ان میں کچھ لوگوں کی پیشکش کافی دلچسپ تھی۔ میری پہلی ملاقات ایک مندر میں ہوئی۔ سورج بڑجاتیہ کے اس سیٹ اَپ کے لیے میرے دوست نے میری بڑی کھنچائی کی۔ ''واہ! تم تو 'ہم آپ کے ہیں کون' کی رینو کا شاہنے ہو۔''

میں اسے اپنے گھر لے آیا، اسے چائے اور سموسوں کی رسموں سے گزرنا پڑا تھا، لیکن ہم دونوں کے درمیان بات نہیں بنی۔

اسی طرح کی کچھ اور ملاقاتیں ہوئیں۔ میں ایسے مردوں سے ملا جن کی نظر میری شہرت کو کیش کرانے پر لگی ہوئی تھی۔ ایک آدمی تو ایسا ملا جو پارٹیوں میں میرا ساتھی بن کر جانے کی امید کر رہا تھا تاکہ اسے 'بگ باس' میں جگہ مل سکے۔ ایک بہت ہی مہذب شخص ملے جو چاہتے تھے کہ میں ان کے بزنس میں پیسے لگاؤں۔ کچھ اور لوگ ملے جو صرف سماجی اور سیاسی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے تھے، انھیں سنجیدہ اور مستقل رشتے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ہم جنسی لوگ درویش نہیں ہوتے، وہ اتنے ہی مکار ہوتے ہیں جتنے عام لوگ۔ وہ اتنے ہی لالچی ہوتے ہیں، اتنے ہی بے رحم ہوتے ہیں جتنا کوئی دوسرا ہوسکتا ہے۔

مجھے کچھ اور یادگار ملاقاتیں یاد ہیں۔ باندرا کا ایک لڑکا مجھے ٹھیک ٹھاک لگا۔ وہ ایک

سبزی خور عیسائی تھا۔ وہ واقعی جانوروں سے پیار کرنے والا آدمی تھا۔ لیکن وہ دہلی میں ایک بہت اچھی تنخواہ والی نوکری کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں بھی دہلی آ جاؤں۔ میں یہ نہ کر سکا اور اس نے میری بات کو سمجھا۔ ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔

اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور سچ کہوں تو میری اس میں اب دلچسپی بھی کم ہو گئی ہے۔ حالاں کہ اب بھی مجھے ایک ایسے ساتھی کی تلاش ہے جو میرے لیے ہی بنا ہو۔ میں محبت پر یقین رکھنے والا بندہ ہوں اور آخری سانس تک مجھ سے میرا یقین کوئی نہیں چھین سکتا۔

- 24 -

یہ دوسری بار تھا جب میں نے اسے 'گرائنڈر' پر پکڑا تھا۔ ابھی اسے بتانا نہیں چاہ رہا تھا کیوں کہ اس کے امتحانات جاری تھے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کے امتحان ختم ہوں اور اس سے اس بارے میں بات کر سکوں۔ دل بہت بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے کھو دینے کا ڈر حاوی ہو رہا تھا۔ ویسے بھی میں نے جب سے اسے 'گرائنڈر' پر دیکھا تھا، تب ہی سے دل اُچاٹ سا ہو گیا تھا۔ آج تو اسی جھنجھلاہٹ میں خواہ مخواہ اپنے ایک آفس کولیگ کے ساتھ سے الجھ بھی پڑا تھا، ایکسل شیٹ میں بہت معمولی سی غلطی کر کے اسے مجھ سے اتنی بڑی ڈانٹ سننی پڑی... بے چارہ!

چار سال قبل ہم دونوں 'گرائنڈر' ہی پر ملے تھے۔ وہ دہرادون کالج سے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر اُدے پور آیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر یہی کوئی ۲۰ سال تھی۔ اس کے میسیج کا جواب تو دے دیا لیکن جب تک ہم دونوں ملتے، اس کے دہرادون لوٹنے کا وقت آن پہنچا، اور وہ لوٹ گیا۔ ہم نہیں مل پائے۔ چونکہ ہم نے ایک دوسرے کے نمبر آپس میں شیئر کر لیے تھے تو اب آدھی ملاقات ہونے لگی یعنی ہم اکثر فون پر بتیانے لگے اور دیر رات تک وہاٹس ایپ پر چیٹنگ معمول کا حصہ بن گئی۔ ایک ماہ بعد پھر وہ کسی کام سے جب اُدے پور آیا تو ہماری پہلی روبرو ملاقات ہوئی۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ساری رات ہم دونوں نہیں سوئے، جانے کتنے خواب ہم دونوں نے مل کر دیکھ ڈالے۔ وہ پہلی بار ہمارا باہم قفل بند ہونا، جسم کی گرمی، اس کے چومنے کا طریقہ، اس کا جوش، یہ سب مجھ میں آج بھی سنسنی پھیلا دیتے ہیں۔

ہماری ملاقات کو ڈھائی سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اب ہم ایک couple تھے، صرف Distance Relationship ایک رکاوٹ تھی لیکن ہم نے طے کیا تھا کہ جلد ہی ہم

دونوں ساتھ رہنے لگیں گے۔ اس کا کالج مکمل ہو چکا تھا اور اس کی کیمپس پوسٹنگ پہلے دُرگا پور (بنگال) اور بعد میں گاندھی دھام (گجرات) میں ہوگئی۔ اب جب بھی موقع ملتا، ہم کبھی دہلی تو کبھی جے پور یا کسی اور شہر میں مل لیتے۔ اس کے کالج کے دنوں میں ایک بار اسے سرپرائز دینے کے لیے میں دہرادون بھی ہو آیا تھا۔ اس کے چہرے کے وہ تاثرات بھولنا آسان نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بے اختیار لپٹ گیا اور بس لپٹا رہا۔ ۲۰۱۶ء میں ہم بائک پر لداخ بھی گھوم آئے تھے۔ یہ زندگی کا ایک ایسا انمول سفر تھا جس نے ہمارے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیا۔ جب وہ چھٹیوں میں اُدے پور ہوتا تو ہم آس پاس کے کسی ٹورسٹ پلیس پر پہنچ جاتے اور ایک دو راتیں وہیں گزارتے۔ کبھی جودھ پور، کبھی جے پور، رشی کیش، منالی، کسول، رنک پور، ماؤنٹ ابو؛ شہروں کی فہرست بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے رشتے کی گہرائی بھی۔ اُدے پور کے کسی ہوٹل میں رُکنا مناسب نہ تھا مگر قرب و جوار کے ہوٹلوں میں کوئی ایسا نہیں بچا تھا جہاں ہم نہ گئے ہوں۔

اسی درمیان ایک دن اس کا فون آیا کہ اس کا کام میں دل نہیں لگ رہا ہے اور وہ اُدے پور لوٹنا چاہتا ہے۔ اندھے کو اور کیا چاہئیں، دو آنکھیں اور کیا؟ وہ لوٹ آیا۔ وہ 'کیٹ' (CAT) کے امتحان کی تیاری کر کے کسی نامی کالج سے ایم بی اے کرنے کی سوچ رہا تھا۔ گھر والے دباؤ ڈال رہے تھے کہ دلّی کے کسی کوچنگ سنٹر میں داخلہ لے لے اور وہ تھا کہ اُدے پور میں ہی رہ کر تیاری کرنا چاہتا تھا۔ آخر اسی کی چلی، اور ہم دونوں پورے ڈھائی سال بعد ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ اس کے پتا جی کام کے سلسلے میں کسی اور شہر شفٹ ہو گئے تھے۔ ممی کبھی یہاں تو کبھی پاپا کے پاس۔ گویا وہ اپنے گھر میں اکیلا رہ گیا تھا، اور میں اس کے گھر تقریباً منتقل ہو گیا تھا۔ صبح جب کام پر نکلتا تو پہلے دونوں مل کر ناشتہ بناتے۔ دوپہر میں لنچ کے لیے آتا تو وہ انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ رات کو فتح ساگر پر کافی پینا، دیر رات تک ہائی وے ڈھابے پر ڈنر اور ایک دوسرے کو ڈھیر سارا وقت اور پیار... بس یہی ہمارا روزمرہ تھا۔

اس نے اُدے پور کا دوسرا بہترین اسکور حاصل کیا تھا۔ اس کے فوٹو بینر شہر میں لگے تھے۔ بڑی آسانی کے ساتھ اسے ایک معروف IIM میں داخلہ مل گیا تھا۔ خوشی کا موقع تھا تو اسے سلیبریٹ بھی کیا لیکن ایک خلش سی دل میں تھی کہ ہمارے رشتے میں ایک بار پھر لفظ 'فاصلہ' جڑنے والا تھا۔ ہم ایک دوسرے میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ الگ ہونا مناسب نہیں تھا مگر کیا کر سکتے تھے؟ پھر سے دو سال کے لیے الگ ہونے کا وقت آ گیا تھا، روک کر بھی اسے روکا نہیں جا

سکتا تھا۔ وہ چلا گیا۔

اسے گئے ہوئے تقریباً ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ ہم اب بھی ہر روز کم سے کم ایک بار ضرور بات کر لیتے تھے۔ اس ایک سال میں ہم تین بار مل بھی چکے تھے۔ مگر اس انجان فاصلے کو، جس کا کوئی سبب نہ تھا البتہ جس کی جواز جوئی ضرور کی جا سکتی تھی، ہم دونوں محسوس کر رہے تھے۔ ہماری گفتگو سے محبت رخصت ہو رہی تھی اور اس خالی جگہ کو روٹین کی باتیں بھر رہی تھیں۔ کھانا کھایا؟ آج کون سی کلاس ہے؟ آفس میں آج میں بہت مصروف رہا... اب ہماری گفتگو کے یہی موضوع تھے۔ اگر چہ اس تبدیلی کو دونوں محسوس کر رہے تھے لیکن جان بوجھ کر اس سے انجان بنے رہے۔

مجھے اچانک ہی محسوس ہونے لگا تھا کہ میں اسے کہیں کھو نہ دوں۔ جب اس سے اس بارے میں بات کی تو وہ جھنجھلا گیا۔ مجھے اب اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، اس کے کھونے کا ڈر۔ اسی ڈر کے دوران میں نے اس کی جاسوسی شروع کر دی۔ اگر چہ یہ غلط تھا اور اس کا اثر ہمارے رشتے پر بھی پڑ سکتا تھا لیکن میں اپنے ڈر کے آگے ہار گیا تھا۔ جعلی آئی ڈی اور جعلی لوکیشن سے 'لاگ ان' کر کے جب پہلی بار اسے میں 'گرائنڈر ایپ' پر پایا تو دل بیٹھ گیا۔ جعلی آئی ڈی سے اسے ایک ہوٹل میں ملنے بلایا اور وہ تیار بھی ہو گیا۔ اب پریشان ہو کر میں نے اسے فون کیا اور ساری حقیقت بتا دی۔ اس نے معافی مانگی اور پھر ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

ایک ماہ بعد یہ دوسری بار تھا۔ وہ پھر 'گرائنڈر' پر تھا۔ میں اس کے امتحان ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ سنیچر کو امتحان ختم ہوتے ہی اس سے بات کی۔ وہ بپھر کر بولا کہ اس طرح میں اب اس کی نجی زندگی میں دخل دے رہا ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ 'فیس بک' اور 'گرائنڈر' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ غصے میں اس نے یہ بھی بول دیا کہ اسے بھی دوستوں کی ضرورت ہے، وہ اکیلا ہے وہاں۔

میں اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ہم دونوں کی عمر میں ۱۰ سال کا فرق ہے۔ اس کے ملنے سے پہلے میں کئی لوگوں کے ساتھ بستر شیئر کر چکا ہوں، مگر شاید میں اسے جوانی کے پہلے پائیدان میں ہی مل گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا، شاید یہ غلط بھی نہیں ہے مگر خود کو صحیح ثابت کرنے کے چکر میں وہ جو دلیل دے رہا تھا، مجھے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں اس دن دفتر سے جلدی گھر آ گیا۔

جہاں تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ گھر پر اکیلا تھا۔ کوئی بھی نہ تھا جو مجھے چپ کراتا۔ انسان جب ایک بار رونا شروع کرتا ہے تو وہ صرف ایک ہی بات پر نہیں روتا۔ اسے اس وقت بہت ساری

باتیں یاد آتی ہیں۔ تقریباً چھ گھنٹے ہو چکے تھے، چپ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ممی اپنے دفتر سے لوٹ آئی تھیں۔ مجھے کمرے میں بند دیکھ کر انھوں نے سوچا کہ شاید دفتر میں تھک کر آیا ہوں اور سو چکا ہوں۔ کچھ دیر نیچے سے ہی انھوں نے آواز دی کہ کھانا کھا لینا اور وہ چہل قدمی کے لیے چلی گئیں۔ میں چپ چاپ کھانا اوپر لایا اور ایک طرف رکھ دیا۔ سونا مقدر میں نہیں تھا۔

ہم دونوں روز شام کو نو سے دس بجے کے درمیان ایک بار بات ضرور کیا کرتے تھے۔ اس دن اس کا فون نہیں آیا۔ میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔ رات ایک بجے تک میری آنکھیں سوج چکی تھیں۔ پھر پتہ نہیں کب نیند آ گئی۔ دوسرا دن اتوار کا تھا۔ مطلب آج ممی کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔ لیکن اس شکل کے ساتھ؟ اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ آفس سے میرے باس کا فون آ گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ سوموار کو میں فیلڈ میں جا کر ایک ٹریننگ ایرینج کروں۔ میں نے ہاں کر دی، ایک روز پہلے ہی اسی وقت نکل پڑا۔ ماں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ فون پر انھیں خبر کر دی۔

اتوار کی شام تک اس کا فون نہیں آیا، نہ ہی کوئی وہاٹس ایپ میسیج ملا۔ انہونی کے اندیشے سے دل گھبرا اٹھا۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کیا بات کروں، کیسے بات کروں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنے ٹریننگ سنٹر کی چھت پر اکیلا ٹہل رہا تھا۔ دل ہوا کہ کسی دوست سے مشورہ کیا جائے کہ اب کیا کرنا ہے۔ نوئیڈا میں مقیم ایک ہم راز کو فون کیا۔ اس نے پوری بات سنی اور کہا کہ میں چار سال کے رشتے پر ایسے کیسے شک کر سکتا ہوں۔ وہ بولتا جا رہا تھا۔

''ہم لوگوں کی یہی ایک عادت بہت خراب ہے۔ لوگوں کی زندگی میں تاکنے جھانکنے سے ہم باز نہیں آتے۔''

میں بولا، ''شک کرنا غلط تھا لیکن شک تو سچ نکلا۔''

میرے ہم راز دوست نے کہا، ''یہ سب چھوڑو۔ وہ اگر تمھیں چھوڑ کر جانا چاہے تو یوں بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اگر تم ایسی ہی حرکتیں کرتے رہے تو یقیناً وہ چلا جائے گا۔ آج کی جنریشن ہے، وہ تمھاری طرح نہیں سوچتی۔ وہ جب تمھارے ساتھ ہے تو صرف تمھارے ساتھ ہے بس۔ اس کے علاوہ کچھ اور مت سوچو۔ اب تم خود اسے فون کرو۔ اور ہاں، تم دونوں چار مہینے سے ایک دوسرے سے نہیں ملے ہو تو یہ غلط بات ہے۔ جب موقع ملے، جیسے موقع ملے، دونوں ساتھ میں کچھ وقت گزارو۔''

شام کے دس بج رہے تھے، اس کا فون ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں چھت پر بیٹھ گیا۔ خود

سے فون کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، صرف فون کو تکے جا رہا تھا۔ اچانک گھنٹی بجی۔ دوسری طرف وہی تھا۔ میں نے 'سوری' بولا اور اس نے 'کوئی بات نہیں' کہا۔ میں رو پڑا، زور زور سے ہچکیوں میں روتا رہا۔ روتے ہوئے بس یہی بڑبڑا رہا تھا کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گا، پلیز مجھے مت چھوڑنا۔ دوسری طرف سے وہ مسلسل مجھے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں تقریباً ایک گھنٹہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے رہے۔ دونوں رو رہے تھے اور ایک دوسرے سے معافی مانگ رہے تھے۔ آنسوؤں نے دونوں کے دلوں کی کدورت کو صاف کر دیا تھا۔

آج اس واقعے کو ایک ماہ گزر چکے ہیں۔ ابھی ہم دونوں رشی کیش میں ہیں۔ گنگا کنارے 'لٹل بدھا' کیفے میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے ہیں۔ رشتے کی گرمی ایک دوسرے میں سرایت ہو رہی ہے۔ ہم دونوں نے طے کیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے، خواہ ہم کسی بھی شہر میں ہوں، ہر ماہ ایک بار ضرور ملیں گے۔ ہمارا رشتہ مضبوط ہے۔ ہم نے اسے ان چار سالوں میں سینچا ہے، اسے سنوارا اور نکھارا ہے۔ دل کے سارے وہم سارے اندیشے گنگا میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ ہم دونوں انھیں بہتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ شام ہونے والی ہے۔ روشنی کر دی گئی ہے۔ کچھ لوگ گنگا آرتی میں شامل ہو رہے ہیں۔ گھنٹیاں بج اٹھی ہیں، باہر بھی اور ہمارے اندر بھی۔

- 25 -

کوئی تالا تھا جس کی چابی صرف میرے پاس تھی۔ نیم تاریک راتوں میں اپنے اندر کی تپش میں اتر کر میں نے دیکھا تھا۔ میں نے ٹھنڈ سے سہرتے ہوئے کسی ایسے اجنبی لڑکے کو اپنی بانہوں میں بھر کر آگ تاپی تھی اور پھر محسوس کیا تھا کہ ارے، اس کی شکل تو ہو بہو میری ہے۔ اس کے چہرے کو ہتھیلیوں میں بھر کر کتنے پیار سے اس کی بھوؤں کو چوما تھا۔ اس ہم شکل کی آنکھیں سرور سے کیسے بند ہو گئی تھیں۔ اس کے نیلے پڑے ہونٹ پر جمی برف پگھل رہی تھی۔ کسی نے کبھی کہا تھا نا، کہ آرکیڈ کے پھول پاس رکھو تو عمر بڑھتی ہے، بس ایسے ہی اس کے نیلے آرکیڈ اپنے پاس، اپنے ہونٹوں پر رکھنے ہیں۔ اچانک خوب طویل عمر پانے کی خواہش دل میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔

راوی:

آج کل اس نے نوٹس کیا ہے کہ اسے ہر رات سپنے آتے ہیں۔ جب سے اس سے ملا ہے تب سے۔ اس سے ملنا بھی کیا ملنا تھا۔ کسی مصروف ٹریفک سگنل پر اغل بغل دو گاڑیوں کے ڈرائیور، شیشے کے آر پار ایک دوسرے کو پل بھر میں ناپ لیں۔ سیاہ چشمے اور سالٹ پیپر داڑھی میں اٹکی آنکھ ایک بار پھر دیکھ لیں۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس بے اثری کے سبب چہرے پر نمودار مسکراہٹ بھی سرد ہوتی ہے۔ رات واش بیسین پر دن بھر کی گرد دھوتے ہوئے شیشے پر نظر جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں ہونٹوں کی بناوٹ۔ اس نے کیا دیکھا ہوگا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا، کچھ بھی نہیں دیکھا۔

اس نے کچھ مبہم وظیفہ بُدبُدایا تھا۔ اب میں تمھارے خوابوں میں ملوں گا۔ ان نیلی دھند میں لپٹی پہاڑیوں کی ترائی میں، نیلے ہاتھیوں کے جھنڈ کے پیچھے کسی پتوں بھری ٹہنی سے زمین پر جھاڑو لگاتے ہوئے تمھارے نقش قدم تلاش کرلوں گا۔

الف:

گاڑی کے شیشے کے پار گیئر نیوٹرل کرتے ہوئے وہ بے پرواہی سے مڑا تھا۔ اس کا صاف شفاف چہرہ اور پونی ٹیل میں اُگا ہوا چہرہ اچانک ایک مسکراہٹ سے تر بتر ہوگیا تھا۔ جب تک اس کی مسکراہٹ کو میں چھو پاتا، گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔ میری بانہوں کے روئیں اچانک کھڑے ہوگئے تھے۔ اسٹیریو پر لیونارڈو کوہن 'ڈانس می ٹو دی اینڈ آف لوو' گا رہا تھا۔

میرے گزشتہ چار سال کی تنہائی سبز ہاتھی گھاس کی طرح بے ترتیب سیلاب میں بڑھ آئی تھی۔ رات دیر تک تنہا بیٹھا 'جارمش' کی 'کافی اینڈ سگریٹ' دیکھتا رہا۔ سگریٹ کا دھواں پیتا رہا، بلیووڈ کا گلاس کے اندر چھلکتا رہا۔ الفریڈ مولینی کا چہرہ مجھے کھینچ رہا تھا۔ بار بار ریوائنڈ کر کے 'کنجس' والا حصہ دیکھ رہا تھا۔

کافی دنوں بعد 'نون' کی تصویر دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ تلاش کرتا رہا۔ آخر گنز برگ کے پیچھے اور نگی جوونی کے آگے دھول سے اٹی ملی۔ کسی نشے کے سرور میں فریم کو جھاڑ پونچھ کر سامنے رکھا۔ 'جارمش' کی بلیک اینڈ وہائٹ فریموں کی صفائی، ان کی لئے، کلیئر اینڈ بولڈ اسٹروکس۔ دل اسی سُر پر تھرک رہا تھا۔ اس رات کئی دنوں بعد، کئی کئی دنوں بعد 'نون' میرے ساتھ تھا۔ وہ اپنے جسم کے ہمراہ میرے ساتھ تھا۔ اس کے جنگلی گھنگھریالے بالوں کی خوشبو اور ان کا سخت لمس میرے ہاتھوں میں تھا۔ اس کا جسم میرے جسم میں جذب تھا۔ نیلے اندھیرے میں اس کے پیٹ کے نیچے ناف پر میرے ہونٹ گنگنا رہے تھے۔

اس کے جسم کی لکیریں لمبی اور نازک تھیں، میرے پوروں کے نیچے دہکتی ہوئی۔ اس کا مفتوح جسم نرگسی تھا جیسے میری محبت، میرا اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لینا، کسی جنون کے حوالے خود کو کردینا، اس دھیمے رقص کا کسی شعلہ بار سینے کے مہانے سے نیچے گرنے کا عظیم الشان کھیل۔ جارمش کے فلم کی طرح بلیک اینڈ وہائٹ میں کوئی گنگناتی مصوری۔

وہ ان چار سالوں کے بعد اب بھی میرے ساتھ تھا۔ میرے منھ میں صبح ہینگ اوور کا کھٹا ذائقہ تھا۔

جیم:

دن میں بڑی میز پر پوسٹر اور کاغذ پھیلائے میں دھوپ پیتا ہوں۔ میرے پاس دو ماہ کا وقت ہے۔ اس کے اسکرپٹ کے لفظوں کو میں زبان پر گھلتے محسوس کرتا ہوں۔ ہر لفظ کے معنی تین چار ہوتے ہیں۔ لیکن میں اس میں خفیہ اشارہ تلاش کرتا ہوں۔ لفظوں اور جملوں کے سطحی معنوں کے اندر بہتی ندی جو صرف میرے لیے کہی گئی ہے۔ ان معانی کے حوالے تلاش کرتا ہوں۔

اس دن میں نے کہا تھا کہ میں جانا چاہتا ہوں؛ آذر بائیجان یا پیرو یا پھر قاہرہ کی تنگ گلیوں میں۔

اس دن اس نے لکھا تھا اس لڑکے کی کہانی جو کہیں نہیں جاتا، جو صرف پوری زندگی ایک جگہ گزارتا ہے۔

پھر کہا تھا میں نے کہ چھٹکی ہوئی دھوپ میں اداس رنگ کیوں لگتے ہو؟

اس دن اس نے لکھا تھا، رنگ رنگ ہوتے ہیں۔ وان گوگ کے اس کمرے کی بات کی تھی جہاں رنگ چٹکے ہوئے دھوپ سے کھلتے تھے، کسی خواب میں۔

پھر اس نے کہا تھا، سنو میں 'نون' سے ذرا ذرا نفرت کرتا ہوں۔

اور میں نے سنا تھا، سنو میں 'نون' کو اب بھی بھول نہیں پایا ہوں۔

پھر اس نے کہا تھا کہ اگر یہ 'الیسٹریشن' صحیح نہ بنے تو میں انھیں پھینک دوں گا۔

میں نے کہا تھا، بھاڑ میں جاؤ۔

شام کو اس نے فون کیا تھا۔

میں نے پوچھا تھا، کہاں؟

اس نے کہا تھا، وہیں جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا، بھاڑ میں۔

اس کی آواز کی ہنسی نے مجھے تپا دیا۔ اس نے فون رکھ دیا تھا۔ میں نے فون بہت دیر تک نہیں رکھا تھا۔ اس دن میں نے ڈھیر سارے اسکیچ بنائے تھے۔ حیرت زدہ منھ کھولے لڑکے

کی، ایک قطار میں تالاب کے کنارے چلتے ہوئے بطخوں کی، جنگل کے ایک کنارے اکیلے گھر کی، دوڑتے چوہوں کی اور آخر میں دو آنکھیں، بس۔ میری انگلیاں تڑخ رہی تھیں۔ رات کے بارے بج رہے تھے۔ میں نے اسے فون کیا۔

سنو، آجاؤ۔

اس نے کہا، کیوں؟

میں نے کہا، اس لیے کہ میری گردن دُکھتی ہے، میری پیٹھ اکڑتی ہے، آجاؤ۔

میری آواز کی اکڑ ختم ہوگئی تھی۔ اس نے فون رکھ دیا۔ میں سو گیا، تھکی ہوئی نیند میں۔

راوی:

وہ دن میں پانچ بار ملتے تھے، گن کر پانچ بار۔ اور پتہ نہیں کتنی بار فون کرتے تھے۔ وہ ۴۲ سال کا ناموری کے راستے پر گامزن قلم کار تھا۔ یہ نامور ہونے کی راہ پر ۴۸ سال کا السٹریٹر تھا، مصور تھا۔ انگریزی میں شاعری کرتا تھا، باریک پُرجوش دل توڑنے والی جنگلی آگ جیسی نظمیں۔ یہ اپنے پیچھے دو ٹوٹے ہوئے رشتے چھوڑ آیا تھا۔

وہ پڑھاتا تھا، تھیٹر کرتا تھا۔ کبھی پینٹ بھی کیا کرتا تھا۔ اب ساری پینٹنگز کہیں دھول کھاتی ہیں۔ وہ ایک بیوی اور جانے کتنے رشتے چھوڑ آیا تھا۔

جیم:

جب اس نے اس سے یوں ہی پوچھا تھا، سوؤ گے میرے ساتھ؟ میں نے کیوں اسی وقت اس کو تھپڑ نہ مار دیا؟ کیوں اسی وقت اس کا اسکرپٹ اس کے منھ پر نہ دے مارا؟ کیوں نہیں دنیا کو سر پر اٹھالیا؟

کیوں چپ چاپ سارے کاغذ فولڈر میں سمیٹ کر اٹھ آیا۔ کیوں انتظار کیا کہ وہ پھر سے ایسی کوئی بات کہے۔ کیوں رات کو برسوں بعد کسی کے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ تصور کر کے سنسنی محسوس کی۔ کیوں اس کا چہرہ اپنے چہرے پر جھکا ہوا تصور کر کے شدت سے طلب ہوئی کہ بس ابھی، ابھی ابھی ابھی، ایسا ہوجائے۔

الف:

میں اس کے ساتھ سونا تک نہیں چاہتا تھا۔ میں صرف 'نون' کے ساتھ اب بھی سونا چاہتا تھا۔ میں صرف اس کی شکل دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے ایسا سنتے ہوئے۔ میں صرف 'نون' کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں 'ک' کو قطعی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ اب وہ جھنجھلا کر میرے چہرے پر سارے اسکیچ پھینک مارے گا۔ میں نے سگریٹ ہتھیلیوں کی اوٹ لے کر سلگایا اور کہا۔

تین دن بعد، تین دن ہاں، اور مجھے پہلی کھیپ والے اسکیچز چاہئیں۔

میں اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے اسے ایسے بے ردعمل جاتا دیکھ کر اس سے نفرت ہوئی تھی۔ اس دن ڈھیروں کام تھے، بھاگ دوڑ تھی، کم از کم سوکلومیٹر ڈرائیو کیا تھا، دفتر کے چکر کاٹے تھے، کسی سے الجھا تھا۔ ان سب کے درمیان اس نفرت کو مٹھی میں دبائے دن گزارا تھا۔ شام کو پرانے ساتھی پلاش کا فون آیا تھا۔ تمھیں پتہ ہے 'نون از اِن ٹاؤن۔

'اچھا! گڈ۔ اپنی سرد آواز پر مجھے خود حیرانی ہوئی۔

جیم:

اس نے بتایا تھا نون شہر میں ہے۔ میں نے اس کے چہرے کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ اس کی آواز کو گرفت میں لینے کی جدوجہد کی۔

ملنے جاؤ گے؟ میری آواز حسب معمول تھی، بالکل کسے ہوئے تار جیسی۔

دیکھیں گے۔

اس کی آواز میں بے نیازی تھی۔ مجھے احتیاط نظر آیا، بے نیازی کی کوشش میں ہشیاری نظر آئی۔

الف:

'نون' بہت بدل گیا تھا۔ بہت۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے اپنے بال ایک دم چھوٹے کرا رکھے تھے۔ سگریٹ پیتے ہوئے اس کی کلائیاں اب بھی اسی طرح پتلی تھیں۔ جانے

کتنی بار اس کی ان کلائیوں کو اپنی ہتھیلیوں کی گولائی میں جکڑا تھا۔ اب چھو بھی نہیں سکتا۔ کیا 'نون' ان خوب صورت لمحوں کے بارے میں سوچ رہا ہوگا؟ کیا اسے میرا جسم یاد ہوگا؟ میں نے ایک سرد جستجو کے ساتھ سوچا۔

نون:

اب تک بھی... اس پر کچھ بھی نہیں گزری۔ میں تھا ساتھ، ابھی اتنے سال بعد ہم ساتھ بیٹھے ہیں لیکن اس کے چہرے پر کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اپنے سیاہ چشمے اور صاف پیشانی میں، اپنی بھوری سفید داڑھی میں... اوہ، ہی اِز اسٹل اے ہینڈسم بروٹ، ہارٹ لیس اینڈ ہینڈسم۔ صرف ایک کافی بس۔ اس کی چھاتی کے بال ہوا میں ذرا سا ہلتے ہیں۔ میں اگر اپنی انگلیاں بڑھا کر سہلا لوں ایک بار، جیسے پیار کرنے کے بعد ہر بار۔

میں بیگ سے سیل فون نکالتا ہوں۔ کسی کا فون آیا ہے۔ وہ مجھے بات کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ہے۔ کچھ کچھ اس طرح کی مسکراہٹ جیسے وہ کسی عزیز ایڈیٹر یا پبلشر کو دیتا جو اس کی کہانی یا کتاب چھاپ رہا ہو۔

اس کے ساتھ رہ کر ہمیشہ ایسا ہی محسوس کیا جیسے میری روشنی پر اس کا اندھیرا بھاری پڑتا ہو۔

میں اسے اپنی کتاب دکھاتا ہوں۔ بچوں کے لیے لکھی کتاب۔ میری تیسری کتاب۔ کتاب کے کور پر خرگوش کسی چھلے گھٹنے والے، گرے ہوئے بالوں والے لونڈے کی پیٹھ پر سوار تھا۔ لونڈے کے سر پر ایک لمبی چونچ والا توتا اور قمیص کی جیب سے شیطان گلہری جھانکتی تھی۔ باریک لکیروں والا شاندار اسکیچ۔

الف:

اس کی کتاب دلچسپ تھی۔ شاندار سرورق، چمک دار کاغذ، خوب صورت چھپائی۔ میں نے کتاب ہاتھ میں لی۔ کتاب کے سرورق کا السٹریشن عمدہ تھا۔ بے حد عمدہ۔ ان لکیروں کو میں پہچانتا تھا۔ ان کے ایک ایک پنسل اسٹروک اور بلیک پین کی شیڈنگ میری اپنی تھی۔ میرے سینے

میں ایک اداسی سوار ہوگئی۔

'نون' ہنس رہا تھا۔ اپنے پبلشر کے سنکی پن کے قصے سنا رہا تھا، آئرش کافی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ بغل کی میز پر بیٹھا لڑکا اسے تاک رہا تھا۔ 'نون' اس بات سے لاپرواہ تھا۔ اسی لاپرواہی میں اس کی خوب صورتی چھپی ہوئی تھی۔ پہلے ہم کہیں جاتے اور لوگ اس کو دیکھتے، مجھے اچھا لگتا تھا۔ اب بھی تھوڑا بہت اچھا ہی لگ رہا تھا۔

'نون' تم بالکل نہیں بدلے۔

لیکن تم بدل گئے۔ اس کی آواز اچانک کوئی راز شیئر کرنے والی سرگوشی میں بدل گئی۔

اچھا! میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ پلاش نے کہا تھا، 'نون' آج کل کسی ریکارڈو ایرزا نام کے لاطینی امریکی کے ساتھ ہے۔ کچھ بزنس ہے اس کا، کچھ پبلشنگ ہاؤس بھی چلاتا ہے، پیسے والا ہے۔ 'نون' کو ہمیشہ خوب پیسے چاہیے ہوتے تھے۔

اس کی انگلیوں میں ہیرے جگمگا رہے تھے۔ 'نون واز آلویز ویری ایمبیشیس'۔ ایمبیشیس تو خیر میں بھی تھا۔ اب بھی ہوں۔

افسوس بدلے میں، میں تمھیں اپنی کتاب نہیں دے سکتا۔ میں کچھ گھٹیا مذاق کرنا چاہتا تھا... کچھ امیزنگ وِٹ کا شاہکار پیش کرنا چاہتا تھا۔

میں نے تمھاری کتاب کے ریویوز پڑھے تھے۔ 'یو ہیو جوائنڈ دی لیگ۔' 'نون' کی آواز میں ایک جعلی جوش تھا۔

شاید لیکن 'نون' اب میں نکلتا ہوں... پھر ملتے ہیں۔ اس کی کتاب کو بغل میں دبائے میں نکل آیا تھا۔

جیم:

اس کا فون تین بار آیا اور میں نے تینوں بار نہیں اٹھایا۔ آج کئی دن بعد مایا ملی تھی۔

کیا کرتے رہے ہو ان دنوں؟ اس نے پوچھا تھا۔ ایک کتاب کا سرورق اور اندر کے اسکیچز بنا رہا ہوں۔

کس کی؟
میں نے اپنی آواز کو حتی المقدور سپاٹ بناتے ہوئے اس کا نام لیا۔
یو بی کیئر فل، ہاں۔
مطلب؟ میری آواز اب بھی سپاٹ ہی تھی۔ تمھیں پتہ ہے اس کے پہلے پارٹنر نے اس کی پہلی کتاب میں اس کی بہت مدد کی تھی۔
کیا؟ 'نون' نے؟ مایا کی بھنوویں اوپر اٹھی تھیں۔
اچھا تو وہ اسے 'نون' بلاتا ہے مگر 'نون' تو کوئی...
میں چپ ہو گیا تھا۔ سچ مجھے تو بالکل علم نہیں تھا کہ 'نون' کون ہے، کرتا کیا ہے؟ پھر میں نے یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ کوئی سنکی فتوری لڑکا تھا جس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اچھا کبھی الف نے ایسا کچھ کھل کر کہا بھی نہیں تھا لیکن وہ لفظوں کا جادوگر تھا۔ کچھ لفظوں کی زمین پر پوری کہانی خلق کر لینے کی اس میں صلاحیت تھی اور بھلا مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔
میری شریانوں میں خون کی گردش سست ہونے لگی۔ میں سرد پڑ رہا تھا۔
کتاب جب تقریباً مکمل ہو رہی تھی تو تمھارے الف نے اپنے پارٹنر نون کو چھوڑ دیا۔ اسے لوگوں کو استعمال کرنا خوب آتا ہے۔
بطور ردعمل میں اپنے بازوؤں اور ہتھیلیوں کو گرمانے کے لیے رگڑ رہا تھا۔
دیر رات فون کی گھنٹی بجی۔ الف کی غصے بھری آواز کسی تیز نیزے کی طرح مجھے چبھ رہی تھی۔ وہ تقریباً چیخ رہا تھا۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟ یہ کیا روز روز کا تماشہ ہے تمھارا؟
چلاؤ مت۔ میں بھی ایک اجنبی غصے میں کانپنے لگا۔
اندر گھستے ہی اس نے دروازہ بند کیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔
دو منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے متوازن آواز میں کہا، تم نے کبھی کیوں نہیں بتایا کہ نواز کی کتاب کا سرورق تم نے بنایا ہے؟
میں جیسے آسمان سے گرا۔ نواز؟ نون؟
مجھے کہاں پتہ تھا کہ تمھارا نون، نواز عبداللہ ہے۔ تم نے کبھی بتایا؟
مجھے لگا کہ تم جانتے ہو گے۔ سب جانتے ہیں۔ اس کی آواز تھکی تھکی تھی۔ اس نے

بالوں کو ماتھے کے پیچھے انگلیوں سے سمیٹا، پھر اپنی داڑھی کے بال انگلیوں سے سنوارے۔ میں کسی ہپناٹائزڈ جانور کی طرح اسے دیکھتا رہا۔

جیم، میں بہت تھک گیا ہوں۔

وہ دھیرے سے صوفے پر لمبا ہو گیا۔

میرے لیے ایک کافی بنا سکتے ہو؟ پھر میں نکلوں گا۔

میں جب کافی لے کر لوٹا تو وہ کسی بچے کی طرح صوفے پر ادھ لیٹا سو رہا تھا۔ اس کی انگلیاں نکوٹین سے پیلی پڑ گئی تھیں۔ اس کے کان کے لَو سرخ تھے، اس کے سفید بھورے بالوں کے پیچھے اس کی کنپٹی صاف ستھری تھی اور اس کی کہنی بالکل بھی سخت نہیں تھی۔ مجھے سخت کہنی والے اور سخت پیروں والے لوگ ناپسند تھے۔ روی کے پیر سخت تھے، کھردرے اور موٹی چمڑی والے۔ ملاقات کے دوران میں نے اس کے پاؤں نہیں دیکھے تھے۔ جب ہم ساتھ رہنے لگے تھے تب ہر رات میں اسے کریم کی شیشی پکڑاتا تھا۔ رات کو میرا پیر اس کے سخت چمڑے والے گھڑیالی پیر پر پڑتا تو میں کسی کراہیت سے بھر جاتا۔ پھر بھی میں مشفق تھا۔ ایک بچے کی معصومیت بھری شفقت۔ میں اسے ہر وقت خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی خوشی لینا سیکھ گیا تھا۔ دینے کا سبق اس نے پڑھنے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی۔ جب دو سال ساتھ رہنے کے بعد ایک دن، بالکل ایسے ہی کسی عام دن میں بے چینی سے اس نے کہا تھا۔

میں ایک دن نکل جاؤں گا۔

میرے خاموش رہنے پر اس نے جھنجھلاہٹ بھری آواز میں کہا تھا، تم سمجھو گے نہیں، اس دنیا میں کیا ہم صرف سیکس کرنے آئے ہیں؟ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جنھیں کرنی ہے اور یہاں رہ کر وہ چیزیں انجام نہیں پا سکتیں۔ زندگی کے اور بھی مقصد ہیں۔

میں نے کہا تھا، میں تمھیں نہیں روکوں گا۔

اس کے چہرے پر سکون اور دُکھ کا ایک عجیب آمیزہ نظر آیا تھا؛ چھوٹ جانے کا اور چھوڑ جانے کا۔

الف کو سوتا چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ صبح نیند میں محسوس ہوا کہ کوئی میرے بغل میں لیٹ رہا تھا۔ کسی کے ساتھ سونے کی عادت برسوں پہلے چھوٹ چکی تھی، کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔

راوی:

ان کے جسم ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے، جیسے وہ اسی کے لیے بنے ہوں۔ ان کی سانسیں بھی ایک ساتھ اٹھتی اور گرتی تھیں۔ جیسے پرندے شام کو گھونسلے میں لوٹتے ہوں، جیسے کھیل سے تھکا ہارا بچہ ماں کی گود میں نڈھال ہو کر گرتا ہو اور پُرسکون ہو جاتا ہو، ایسے ہی ان کے جسم ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔ ان کی جلدیں آپس میں یوں ٹکراتی تھیں جیسے وہ دونوں ایک تھے، یوں ایک تھے جیسے سانسیں بھی ایک ہو کر ہی نکلتی ہوں کہ جو ہوا ان کے درمیان میں تھی وہ بھی ان کی تقسیم کی ہوئی تھی۔ زبان کے کنارے پر جو احساس تھا، انگلیوں کے ناخن پر جو لمس تھا، ناک کے نکیلے کونے پر جو تھرتھراہٹ تھی، وہ دونوں سے ہو کر گزرتی تھی۔ جو ایک محسوس کرتا تھا وہی دوسرا بھی اور اس عمل میں بھی وہ ایک تھے۔ انھیں لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے درمیان کسی پُل کی ضرورت نہیں تھی۔

الف:

جیم کے سانولے جسم پر میرے آنسو کیسے پھیل گئے تھے۔ میری انگلیوں کے نیچے اس کی ہڈیاں نرم ہو کر پگھلتی تھیں۔ میں اور وہ کسی ندی کی طرح بہہ رہے تھے۔ اگر اس وقت وہ کچھ بھی پوچھتا یا کہتا تو میں ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ اپنی مردانگی کے مارے ٹوٹ جاتا۔ اسے میں کیوں کر بتاتا کہ بس یہی ایک اکلوتا سچ ہے۔ بھلا کیسے بتاتا کہ میرے سارے لفظ بیکار ہیں، کہ صرف وہ ہے صرف وہ، اس کے گداز کولھوں پر میں نے اپنی انگلی سے اپنا نام لکھا ہے، یہ کیسے بتاتا۔

جیم:

اس کے جسم میں سمٹا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کے گوشوں سے میرا پیار رواں تھا۔ اپنی انگلیوں سے اس کے زیرِ ناف میں اس کا نام لکھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہیں پتہ، کچھ بھی تو نہیں معلوم۔

جیم:

آج اس نے میرے آدھے اسکیچز لوٹا دیے۔

نہیں، یہ اس موڈ سے بالکل الگ ہے جیسی میں چاہتا تھا۔
میں بحث کر رہا تھا۔ وہ تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ میں غصے میں نکل آیا تھا۔
بہت دیر تک سڑک پر بلا مقصد چلتا رہا۔ شام اتر رہی تھی۔ سڑک کی دونوں طرف روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ مجھے ایک دوسرا اسائنمنٹ ملا تھا جسے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ الف کی کتاب کا کام ختم ہوتا تو اس پر شروع ہو جاتا لیکن اس کی کتاب ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔
ابھی تک الف نے کبھی میری تعریف نہیں کی۔ برا نہیں ہے یہ، اس سے زیادہ اس نے کبھی کچھ نہیں کہا اور میں جو اس کا عادی تھا کہ لوگ میرے السٹریشن کے لیے 'سپرلیٹیو' استعمال کرتے تھے... میں الف سے 'وائی شڈ آئی ٹیک دِس فرام ہم؟ وائی؟''
ڈاکٹر سوس کی گرین ایگس اینڈ ہیم یاد کرو... ولسن پریسٹن کے اسکیچز یاد کرو... چارلس ڈانا گبسن کا کچھ دیکھا ہے تم نے؟ سیکھو سیکھو جیم... خود کو الگ ہٹا کر دیکھو... کیپ یو آئز اوپن، وائڈن یور سینسی بلیٹیز۔
جان شیلی کے بلیک اینڈ وہائٹ الیسٹریشن دیکھے؟ یہ دیکھو... کسی دراز سے فوراً کوئی فولیو نکال کر الف میری طرف بڑھاتا... یہ دیکھو... اس کی انگلیاں کسی دو چوٹی والی ڈسٹ بن اٹھائے حیران لڑکی، کسی گول چشمے والے لڑکے یا کسی عورت کے پیچھے...

اس کا خالی کمرہ، الماری میں لٹکے ہوئے اس کے کپڑے، ٹروزر، بیلٹ، برموڈا، ٹی شرٹس، جینز، بستر کے نیچے رکھے اس کے جوتے، دیوار پر ٹنگی ہوئی اس کی تصویر، کھڑکی میں لٹکے نیلے رنگ کے 'ورٹیکل بلائنڈز' جو اس نے کچھ دنوں قبل ہی خریدے تھے، گلدان میں لگے اس کے پسندیدہ رجنی گندھا کے پھول۔ بک شیلف میں اس کی پسندیدہ کتابیں؛ آرتھر ہیلے، ایملی برونٹس۔ کافی بحث و تمحیص کے باوجود اس نے ہیمنگ وے یا کافکا نہیں پڑھا۔ میں جب بھی اس سے کہتا، اس کا ایک ہی جواب ہوتا، تم کیسے ان بورژوا کو برداشت کر لیتے ہو؟ میں تھوڑا جھنجھلا جاتا۔ کمرے کے دروازے پر لٹکتی چائنیز بیلس، جو ہر ماہ وہ بدل دیتا تھا۔ کمرے کے کنارے رکھا ہوا ٹیرا کوٹا پاٹ جو اس نے خود پینٹ کیا تھا اور مجھے اس نے کئی بار یہ بات بتائی تھی کہ یہ اس نے پینٹ کیا ہے جیسے وہ کوئی نیا انکشاف کر رہا ہو۔ اس سلیٹی رنگ میں تھوڑی گڑبڑ ہو گئی، ہے نا؟ اگر صرف بلیک اینڈ وہائٹ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ کچھ لمحے اس پاٹ کو دیکھ کر پھر اسے ہی دیکھنے لگتا اور وہ میری طرف دیکھتا

کہ شاید میں اس کی اس پینٹنگ پر کوئی تبصرہ کروں گا۔ اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھا لیمپ جو کیوپڈ کی کانچ کی برہنہ مورتی ہے اور کیوپڈ کے ہاتھ میں کچھ ہے جس میں بلب جلتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے؟ میں نے اکثر جاننا چاہا۔ کمرے میں پھیلی مشک کی ہلکی خوشبو والا 'روم فریشنر' جو اس کمرے کی شناخت سا بن گیا ہے۔ کہیں اور اس خوشبو کو سونگھنے پر بھی اس کمرے میں ہونے کا وہم ہوتا ہے۔ دیوار پر بستر کے ٹھیک سامنے لٹکی ہوئی ایک تصویر ہے جیسے اکثر پرانے اطالوی چیپلوں پر نشاۃ ثانیہ کے زمانے کی مائیکل اینجلو وغیرہ کی پینٹنگ ہوتی تھی۔ لیکن وہ نہ تو مائیکل اینجلو تھا اور نہ لیونارڈو دی ونچی، وہ کسی اور کا تھا، جس کے بارے میں نے نہیں سنا۔ جتنوں کو میں جانتا تھا، ان میں سے وہ نہیں تھا۔ اس تصویر میں بوریت تھی اور میں نے اسے کئی بار کہا تھا کہ وہ اس تصویر کو وہاں سے ہٹا دے لیکن وہ نہیں ہٹی اور اکثر اسے دیکھ کر مجھے کوفت ہوتی تھی۔ میں نے اس کمرے کو کبھی اتنی غور سے نہیں دیکھا تھا جیسے اسے آج دیکھ رہا ہوں۔ اب اس بے جان سے کمرے میں اسے ٹٹول رہا ہوں۔ لگتا ہے اس کمرے کی ہر چیز کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ ہر چیز بول سکتی ہے، وہ اپنا تعارف خود کرا سکتی ہے۔ کسی بھی چیز کو دیکھتا ہوں تو کچھ باتیں اور کچھ منظر یاد آ جاتے ہیں اور پھر میں دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ ان چیزوں کے پیچھے جو کچھ ہے، وہ مجھے بے چین کر رہا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اور ان کے پیچھے جو کچھ ہے، اسے محسوس کر کے میں بھر نہیں جاتا بلکہ مزید کچھ خالی ہو جاتا ہوں۔ ان چیزوں کو ٹٹول کر میں پہلے سے زیادہ بڑا بھکاری ہو جاتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میرے اندر کچھ اُمنڈتا ہے جو مجھے انھیں دیکھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

اور بھی بہت کچھ ہے جو باہر نہیں ہے لیکن جسے میں محسوس کرتا رہا ہوں۔ اس کی ڈائری جسے اس کے جیتے جی کبھی میں نے ہاتھ نہیں لگایا تھا، اس میں جگہ جگہ میرا ذکر تھا۔ اس میں اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا، صرف میں ہی میں تھا۔ اس کی پسندیدہ میگزین 'ریڈرس ڈائجسٹ' اور 'سوسائٹی' جن کے صفحات پر قینچی چلائی گئی تھی، وہ انھیں اپنی ڈائری میں چپکا لیتا تھا جن میں کوئی اقتباس، کوئی تصویر اور اکثر ریڈرس ڈائجسٹ کے آخری صفحے پر چھپنے والی پینٹنگ وغیرہ ہوتے تھے۔ میں اکثر اس کی حماقت پر خوب ہنستا تھا اور وہ مجھ سے اپنی ڈائری چھین لیتا۔ کبھی کبھی جھنجھلا بھی جاتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اب میں اکثر اس کی چیزیں ٹٹولتا رہتا ہوں۔ ان چیزوں میں وہ نہیں ہے، بس اس کے ہونے کا جھوٹ ہے۔ وہ نہیں آ سکتا اور یہ چیزیں اس کے ساتھ جا نہیں پائی ہیں، یہ یہیں رہیں گی اسی دنیا میں۔ جو خالی ہو گیا ہے، وہ ہمیشہ اب خالی ہی رہے گا۔ اس خالی پن کا

کوئی متبادل نہیں۔ اس بیچارگی کا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ رُندھے ہوئے گلے اور آنسو بے جان ہیں، ان سے کچھ نہیں ہوتا، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ بے معنی ہیں۔ ایک کمزوری ہے جو روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ جب ان چیزوں کو ٹٹولتا ہوں تو یہ کمزوری اور بڑھ جاتی ہے۔ ان چیزوں کو ٹٹول کر میں کہیں نہیں پہنچتا ہوں، سوائے اس کے کہ بہت وقت اچانک گزر جاتا ہے۔

اچانک میں سوتے سے جاگ پڑا۔ وہ اپنی بالکنی میں کھڑا تھا، مجھے جاگا ہوا دیکھ کر بستر کے پاس چلا آیا، اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

کیوں کیا ہوا؟

تمھیں تو پسینہ بھی آ رہا ہے۔

بُرا خواب تھا۔

کیا تھا؟

میں نے دیکھا کہ تم مر گئے ہو اور میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

مذاق اڑا رہے ہو؟

تم کسی ایسے شخص کے بارے میں بتا سکتے ہو جو صبح سویرے خواب میں مر گیا ہو؟

میرے اندر ایک ساتھ الگ الگ جڑوں والی کئی بات اُگ آئیں اور ان میں سے ایک اُچھل کر باہر آ گئی جیسے کوئی بھنتے ہوئے پاپ کارن میں سے ایک باہر جست لگا جاتا ہے۔

تم کہیں اور کسی جگہ نہیں مر سکتے، سوائے خواب کے... میرا مطلب اگر تم مر بھی جاؤ تو جیسے تم صرف میرے خوابوں میں مرے ہو۔

- 26 -

''ہرنے ورما کے خاص دُوت راج پروہت مہاراج کے درشن کی اجازت چاہتے ہیں۔''

''حاضر کرو۔'' پنچال راج دروپد نے مسکراتے ہوئے اجازت دی۔

یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ہرنے ورما نے اپنے راج پروہت کو بھیج دیا ورنہ وہ خود ان کے پاس سندیش بھیجنے والے تھے۔ دروپد سوچ رہے تھے۔ شکھنڈی کا بیاہ ہو چکا تھا۔ ہرنے ورما کی بیٹی راج پریوار کی بہو بن چکی تھی۔ اب انھیں اپنے اصل ہدف کی طرف قدم بڑھانا چاہیے جس کے لیے انھوں نے یہ رشتہ قبول کیا تھا۔ ہرنے ورما جیسا شکتی شالی راجا جس کا سمدھی ہو، اس دروپد کو اب کوروؤں سے نمٹنے میں مزید دیری نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے وقت آن پہنچا ہے، دروپد نے سوچا۔

''مہاراج کی جئے ہو۔ میں آپ کے لیے اپنے مہاراجا کا سندیش لے کر آیا ہوں۔'' راج پروہت نے کورنش بجاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے مہاراج ہمارے سمدھی ہیں، ہم دونوں ایک ہی پریوار ہیں۔ اس لیے بنا کسی جھجک کے سندیش سنایئے۔''

راج پروہت کے چہرے پر الجھن صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ کچھ ایسا تھا، جسے کہتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا، اس کی زبان اس کا ساتھ دینے سے انکار کر رہی تھی۔

''کیا بات ہے راج پروہت؟ آپ سندیش سنانے میں سنکوچ کیوں کر رہے ہیں؟''

''پنچال راج، بات یہ ہے کہ میرے مہاراج کا سندیش سیاسی نہیں، پریوار کے

سمبندھ میں ہے۔اس لیے میری خواہش ہے کہ یہ سندیش یا تو میں آپ کو اکیلے سناؤں یا پھر صرف پریوار والوں کے بیچ۔'' راج پروہت نے رُکتے رُکتے کہا،''اس سندیش کو بھرے دربار میں کہہ جانا دونوں راج پریواروں کی عزت واحترام کے خلاف ہوگا۔''

دروپد کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوگئیں۔

''آیئے۔'' بالآخر دروپد نے راج پروہت کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور خود دربار سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''مہاراج! ہمارے مہاراج ہرنے ورما نے آپ کو پیغام بھجوایا ہے کہ پنچال راج یعنی آپ نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے... اور...''

''ہم نے دھوکہ کیا ہے؟ کیا ہم نے اپنے بڑے بیٹے کا بیاہ ان کی بیٹی سے کرکے ان کا اپمان کیا ہے؟'' دروپد کا لہجہ اونچا ہوتا چلا گیا۔ وہ غم و غصے میں نظر آرہے تھے، ان کے سمدھی نے ان پر بہتان باندھا تھا۔

''مہاراج مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کریں مگر،'' راج پروہت کی الجھن اب اس کی لڑکھڑاتی زبان سے عیاں ہورہی تھی،'' ہمارے مہاراج کو یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ نے اپنے جس بیٹے کا بیاہ ان کی بیٹی سے کیا تھا، آپ کا وہ بیٹا مرد نہ ہوکر عورت ہے۔''

راجا دروپد اس دھماکے سے خود کو سنبھال نہ پائے، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا؟... تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ بیٹا جس کی میں نے پرورش کی، چھوٹے سے بڑا کیا، اس کے بارے میں، میں خود نہیں جانتا کہ وہ میرا بیٹا ہے یا بیٹی؟'' دروپد نے پھرکاٹ کھانے والی نظروں سے راج پروہت کو دیکھا،''اور یہاں سے میلوں دور راجہ ہرنے ورما اپنے گھر پر بیٹھے یہ سچ جان گئے اور اب مجھے پیغام بھجوا رہے ہیں کہ شکھنڈی میرا بیٹا نہیں، بیٹی ہے؟''

''جی ہاں مہاراج، انھیں یہی اطلاع ملی ہے۔'' راج پروہت نے سر جھکائے ہوئے ادب سے کہا۔

''کس سے ملی ہے یہ اطلاع؟ کیا تمھارے راجا نے ہمارے محل میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں؟'' دروپد کا غصہ چڑھتا جارہا تھا۔

''آپ کی بہو نے خود اپنی داسیوں کے ذریعے یہ اطلاع اپنے پتا کو بھجوائی تھی۔''

دروپد کو جیسے سکتہ مار گیا۔ اگر خود ان کے بیٹے شکھنڈی کی بیوی یہ دعویٰ کر رہی ہے تو وہ اسے کیسے جھٹلا سکتے ہیں؟ کسی باپ کو بھلا یہ کیوں کر علم ہوسکتا ہے کہ اس کا بیٹا، مرد ہے یا نامرد؟ لیکن یہ راج پروہت تو اسے عورت بتلا رہا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

''ہماری بہو نے اپنے پتا کو کیا اطلاع دی ہے،'' دروپد کی آواز اب نرم تھی، اس میں ایک تجسس بھی پوشیدہ تھا،''اس نے میرے بیٹے کے بارے میں کیا بتایا کہ وہ نامرد ہے، وہ پتی بننے لائق نہیں ہے یا باپ نہیں بن سکتا؟''

''راج کماری کی اطلاع کے مطابق، راج کمار شکھنڈی مرد نہیں ہیں ۔ وہ نامرد یا ہیجڑے نہیں بلکہ عورت ہیں؛ ایک مکمل عورت ۔ آپ سمجھ سکتے ہیں مہاراج کہ ایک عورت کے لیے کسی دوسری عورت کو اپنے پتی کے روپ میں قبول کرنا کتنا کٹھن ہے۔''

''ٹھہرو راج پروہت، ٹھہرو۔'' دروپد نے اپنا سر پکڑ لیا۔''میں نے اپنے جیون میں بہت سے چمتکار دیکھے لیکن اتنا حیران کسی نے نہیں کیا۔ تمھاری بات نے مجھے حیران نہیں، زمین بوس کر دیا ہے۔ اوہ! اتنے سال جسے میں بیٹا سمجھ کر پرورش کرتا رہا، وہ بیٹی نکلا؟'' دروپد ایک جگہ ٹھہر نہیں پا رہے تھے، وہ ٹہل رہے تھے، بار بار اُٹھ اور بیٹھ رہے تھے۔''کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی تو اب تک اس کا سر اس کے دھڑ پر نہ ٹکا رہتا لیکن یہ خبر میری اپنی بہو نے دی ہے۔ وہ اس پر نامردی کا الزام لگاتی، اسے عورت بیزار تک بتاتی تو بھی ٹھیک تھا لیکن عورت... شکھنڈی عورت ہے؟ میں نے اس کی پرورش راج کماروں کی طرح کی ہے، وہ درون کا طالب علم رہا ہے اور وہ عورت ہے؟''

دروپد اچانک ایک جگہ ٹھہر گئے، انھوں نے سر اٹھا کر راج پروہت کی طرف دیکھا، ''آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟''

''مہاراج، ہمارے مہاراج ہرنے ورما نے کہا ہے کہ اگر شکھنڈی کا مرد ہونا ثابت نہ ہو پایا تو وہ اپنے اپمان کا بدلہ لینے کے لیے پانچالوں پر لشکر کشی کریں گے۔ آپ کو، آپ کے پریوار اور منتریوں کو ختم کر دیں گے۔''

دروپد کی آنکھوں میں غصے کی ایک تیز لہر اٹھی۔ درون نے انھیں شکست کیا دے دی، جسے دیکھو وہی آنکھیں دکھا رہا ہے۔ انھوں نے اپنے غصے کو قابو میں کیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہ ہرنے ورما کا نہ تو غرور بول رہا تھا اور نہ یہ بلا وجہ کا شکتی پردرشن تھا۔ اگر ان کا یہ الزام سچ تھا تو پھر

انھیں اپنے ایمان کا بدلہ لینے کا حق حاصل تھا۔ اگر شکھنڈی کے بارے میں یہ خبر درست ہے تو بے شک انھیں اس کی سزا ملنی ہی چاہیے۔

''میں آپ کے مہاراج کی ذہنی اذیت اور غصے کو سمجھتا ہوں۔'' بہت دیر بعد دُروپد نے اپنی زبان کھولی، ان کا لہجہ مدافعانہ تھا۔ ''مگر مجھے اتنا وقت اور موقع تو ملنا ہی چاہیے کہ میں خود اس خبر کے سچ ہونے کی تصدیق کر سکوں۔''

''اس کا کون وشواس کرے گا مہاراج کہ آپ کو پتہ نہیں کہ شکھنڈی عورت ہے جب کہ آپ اس کے باپ ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں راج پروہت کہ ہم پر دھوکے باز اور پاکھنڈی ہونے کا الزام ہے اور شاید مہا مورکھ ہونے کا بھی۔'' دُروپد نے بے بسی سے کہا۔

''شیو... شیو...'' راج پروہت نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا، ''یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پنچال راج کو بڑا سے بڑا دشمن بھی مورکھ نہیں کہہ سکتا۔''

''تو راج پروہت،'' دروپد بولے ''اگر میں نے اپنی بیٹی کو بیٹا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کا دھوکہ اور پاکھنڈ کیا ہے تو میں اس کی شادی کرنے کی مورکھتا کیوں کرتا؟ کوئی بھی شخص سمجھ سکتا ہے کہ شادی کے بعد یہ دھوکہ اور پاکھنڈ نہیں چل سکتا۔ تو میں خود ہی اپنے دھوکے کا راز کھولنے کی کوشش کیوں کروں گا؟ کیا میں اس درجے کا مہا مورکھ ہوں؟''

راج پروہت خاموش کھڑا رہا، اسے دروپد کی منطق سمجھ میں آ رہی تھی، مگر پھر بھی یہ کتنی حیرت انگیز بات تھی کہ ایک باپ اپنی اولاد کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ عورت ہے یا مرد؟

''اس لیے کہتا ہوں راج پروہت، مجھے یہ موقع ملنا ہی چاہیے کہ میں سچ جان سکوں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں راج پروہت۔ یہ حق تو کسی کو بھی ملنا چاہیے۔'' راج پروہت نے دھیرے سے کہا۔

''تو پھر آپ مہمان خانہ میں آرام کریں۔'' دُروپد نے ایک گہری سانس چھوڑی۔ ''مجھے موقع دیں کہ میں سچ کا پتہ لگاؤں اور آپ کے مہاراج کو مناسب جواب دے سکوں۔''

''جیسی مہاراج کی مرضی۔'' راج پروہت شانت ہو چکا تھا۔

کیا راجپوت ہونا گناہ ہے؟ اگر راجپوت ہو تو کیا آپ کو 'مرد' ہونا ہی ہوگا؟ اس سے کم کچھ منظور نہیں؟ کچھ بھی نہیں۔ دنیا کے لیے وہی سچ ہے جو ان کی آنکھ دیکھتی ہے اور ان کی آنکھوں کو دکھانے کے لیے میرا 'مرد' ہونا بہت ضروری تھا ورنہ انگلی نہ صرف میرے راجپوت ہونے پر اٹھتی، بلکہ پوری برادری میں میرے گھر کا کوئی مرد اپنی مونچھوں کو تاؤ نہ دے پاتا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ کیسے بھی اُدے پور چھوڑ دوں، ورنہ کسی نہ کسی دن گھر والے میری حقیقت جان جائیں گے اور میں ان کے لیے ایک بدنما 'داغ' بن کر رہ جاؤں گا۔

کہاں سے شروع کروں، سمجھ میں نہیں آ رہا۔ جب پہلی بار پتہ چلا تھا کہ میں 'الگ' ہوں وہاں سے، یا پھر وہاں سے جب اسکول میں ایک دوست سے پہلے پیار کا احساس ملا تھا وہاں سے، جب پہلی بار ایک کزن نے میرا ریپ کیا یا پھر وہاں سے جب میرا بھائی بول پڑا تھا ''اب تو مرد بن جا، کب تک ماں کے دودھ کو شرماتا رہے گا۔'' دنیا کے لیے چاہے دروازے کھلے رہے ہوں گے مگر میرے لیے جب ایک ایک کر کے سارے دروازے بند ہو رہے تھے تو ان اندھیری تنگ راہوں گلیاروں میں اپنے وجود کو تلاش کرتا میں... کہاں سے شروع کروں، سمجھ نہیں پا رہا۔

میں نہیں جانتا، کیا غلط ہے اور کیا صحیح؟ پیار کرنا کبھی غلط ہو سکتا ہے؟ یہ تو ایشور کی دین ہے اور ایشور کی بنائی ہوئی کوئی چیز کبھی غلط نہیں ہو سکتی، دادی بچپن سے مجھے کہتی آئی تھی۔ کب کس کا، کس سے، کہاں پیار کا رشتہ جڑ جائے، کچھ پتہ نہیں۔ سب دل کے رشتے ہیں، لیکن انھیں کون سمجھے گا؟ میں کہنے کو لڑکا ضرور پیدا ہوا تھا، مگر مجھے اپنے من پسند لڑکے سے پیار کرنا منع تھا۔ وہ گناہ تھا اور گناہ کی راجپوتوں میں دو ہی سزائیں ہوتی ہیں؛ یا تو مار ڈالے جاؤ گے یا ہمیشہ کے لیے گھر میں نظر بند کر دیے جاؤ گے۔

وہ اسکول کے دن تھے۔ ایک دوست سے ملاقات... پیار کیا ہوا، پورے اسکول میں میرے وجود پر کالک پوت دی گئی۔ اس وقت میں نویں کلاس میں تھا۔ اسکول کے باتھ روم میں ایک لڑکے کے ساتھ پکڑے جانے کی سزا تھی کہ مجھے فٹ بال ٹیم سے نکال دیا گیا۔ وجہ جاننے کے لیے جب کوچ کے پاس گیا تو وہ جس طرح کی ہنسی ہنسے، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ گھر پر کیا بولوں؟ کیسے بولوں کہ مجھے اب یہ اسکول بدلنا ہے؟ تو مطلب یہ ہوا کہ اب بارہویں تک مجھے اس ذلالت کو برداشت کرنا پڑے گا۔ میں بہت روتا تھا، مگر کسی کو اس کا پتہ چلنے نہیں دیتا تھا۔ میرا کوئی دوست نہیں تھا، کوئی میرے پاس نہیں آنا چاہتا تھا، نہ لڑکے اور نہ لڑکیاں۔ کلینڈر اور سال یوں ہی بدل

رہے تھے مگر اسکول کا باتھ روم والا قصہ جیسے میری پیشانی پر لکھ دیا گیا ہو۔

وہ بارہویں کا سال تھا۔ میری خالہ کا لڑکا مجھ سے ملنے آیا۔ وہ دوسرے اسکول میں پڑھتا تھا مگر ہم دونوں سائنس کے ہی طالب علم تھے۔ بولا، ساتھ رہ کر پڑھیں گے تو دونوں ایک دوسرے کی مدد کر پائیں گے اور اس سے شاید بورڈ کے ریزلٹ اچھے آئیں۔ میں تیار ہو گیا۔ بھائی جیسا تھا تو کوئی خوف نہیں تھا۔ پہلی ہی رات اس نے مجھ سے زبردستی کرنی چاہی۔ میں نے منع کیا تو بولا، اپنے اسکول کے لڑکوں کے ساتھ سو سکتا ہے تو میرے ساتھ سونے میں کیا دقت ہے۔ میں بھونچکا تھا۔ میں نے دور ہٹنا چاہا تو اس نے میرے منھ کو بند کر دیا۔ اس رات صرف میرے جسم کو ہی نہیں نوچا گیا بلکہ روح بھی لہولہان ہو گئی تھی۔ 'گے' (gay) ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی بھی کبھی بھی میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کیا میری پسند یا میری رضامندی کی کوئی اہمیت نہیں؟ اس بلاتکار کے بعد ہمت نہیں تھی کہ کوئی شکایت بھی کر سکوں بلکہ اس کے برعکس مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر زبان کھولی تو سارے پرانے قصے گھر والوں تک پہنچ جائیں گے۔ پھر وہ کزن ہر رات میری روح کو نوچتا رہا، ہر بار اور زیادہ سفاک طریقے سے۔ اسے اپنی مردانگی دکھانے کے لیے میرا ہی جسم ملا تھا۔

امتحانات کے بعد گھر پر درخواست کی کہ انجینئرنگ کے لیے کسی 'بہتر' کالج میں داخلہ کروا دیا جائے۔ میں صرف اُدے پور سے بھاگنا چاہتا تھا۔ میرا داخلہ ممبئی کے ایک معروف کالج میں کرا دیا گیا۔ دل ہی دل میں خود کو قسم دی کہ اب واپس کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ وہ اسکول کے دن، وہ گھر پر امتحانات کی راتیں؛ میں انھیں کبھی یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ممبئی کا لاکھ لاکھ شکریہ، جس نے مجھے ٹھیک ویسے ہی قبول کیا جیسا میں تھا۔ دوسرے ہی سال میری سیکشوئیلیٹی کو لوگ جان چکے تھے۔ میں اکثر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا لیکن لوگ اسے معمول کے طور پر ہی لیتے تھے۔ کالج کی تعلیم کے دوران میری میگھالیہ کے رنگزو سے ملاقات ہوئی جو کب پیار میں بدل گئی، پتہ ہی نہیں چلا۔ پیار کا مطلب اب سمجھ پا رہا تھا۔ اس کا لمس بہت اچھا لگتا تھا۔ رنگزو کی سانسیں بھی میرے اندرون کو چھوتی تھیں اور ان زخموں کو بھرنے کا کام کرتی تھیں جو ماضی نے دیے تھے۔

رنگزو کی کہانی مجھ سے تھوڑی الگ تھی۔ اسے اس کی بہن کا بہت اچھا ساتھ ملا تھا۔ وہ اکثر بتایا کرتا تھا کہ اس کے قبیلے میں پدری نظام نہیں تھا بلکہ وہاں وہی ہوتا جو عورتیں چاہتی ہیں۔

اس نے کہا تھا

اس صورت میں بہن کا اسے سمجھنا ایک بڑی بات تھی۔ ہاں، اس کے ساتھ بھی بچپن میں ٹیوشن ٹیچر نے زیادتی کی تھی مگر تب اس نے گھبرانے کی بجائے اپنی بہن کو بتا دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ٹیوشن ٹیچر کو اس کا گاؤں چھوڑنا پڑا تھا۔ شروعاتی اختلافات کے بعد رنگزو کو اس کے خاندان نے قبول کر لیا تھا۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ عام ہندوستانی جس نارتھ ایسٹ کے سبھی آٹھ (بشمول سکم) صوبوں کے نام تک نہیں جانتے، وہاں کی روایتیں شمالی ہند کے مقابلے میں کتنی زرخیز ہیں۔ جنھیں ہم 'آدیباسی' کہتے ہیں، وہ ہم مہذب لوگوں سے کتنے بہتر ہیں۔ وہاں پدری نظام ہی نہیں مطلب 'مردازم' ہی نہیں، مطلب مونچھ کا تاؤ ختم۔ واہ۔

رنگزو کے ساتھ خوب صورت ترین دن گزر رہے تھے۔ ایک دن اچانک میرا بھائی ممبئی آ گیا۔ وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن اس بیچارے کو کیا پتہ تھا کہ اصل سرپرائز اسے ملنے والا ہے۔ صبح صبح اچانک وہ میرے کمرے میں پہنچا اور اس میں تالا لٹکتا دیکھ کر مجھے فون کرنے لگا۔ نیند میں ہونے کے سبب جب میں نے فون نہیں اٹھایا تو ہاسٹل کے دوسرے لڑکوں سے میرے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ پڑوس میں رہنے والے ایک لڑکے نے یوں ہی مذاق میں بول دیا کہ وہ اور کہاں ہوگا، وہیں ہوگا اس 'چنکی' کے کمرے میں۔ بھائی خوش ہو گیا کہ 'چنکی' نام کی میری کوئی گرل فرینڈ بھی ہے لیکن جب اسے پتہ چلا کہ اس چنکی کا کمرہ بھی اسی بوائز ہاسٹل میں ہے تو تھوڑا بے چین ہوتے ہوئے اس نے رنگزو کے کمرے پر دستک دے ہی دی۔

اس صبح بھائی کو پتہ چل گیا کہ میری دلچسپی لڑکوں میں ہے۔ وہ جتنی گالیاں ایک سانس میں مجھے دے سکتا تھا، دے ڈالا۔ ہاسٹل میں اچھا خاصہ تماشہ کرنے کے بعد وہ اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔ میرا دل کسی انجانے خوف سے کانپ رہا تھا۔ کیا اس نے گھر جا کر سب کو بتا دیا ہوگا؟ کیا مجھے اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملے گی؟ کیا میں اب رنگزو کے ساتھ مزید نہ رہ پاؤں گا؟ کہیں وہ رنگزو کے ساتھ کچھ غلط تو نہیں کریں گے؟ تمام اندیشوں میں گھرا میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔ رنگزو مجھے تسلی دے رہا تھا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا اور ہر حالت میں وہ میرے ساتھ ہوگا۔

ڈیڑھ دو ہفتے بعد پاپا کا فون آیا کہ انھوں نے میرے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ پاپا کے سامنے ہاں یا نہ کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بچپن سے ہی ہمیں اس طرح بڑا کیا گیا تھا کہ پاپا یا بڑے بھائی کے سامنے نظریں نیچی کر کے کھڑے رہو اور ان کے ہر لفظ کو حکم مان کر قبول کرو۔

ہمت کر کے میں نے کہا کہ ابھی تو میرا گریجویشن ہی نہیں مکمل ہوا ہے۔ وہ کچھ نہیں بولے اور فون کاٹ دیا۔ مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی اور رنگز وبھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر کوئی سپورٹ سسٹم بھی تو تھا نہیں جس سے بات کی جا سکے۔ بھاگنے کا سوال نہیں تھا کیوں کہ ابھی تعلیم کا پورا ایک سال باقی تھا۔ ایک طرف کنواں اور دوسری طرف کھائی والی بات تھی۔ آخر کار طے کیا کہ مجھے گھر پر کسی ایک کو میری سیکشویلیٹی کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔ لیکن کس کو؟ میں صرف ماں کے قریب تھا لیکن گھر پر ماں کا درجہ گھونگھٹ میں چپ چاپ گھر کے کام کرنے کا ہی تھا۔ پاپا کے سامنے میں نے کبھی ان کو سر اونچا کر کے بولتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا ان کو بتانا ٹھیک ہوگا؟ نہیں۔

میری ایک دور کی بہن سائیکاٹرسٹ ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا وہ مجھے 'اسٹریٹ' (straight) ہونے میں مدد کرے گی جو کہ میں ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھے ایک سینئر اور معروف سائیکاٹرسٹ کے پاس لے گئی۔ آئندہ تین مہینے میرے لیے برے خواب کی طرح تھے۔ سائیکاٹرسٹ مجھے اپنی سوچ بدلنے کے لیے مجھ سے 'ہیٹروسیکشوئل' (Hetrosexual) سیکس کی بارے میں بات کرتا۔ جب میں نے کہا کہ مجھے لڑکیوں میں دلچسپی نہیں ہے تو اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور میری انگلیوں میں 'الیکٹروڈز' (Electrodes) لگا دیے۔ اس وقت اس نے مجھے ہلکے الیکٹرک کے جھٹکے دیے، ہر جھٹکے کے بعد وہ مجھے ننگے مردوں کی تصویر دکھاتا اور پھر شاک دیتا۔

جب اس کا بھی اثر نہیں ہوا تو اس نے مجھے بستر پر لیٹنے کے لیے کہا اور میری کھوپڑی پر 'الیکٹروڈز' چپکا دیے۔ اس دوران میرے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے گئے تھے اور میرا منہ بند تھا تا کہ میں اپنی زبان نہ چبا جاؤں۔ یہ سب تقریباً پندرہ بیس منٹ تک چلتا رہا۔ تین مہینے میں، میں نے ۲۱ شاک ٹریٹمنٹ برداشت کیے۔ یہ بہت خوف ناک تھا۔ میں ساکت ہو گیا تھا اور ہمیشہ متلی محسوس کرتا۔ میں صحیح طریقے سے بات نہیں کر پاتا، جب بولنے کی کوشش کرتا تو زبان لڑکھڑانے لگتی۔ ان سب کی وجہ سے میں اپنا 'وایوا' (viva) نہ کر سکا۔ تین مہینے تک میں اپنے گھر میں قید تھا۔ میری پڑھائی کا جو نقصان ہوا، سو الگ، ڈگری ایک سال کے لیے آگے کھسک گئی۔ آپ کو یہ سب بتاتے وقت بہت کچھ چھوٹ گیا۔

اس نام نہاد علاج کے بعد لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں اب 'مرد' بن چکا ہوں، پتا جی نے ایک بار پھر اپنی مونچھوں پر تاؤ دینا شروع کر دیا تھا۔ حالاں کہ میں اب بھی 'گے' تھا، میری پسند و

ناپسند میں قطعی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن بہرحال، میری شادی کردی گئی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں تو بہت بزدل نکلا۔ رنگزو کو دھوکہ دے دیا۔ اپنے آپ کو دھوکہ دے دیا۔ شاید اس لڑکی کے ساتھ بھی غلط کیا جسے شاید میں اپنا صد فیصد کبھی نہیں دے پاؤں گا۔ تو میرا جواب ہے، ہاں میں حالات کا مقابلہ نہ کر سکا، میں ڈرپوک نکلا، بہت ہی ڈرپوک مگر شاید ڈرپوک ہونے سے زیادہ میں خودغرض تھا۔

شادی کے بعد میں واپس ممبئی لوٹ آیا۔ 'گونا' ہونے میں بھی ابھی وقت تھا۔ وہ بھی کچھ دن اُدے پور میں گزار کر اپنے میکے لوٹ گئی۔ اس کی تعلیم بھی جاری تھی۔ رنگزو اب بھی میرے ساتھ تھا مگر رشتوں میں گرمی ختم ہو چکی تھی۔ اسی نے مجھے شادی کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے مطابق فی الحال اس سے بہتر راستہ کوئی دوسرا نہ تھا۔

انجینئرنگ مکمل ہوئی اور میں نے ماسٹرز کے لیے بیرون ملک درخواست دینا شروع کردیا۔ گھر والے، یہاں تک کہ بیوی کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا۔ قسمت اچھی رہی کہ اسکالرشپ بھی مل گئی اور فن لینڈ کی راجدھانی ہیلسنکی کے ایک کالج میں داخلہ بھی مل گیا۔ گھر والوں کو پتہ چلا تو انھوں نے منع کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر باہر جانا ہی ہے تو بیوی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ اب انھیں میں کیسے سمجھاتا کہ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے اُدے پورے سے بھاگ کر ممبئی آیا تھا؛ خود سے، ہر ایک رشتے سے، صرف بھاگ جانا چاہتا تھا۔ سبھی پیچھے چھوٹتے جارہے تھے؛ رنگزو بھی، بیوی بھی، ممی پاپا بھی، ممبئی ایئرپورٹ پر کھڑے کھڑے میں خود کو قسم دے رہا تھا کہ اب کبھی لوٹ کر انڈیا نہیں آؤں گا۔

''اگر کوئی اپنی خوشی کو زیادہ پسند کرتا ہے تو اس میں اسے شرم نہیں محسوس کرنی چاہیے۔''
البیئر کامیو کے ناول 'پلیگ' کا یہ جملہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

آج یورپ کے مختلف ممالک میں رہتے ہوئے مجھے ۱۲ سال ہو گئے ہیں۔ مجھے انڈیا گئے ہوئے بھی اتنے ہی سال گزر چکے ہیں۔ گزشتہ دنوں انڈیا میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو لے کر میں کافی جوش میں بھر گیا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ راجپوت یا کسی اور سماج میں اس فیصلے سے بہت کچھ نہیں بدلنے والا، مگر ہاں، ہمارے وجود کو ملک کی سب سے بڑی انتظامیہ نے قبول کیا، یہ ایک بڑی جیت تھی۔ سفر بہت لمبا ہے اور ایک میل کا پتھر انڈیا پار کر چکا ہے۔ خوشی اس بات کی بھی ہے کہ اب اگر کوئی انسان کسی اور ہم جنس کے ساتھ کچھ غلط کرتا ہے تو کم از کم قانون اس کا ساتھ ضرور

دے گا۔ اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ اسکولی امتحانات کے ساتھ زندگی کے تلخ امتحانات نہیں دے گا۔ اسے بجلی کے جھٹکے برداشت نہیں کرنے ہوں گے۔

میری شادی ختم ہوچکی۔ وہ لوگ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے تھے، اپنی لڑکی کی شادی کسی اور کے ساتھ کرنے کو مجبور ہو گئے تھے۔ پاپا نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں واپس اُدے پور آیا تو وہ مجھے تلوار سے چیر دیں گے۔ حالاں کہ انھیں میری سیکشویلیٹی کے بارے میں پتہ تھا۔ بھائی ضرور ایک بار فون پر بول چکا تھا کہ ''اب تو مرد بن جا، کب تک ماں کے دودھ کو شرماتا رہے گا۔'' ماں کبھی کبھی حال چال پوچھ لیتی تھی۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ مجھے اچھی نوکری مل گئی ہے اور میں اب 'بڑا' ہو گیا ہوں۔ وہ اکثر فون پر روتی رہتی تھی۔ میں انھیں کبھی خاموش نہیں کر پایا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے ماں کے دودھ کو نہیں شرمایا۔ میں اب بھی ان کا لاڈلا بیٹا ہوں، سب سے چھوٹا، سب سے پیارا۔

ابھی ہیتھرو ایئرپورٹ پر ہوں اور کچھ دیر میں میری دہلی کی فلائٹ ہے۔ ۱۲ سال بعد اپنے ملک جا رہا ہوں، وہ ملک جہاں کبھی بھی لوٹ کر نہ جانے کی میں نے قسم کھائی تھی۔ آخری اعلان ہو چکا ہے۔ میرے قدم فلائٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں جوش میں بھرا ہوا ہوں۔ رنگزو نے بلایا ہے۔ وہ کسی لڑکے کے ساتھ طویل مدت سے ریلیشن شپ میں ہے اور اپنی اس ریلیشن شپ کی سالگرہ دوستوں کے ساتھ منانا چاہتا ہے۔ اس کی دعوت کو ٹال نہیں پایا، اس دعوت نے مجھے اپنی قسم توڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں انڈیا جا رہا ہوں۔ عشق کی وہ کون سی ادا ہے جو بار بار آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں جس سے آپ کبھی پیار کرتے تھے یا شاید اب بھی کرتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ میری قسمت میں کیا لکھا ہے مگر رنگزو کے بارے میں جب سے علم ہوا، بہت خوش ہوں۔ دل کے ایک گوشے میں رنگزو کی یادیں سمیٹے ہوئے ہوں۔ ہر بار، ہر جگہ شکست کھائی، صرف ایک بار اگر مجھے کہیں اپنائیت کا احساس ہوا تو وہ رنگزو کے ساتھ ہی ہوا۔ جب رنگزو بچھڑ رہا تھا تو اس نے کہا تھا، ''تم ہی کہا کرتے ہو نا کہ سب کچھ اس اوپر والے کی رضا سے ہوتا ہے، اسی نے ہمیں ملایا، جتنے دن ساتھ رہے، اچھا تھا۔ اب اس کی مرضی سے ہی شاید ہم الگ ہو رہے ہیں۔ اب کی بار تم خود کو اکیلے ہی سنبھال لینا۔''

میں سیٹ بیلٹ باندھ چکا ہوں۔ جہاز رَن وے پر ہے۔ امیدیں سرپٹ بھاگ رہی ہیں۔ برے خواب پیچھے چھوٹتے جا رہے ہیں۔ امیدوں کو آسمان ملنے والا ہے۔ میرے ارمانوں

کے پر پھیلتے جا رہے ہیں۔ میں دل ہی دل میں مسکراتا ہوا اچانک سے ہنس پڑتا ہوں، یوں ہی، بے سبب۔ میرے بغل والی سیٹ پر بیٹھی ایک ننھی سی بچی بھی میرے ساتھ کھلکھلا اٹھتی ہے۔

- 27 -

''اب تو آپ خوش ہوں گے ڈاکٹر بنرجی کہ آپ کے پیشنٹ نے آتم ہتیا نہیں کی تھی بلکہ اس کا قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟''

''کسی کے قتل سے کوئی کیسے خوش ہوسکتا ہے انسپکٹر! ایک ڈاکٹر تو بالکل نہیں ہوسکتا۔''

''نہیں میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی تھیوری صحیح ثابت ہوئی چونکہ آپ بار بار اس کی آتم ہتیا کی possibilities سے انکار کررہے تھے۔ قاتل نے خود ٹوئٹر پر اعتراف کرلیا اور اسے اس پر کوئی شرم نہیں ہے کیوں کہ اس نے ہندو سبھیتا کی سرکشا کی ہے۔''

''ہندو سبھیتا... اسلامی سبھیتا... عیسائی سبھیتا... سبھیتاؤں کی اس منڈی میں کیا انسانی سبھیتا بھی موجود ہے؟ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ہر دھرم اپنے آپ کو انسان کا سچا ہمدرد اور فطرت کا اکلوتا نمائندہ سمجھتا ہے لیکن ہر دھرم کے ماننے والے اپنے ہی دھرم کے دعوؤں کو بار بار جھوٹا ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس لیے جو بھی دھرم اور سبھیتا کے رکھشک ہونے کا دعویٰ کرے، اسے شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیجیے، بالکل اسی پولسیانہ نظر سے جس کا آپ کسی قتل کی تفتیش کے وقت استعمال کرتے ہیں، آپ کو دھرم اور سبھیتا کے ہتیارے سامنے کھڑے ملیں گے، میرا یقین کیجیے۔

''میں آپ کو ایک شخص کی کہانی سناتا ہوں جس سے میری بچپن میں بھینٹ ہوئی تھی۔ وہ میرے دور کے رشتے میں تھے۔ میری عمر اس وقت یہی کچھ سات برس کی رہی ہوگی، جب میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تھا۔ شاید میں بھی کسی دوسرے مرد/عورت کی طرح اس ملاقات کو اپنے لاشعور کی کھائی میں دھکیل سکتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں میرے ضمیر نے وہ منظر ہمیشہ اسی طرح تر و تازہ سنبھالے رکھا۔ شاید اس لیے کیوں کہ اس کا اختتام میرے لیے کچھ اور تھا، جو اس وقت میری

نظروں کے سامنے تو تھا مگر شعور کی کمی کے سبب ذہن کے نہاں خانے میں ادھورا پڑا تھا۔ حالاں کہ پہاڑی علاقوں میں پدری سماج کا ماحول تھوڑا سا لبرل ہوتا ہے لیکن بہر حال پدری سماج ہی ہوتا ہے۔ سات برس کی عمر میں مجھے بچوں کی ٹولی میں بٹھایا گیا۔ مردوں کے گروہ کا علیحدہ ٹھکانہ ہوتا ہے۔ بچے ہمیشہ عورتوں کی صحبت میں تھوپ دیے جاتے ہیں۔ نانی، خالہ، بہن، ماں، تائی، موسی اور ان کی بقیہ عورتوں کی منڈلی میں شامل میری دور دور کی رشتہ دار عورتوں کا ایک جمگھٹا۔ انھیں کے درمیان وہ بیٹھی تھی/ بیٹھا تھا (مذکر و مونث کی یہ کشمکش برسوں تک جاری رہی) یا پھر بیٹھے تھے۔ وہ جو بھلائے نہیں بھولتے، منڈی ہوئی مونچھیں، داڑھی کو صفائی کے ساتھ ہٹایا گیا تھا۔ گھٹنوں تک لمبے بال، ناک پر لونگ، کانوں میں بالیاں، سر پر ڈھاٹہ، ایک زنانہ ڈھیلی قمیص اور اتنی ہی ڈھیلی سلوائی گئی شلوار؛ لباس جتنے زنانہ تھے، چہرے کے نین نقش اتنے ہی مردانہ۔

''اب سوچتا ہوں کہ اچھا کیا جو اس وقت اپنی اس جستجو کو ظاہر کرنے کی بجائے اسے اپنے دل ہی میں سموئے رکھا۔ اگر اس وقت ظاہر کیا ہوتا تو وہیں میری سوچ کا استحصال ہو جاتا اور میں اپنے والد، داد، نانا اور باقی تمام لوگوں کی طرح اس پدری سماج ضابطے کا شکار ہو جاتا۔ شاید میں بھی تسلیم کر لیتا کہ ہوگا کوئی جو مجھ سے وابستہ تو ہے مگر وہ سماجی اعتبار سے اہم نہیں ہے۔ کچھ ایسے ہی Repressive Hyopothesis (استحصالی تصورات) کی بات میشل فوکو بھی تو کرتے ہیں (Hystory of Sexuality; 1978)، جب اقتدار اور سیکشوئلٹی روبرو ہوتے ہیں؛ ایک پدری سماج کے اوتار میں۔ فوکو کا یہ کہنا ہے کہ کس طرح اقتدار نہ صرف استحصال کا ایک ذریعہ ہے بلکہ قانوناً کنٹرول کرنے اور پابندی لگانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اقتدار میں اعلیٰ مقام بنائے رکھنے کی جدوجہد میں جس طرح سیکشوئلٹی اور دیگر جنسی تعلقات سے متعلق سماجی سرگرمیوں پر کنٹرول اور پابندی کا استعمال ہوتا ہے، وہ Repressive Hyopothesis کا ہی ایک حصہ ہے۔ بالفاظ دیگر کہا جائے تو تھامس کہن (Thomas Kuhn) کا تصور (The Structure of Scientific Revolution; 1962) اس عمل کو آسان لفظوں میں ظاہر کرتا ہے، یعنی اقتدار کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں بنیادی جدت کا استحصال (Suppression of Fundamental Novelties)۔ تھامس کہتے ہیں کہ سماج اور سماج کے اصول وضوابط کے محافظ، سماجی روایتوں کو جدت سے دور رکھتے ہیں اور اگر ضروری ہو تو کسی بھی قیمت پر نئے تصورات پر جبر کرنے سے بھی نہیں چوکتے، خواہ وہ کتنا ہی ظالمانہ یا وحشیانہ

کیوں نہ ہو۔

اس واقعے کے گزرے برسوں ہو گئے، میں بچپن کے گلیارے پار کر کے جوانی کی دہلیز پر قدم جما چکا تھا۔ ایک بار میں اور ماں ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھا، ''ماں، تمھیں یاد ہے، بچپن میں نانا کے گھر ایک بزرگ آیا کرتے تھے جو شکل سے تو مرد لیکن اپنے لباس سے عورت لگتے تھے؟'' ماں نے کھڑکی سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ پیشانی پر ہلکی سی شکن، آنکھوں میں تجسس اور زبان پر جواب دینے لائق ایک لفظ بھی نہیں۔ میں نے تھوڑا اور اشارہ دینے کی کوشش کی۔ میں نے کہا کہ وہ اکثر عورتوں کے ساتھ ہی بیٹھتے تھے اور انھیں کے جیسا برتاؤ بھی کرتے تھے۔ ماں نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ ان کے سوتیلے چچا تھے۔ میں نے ان سے بات کرنے کی دلچسپی ظاہر کی تو ٹکا سا جواب ملا کہ ان کا پچھلے سال انتقال ہو چکا ہے۔ میرے چہرے کا تجسس اچانک گھبراہٹ مایوسی میں بدل گیا لیکن شبہات کی گھنٹیاں اسی طرح بجتی رہیں جو گزشتہ اٹھارہ سال سے مسلسل میرے سر میں بجتی رہی تھیں۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اب میری سوچ کا استحصال کرنا پہلے جیسا آسان نہ تھا اور نہ اب پدری سماج کی حاکمیت کا خوف رہا اور نہ ہی سماجی روایتوں کا۔

''بچپن میں نانا کے گھر ایک بزرگ آیا کرتے تھے جو شکل سے تو مرد لیکن اپنے لباس سے عورت لگتے تھے؟'' میں نے جب اپنے اجداد کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو معلوم ہوا کہ ان کا جنم ۱۹۴۰ء میں ہماچل کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک دلت خاندان میں ہوا اور اتفاق سے وہ میرے دادی کے ہم عمر ہوئے۔ بچپن ابھی آیا ہی تھا کہ والدین چل بسے، گھر کی ساری ذمہ داری دو بھائیوں کے کندھوں پر آن ٹکیں۔ ۱۳ سال کی عمر میں انھوں نے پہلی بار سماجی روایتوں کے خلاف مورچہ سنبھالا اور جنسی بنیاد پر نجی کرداروں کی تردید کی اور Cross-dresser کو قبول کیا۔ وہ اکثر اپنے لیے ایک ڈھیلی قمیص اور شلوار سلوایا کرتے تھے۔ ان کے لیے راحت کی ایک بات یہ تھی کہ ان کا پدری سماج اتنا دقیانوسی نہیں تھا کہ انھیں (Buggery Act 1953) جیسے قانون کی گرفت میں لیا جا سکتا۔ ان کی اکلوتی پریشانی کا سبب تھا خود ان کا بھائی۔ وہی اکلوتے انسان رہے جو تا عمر ان کی اس ندرت سے محروم رہے۔ وہ ان کے عجیب لباس اور سوچ کی مخالفت کرتے رہے۔ اکثر پریوار کی تقریبات میں شامل ہونے پر بھی ان پر پابندی عائد کی گئی۔ شروع میں تو انھیں جبراً اس لباس کو پہننے سے روکا بھی کیا گیا لیکن وہ اب سمجھ گئے تھے جو ۷۰ سال بعد

نصف سے زیادہ سماج اب تک نہ سمجھ پایا۔

''ساٹھ یا ستر کی دہائی تھی۔ اب یوں تو کہنے کو آزادی مل گئی تھی مگر کسے اور کن پہلوؤں سے، طے ہونے کی کاروائی جاری تھی اور شاید اب بھی ہے۔ ذات پات، مذہبی روایتوں وغیرہ کا وہی حال تھا جو آج ہوموسیکشوئلیٹی کا ہے، یعنی دستور میں موجود تو ہے مگر سماجی طور پر عمل سے برسوں دور۔ پچیس تیس کی عمر میں انھوں نے جب دائی کا پیشہ اختیار کیا تو ان کی cross-dressing مستقل ہوگئی تھی۔ دائی کے کام سے آمدنی بھی ہوجاتی تھی۔ لوگ معاوضے کے طور پر کچھ پیسے اور ایک جوڑا کپڑے عطیہ کردیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ عطیات میں زنانہ کپڑے ہی مانگا کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ لوگوں سے اصرار کیا کرتے تھے کہ انھیں ان کے مردانہ نام کی بجائے زنانہ متبادل سے ہی مخاطب ہوا کریں۔ تمام عمر کنوارے رہے لیکن کہنے کو 'کثیر ازواجی' (Polyandry) رواج کے تحت شادی شدہ ہوئے۔ یعنی ان کے بڑے بھائی کی بیوی ہی ان کی بیوی ہوئی۔ یوں کہا جائے تو بڑے بھائی کی ضد پر انھوں نے یہ رشتہ اپنایا۔ دائی کے پیشے میں، ڈلیوری کے دوران انھیں جو زنانہ کپڑے ملتے، وہ اکثر اپنی بیوی کو دے جاتے اور کبھی کبھار اپنے لیے وہی ڈھیلی قمیص اور شلوار سلوالیا کرتے۔

''پہاڑی علاقوں میں ذات پات، اونچ نیچ جیسی سماجی برائیاں شاذ و نادر ہی سننے کو ملتی ہیں یا پھر یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھیں غیر مرئی طور پر اتنا مشق کرایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ لاوجود کی سطح پر سرگرم عمل رہیں۔ یہ حیرت انگیز بھی ہے اور المناک بھی۔ ایک پدری سماج، جہاں ذات پات، اونچ نیچ کا بسیرا ہو، کون سی حالت نسبتاً زیادہ قابل رحم ہوگی؛ ایک دلت ہونا یا ایک دلت مرد کا cross-dresser ہونا؟ یا پھر ایک دلت cross-dresser مرد کا دائی ہونا؟ ایسے ہی معاشرتی عمل کو Kimberle Williams Crenshaw (1989) نے 'انٹر سیکشوئلٹی' کہا ہے۔ جب کوئی شخص مختلف بنیادوں (مثلاً جنس، مذہب، برادری، رنگ، زبان یا پھر کوئی اور ثقافتی شناخت) پر امتیازی سلوک کا شکار ہوتا ہے۔ حالاں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی سنگین صورت حال پیش آتی ہے تو سبھی امتیازات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ معلومات کے مطابق ایسا کوئی واقعہ سامنے تو نہیں آیا جہاں انھیں ان کی سماجی شناخت کے سبب کوئی تکلیف اٹھانی پڑی ہو مگر اتنا ضرور ہوا ہے کہ عام طور پر جو رسم و رواج ہیں، انھیں لازماً نبھانا ہی پڑتا ہے؛ مثلاً اپنے برتن کو خود دھونا، کھانا پروسنے کے لیے ایک الگ جگہ کا تعین وغیرہ۔ ایک

دلت دائی سے ڈلیوری کرانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے کیوں کہ ڈلیوری کے وقت پورے خاندان اور خاندان کے ہر رُکن کو ناپاک تسلیم کیا جاتا ہے جو ایک اور معاشرتی تصور Concept of Purity and Pollution پر مبنی ہے۔

''تیس پینتیس سال کے اس پیشے میں انھوں نے سینکڑوں ڈلیوری کامیابی سے کرائی اور اپنے کام میں مشاق ایسی کہ سرکاری اسپتالوں سے نوکری کے آفر تک آنے لگے۔ انھوں نے کبھی اسپتال کی پیشکش قبول نہیں کی لیکن ایک بار ابتدائی دور میں ٹریننگ کے تعلق سے ایک ورک شاپ میں ضرور شامل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کی گئی ڈلیوری اتنی مشہور ہوئی کہ لوگ دور دراز سے انھیں لینے چلے آتے۔ اس قدر معروف ہوئے کہ انھوں نے قرب و جوار کے گاؤں میں مفت ڈلیوری کرانی شروع کردی۔ غنیمت یہ ہوئی کہ وہ اونچی ذات سے نہیں تھے جس کے سبب انھیں غیرت وتحفظ کے امتحانات سے گزرنا نہیں پڑا۔ سماج میں یہی دستور ہے کہ نیچی ذات میں، جس کی جو مرضی ہو (معذور، ٹرانس جینڈر، دلت، طوائف، قاتل وغیرہ)، وہ کسی سماج کی نمائندگی کا استعارہ نہیں ہوتا، کیوں کہ اس کی سماجی شناخت کو حقیر مانا جاتا ہے۔ ایشو ہر جگہ وہی ہے، وہاں اونچی ذات کے لوگ، نیچی ذات کو اپنی برابری کا تسلیم نہیں کرتے اور یہاں سبھی اونچی نیچی ذات کے لوگ مل کر ان عجیب (ہیجڑے/کنر/ گے) سوچ رکھنے والوں کو اپنی ذہنی سطح سے حقیر تصور کرتے ہیں، انھیں بیمار سمجھتے ہیں۔

''سچ کہوں تو میرے پاس اس کہانی کا اختتام ابھی بھی نہیں ہے۔ میں ابھی بھی اسی سات برس کی عمر میں رُکا پڑا ہوں۔ شاید انتظار ہے 'کال چکر' میں پھنسی اس ترغیب کو پورا کرنے کا۔ شاید میں اٹھ پڑوں، جھجک چھوڑ کر جا بیٹھوں عورتوں کے گروہ کے درمیان اور ان سے پوچھوں کہ ہر اس اندیشے اور شبہات کے جواب جو قوت کو مجتمع کرنے کے دوران پیدا ہوئے تھے، یعنی پدری سماج میں سیکشوئلٹی پر کنٹرول، قانون نے تو انھیں اپنا لیا ہے لیکن کیا سماج نے بھی انھیں اپنا لیا ہے؟ دستور نے تو انھیں پہچان دے دی ہے، امید ہے کہ اس طرح کے داخلی تسلط کی سماجی شناخت بھی انھیں حاصل ہو۔ یہ بھی اتنا ہی فطری اور حقیقی ہے جتنی صبح اور شام۔ اگر کسی اور سیارے کی سازش ہوتی تو انھیں اس سیارے میں بھیج دیتے لیکن جو ہمارا ہے، انھیں ہم نہیں قبول کریں گے تو وہ کہاں جائیں گے؟''

- 28 -

پٹاخوں اور راکٹوں کی تیز چنگاریوں اور دھوؤں کے درمیان میرا جسم تیزی سے نیچے گر رہا ہے، کسی فلم کے سلوموشن سین(slo mo scene) کی طرح۔

Don't give up...Don't give up...

آہ! ایک تیز رفتار راکٹ میری کمر سے ٹکرایا اور وہیں پھٹ گیا، میرا جسم جو اوندھا گر رہا تھا، اس کا رخ اب سیدھا ہو گیا۔ میرا چہرہ جو پہلے زمین کی طرف تھا، اب وہ آسمان کی طرف تھا، میری کھلی ہوئی کھڑکی اور میرے فلیٹ کی بالکنی کی طرف تھا۔ لیکن وہاں کون کھڑا ہے؟ کون مجھے گرتا ہوا دیکھ رہا ہے؟

Don't give up...Don't give up...

Don't give up...Don't give up...

کیا اس نے مجھے نیچے دھکا دیا تھا؟ لیکن کون ہے وہ؟ میرا کوئی پیشنٹ؟ میرا کوئی سیکس پارٹنر؟ کون؟ کاش... کاش... میں ایک بار اس کا چہرہ دیکھ سکتا، اس مہربان کا چہرہ جس نے مجھے ہر روز مرنے سے بچالیا... میں اپنے محسن کا شکریہ تو ایک بار ادا کر دوں۔ بس ایک بار۔

Don't give up...Don't give up...

Don't give up...Don't give up...

نیچے گرتے ہوئے میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور اچانک وہ ہوا میں ہی ٹھہر گیا، معلق ہو گیا۔ آہ، تھوڑا سا اور اوپر... میں اس مہربان کا چہرہ ایک بار دیکھ لوں... بس... کاش میرے جسم میں میری پوری عمر کی طاقت پل بھر کے لیے سما جائے کہ اوپر اُٹھ سکوں... بس ایک ذرا اوپر...

پلیز... پلیز تھوڑا سا...

ہاں، اب میرا معلق جسم سفر معکوس کے لیے شاید تیار ہے... ہاں یہ اوپر اٹھ رہا ہے... بہت سست لیکن اوپر اٹھ رہا ہے... اپنے اصل کی طرف لوٹ رہا ہے... واپسی کا سفر... اور ذرا اوپر... ہاں ہاں اور ذرا... میرے فلیٹ کی بالکنی پر کھڑے شخص کا چہرہ اب بھی تاریکی میں لپٹا ہوا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ تاریکی چھٹ رہی ہے، اس کے چہرے کا ہیولی بتدریج واضح ہوتا جا رہا ہے اور ذرا اوپر... ہاں ہاں اور ذرا...Don't give up...Don't give up...اور ذرا اوپر... ہاں ہاں اور ذرا...

ارے اسے تو میں جانتا ہوں شاید... ایک منٹ... ذرا اور اوپر... یہ... یہ... یہ تو پنڈت جی ہیں... تو کیا پنڈت جی نے مجھے... لیکن کیوں؟... وہ تو خود...

میرے کمپلیکس کے بازو والی بلڈنگ میں پنڈت جی رہتے ہیں، بھلے آدمی ہیں۔ سب کے ساتھ پیار سے رہتے ہیں، گھر میں جھاڑو لگانے والی عورت کو چائے پلانے کے لیے انھوں نے ایک الگ سے کپ بھی رکھا ہوا ہے۔ پنڈت جی خود کو 'ایل جی بی ٹی ایکٹوسٹ' (LGBT Activist) کہتے ہیں اور ڈیٹنگ ایپ پر 'نو مسلم/نو ایس سی/نو ایس ٹی/نو گرلش/نو انکل/نو فیٹ/نو پیڈ' لکھتے ہیں۔ پنڈت جی سب کو بتاتے تھے کہ ہندو دھرم میں شکھنڈی جیسے لوگ بھی تھے جن کی بہت عزت تھی، پھر مجھ سے کہتے، ''یہ ہیجڑے اتنے بے شرم کیوں ہوتے ہیں یار؟ پوری کمیونٹی کا نام بدنام کر رہے ہیں یہ لوگ۔'' پنڈت جی یہ بھی بتاتے تھے کہ کیسے مسلم ممالک میں 'گے' لوگوں کو مارا جاتا ہے۔ پنڈت جی کو ملک کے پردھان منتری بہت پسند ہیں۔ پردھان منتری کے ایک دوست نے کہا تھا کہ اگر ان کا بیٹا 'گے' ہوتا تو وہ اسے مار ڈالتے۔ پنڈت جی سے ایک دن میں نے پوچھا کہ پردھان منتری نے ایسے لوگوں کو اپنا دوست کیوں رکھا ہے؟ پنڈت جی نے برجستہ کہا، ''حکمت عملی نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ صرف 'گے' ہونا سب کچھ نہیں ہوتا، اکانومی بھی ہے۔ ہمیں ترقی چاہیے، باقی سب بھی دھیرے دھیرے ہو جائے گا۔'' ادھر ملک کی جی ڈی پی گر رہی تھی، کسان بھوکوں مر رہے تھے، ٹیکس بڑھتا جا رہا تھا اور نوکریاں ختم ہوتی جا رہی تھیں لیکن پنڈت جی کو پورا یقین ہے کہ پردھان منتری سب ٹھیک کر دیں گے۔ پنڈت جی کو ایسا کوئی چاہیے

تھا جوان سے ویسا ہی پیار کرے جیسا وہ پردھان منتری سے کرتے ہیں۔

پنڈت جی کو پرائڈ میں جانا پسند ہے۔ وہاں رنگ برنگے کپڑوں میں لوگ ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر پنڈت جی کو بڑا مزہ آتا ہے، وہ گھر لوٹ کر، ان میں جو سب سے عجیب تصویر انھیں لگتی، اسے شیئر کر کے خوب ہنستے ہیں۔ ''ارے ایسا عجیب سا پہننے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ لوگ انسانوں جیسے کپڑے نہیں پہن سکتے؟ کم سے کم ویکسنگ تو کر ہی لینی چاہیے تھی اگر سلیولیس (sleeveless) پہننا تھا۔'' پنڈت جی ہوٹل میں جا کر دوسرے 'گے' لوگوں کے ساتھ ناچتے بھی ہیں، کبھی کبھی ان کے ساتھ دارو بھی پی لیتے ہیں، لیکن گھر آ کر گنگا جل سے نہانا نہیں بھولتے۔ پنڈت جی کو 'بائی سیکشول' لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ ''بائی سیکشول لوگ ہم 'گے' لوگوں کے ساتھ سیکس کرتے ہیں اور لاسٹ میں کسی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔''

اِدھر کچھ عرصے سے پنڈت جی کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ ''یہ پرائڈ میں لوگ آزادی کے نعرے کیوں لگاتے ہیں؟ صرف ایل جی بی ٹی (LGBT) پر فوکس نہیں کر سکتے کیا؟ اتنی راجنیتی گھسیڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور یہ ہیجڑے لوگ، آج کل تو پتہ نہیں جینڈر کوئیر (Gender Queer) اور جینڈر نان بائنیری (gender non binary) اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں لوگ، اوپر سے یہ لیسبین لڑکیاں، پرائڈ میں کمیونزم لانے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کو مردوں سے دقت کیوں ہے؟ فیمنزم کینسر ہے۔ اور یہ ایس سی، ایس ٹی والے تو بہت زیادہ ذات پات کرتے ہیں۔ ان پر تو پابندی لگا دینی چاہیے۔ ان کو دقت ہے تو اپنا علیحدہ پرائڈ کیوں نہیں کرتے؟ اتنا فوٹیج کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ پورا ماحول یہ لوگ خراب کر رہے ہیں۔''

ایک شام پنڈت جی چائے کی دکان پر مل گئے، میں نے یوں ہی پوچھ لیا، ''کیسے ہیں؟''

پنڈت جی اداس لہجے میں بولے، ''کیا بتائیں یار، یہ کئی سارے ایل جی بی ٹی والے پکے دیش دروہی ہو گئے ہیں، ان کو تو شاید گلف سے پیسہ آتا ہے۔''

''یہ تو بڑی فکر کی بات ہے۔ پھر اب آپ کیا کریں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''پولیس سے بات چیت چل رہی ہے۔ ہم لوگ یہ سارے کمیونسٹ ٹائپ دیش دروہی ایل جی بی ٹی کو پکڑوا رہے ہیں۔'' پنڈت جی نے فخر یہ کہا۔

''پولیس سے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن پولیس تو یوں بھی ایل جی بی ٹی

لوگوں کو پریشان کرتی رہی ہے اور آپ تو ایکٹیوسٹ ہیں۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟''

پنڈت جی ناراض ہو گئے، منھ پھلا کر بولے ''یار دیکھو۔ تم نہیں سمجھ رہے ہو۔ وہ تب کی بات تھی جب سپریم کورٹ کا فیصلہ نہیں آیا تھا۔ ابھی تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟ 'گے سیکس' بھی قانونی ہو گیا ہے۔ ابھی اتنا ہنگامہ کرنے کی کوئی ضرورت کیا ہے اور پھر دیش سب سے پہلے ہے نا! کوئی ہمارے دیش کے خلاف کچھ بولے گا تو ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟''

''اچھا!'' میں سر کھجاتے ہوئے کہا، ''تو یہ جو لوگ پکڑے جائیں گے، اگر ان کے گھر میں ان کے بارے میں پتہ نہ ہو تو ان کے گھر والوں کو پتہ نہیں چل جائے گا کہ وہ ایل جی بی ٹی ہیں؟''

پنڈت جی میری معصومیت پر مسکرا کر گویا ہوئے، ''دیکھیے اگر آپ دیش دروہی نعرے لگا سکتے ہیں تو گھر والوں کو پتہ چلے یا دنیا کو، کیا فرق پڑتا ہے؟''

''تو ان کے ساتھ گھر میں تشدد...''

میں نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ پنڈت جی ایک دم سے آگ ببولا ہو گئے، ''کیا بکواس کر رہے ہو یار'' انھوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا، پھر ادھر اُدھر دیکھ کر شانت ہو گئے اور بولے، ''بکواس مت کرو۔ کسی کے ساتھ گھر میں تشدد نہیں ہوتا۔ ماں باپ ہیں، انھیں وقت لگے گا یہ سب سمجھنے میں۔ اور وہ پیار کرتے ہیں ہم سے، دو چار تھپڑ مار دیا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا؟''

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، پنڈت جی پھر بول پڑے ''چلو چھوڑو، تم نہیں سمجھو گے۔ تم بھی تو انھیں کو سپورٹ کرتے ہو۔ ایک بات سچ بتانا، کیا تم بھی کمیونسٹ ہو؟''

''نہیں کمیونسٹ تو نہیں ہوں لیکن ان کے کچھ وچار مجھے ضرور پسند ہیں۔''

''تو کیا تم لبرل ہو؟''

''لبرل تو آپ بھی ہیں پنڈت جی، کیا نہیں ہیں؟''

''آں ں ہاں! ہوں تو سہی لیکن میں امریکی لبرل ٹائپ نہیں ہوں، میں ویدک لبرل ہوں۔... خیر چھوڑو، میں پولیس اسٹیشن بیان دینے جا رہا ہوں۔ کسی لڑکی کو پکڑا ہے، مطلب ویسے وہ خود کو لڑکی بولتی ہے۔ پتہ نہیں ایسے کیسے کوئی کچھ بھی بول دیتا ہے خود کو؟ میں تو چاہتا ہوں کہ پولیس اس کی اتنی اچھے سے خاطر کرے کہ اس پر سے دیش دروہی کے ساتھ ساتھ لڑکا بننے کا بھوت بھی اتر جائے۔''

پنڈت جی 'جے شری رام' بول کر آگے بڑھ گئے لیکن تھوڑی دور جا کر ٹھٹھک گئے، پھر میری طرف پلٹے۔

''تم اچھے آدمی ہو۔ کمیونٹی کی سیوا کر رہے ہو، ان کا علاج کر رہے ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم انھیں صحیح دِشا دکھا رہے ہو، لیکن اِدھر تمھارے گھر پر کچھ ودیشی لوگوں کا آنا جانا زیادہ ہو گیا ہے... اور تم ہیجڑوں پر بھی اب دیا دھرم دکھانے لگے ہو۔''

''آپ میری جاسوسی کر رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''کرنی پڑتی ہے اپنے دیش اور اپنے دھرم کی سرکھشا کے لیے... اور جب دیش اور دھرم کو خطرہ ہو تو پھر میرا دماغ پھر جاتا ہے، پھر نہ کہنا دوست دوست نہ رہا پیار پیار نہ رہا۔''

آہ!

میرا جسم ایک بار پھر تیزی سے نیچے کی طرف لڑھکنے لگا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے میرے فلیٹ کی کھڑکی، میری بالکنی اور پنڈت جی کا چہرہ تیزی سے پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں... نقطوں میں سمٹتے جا رہے ہیں... لاتعداد نقطوں میں... پھر ہر نقطہ دوسرے نقطے کے اندر سماتا جا رہا ہے... جیسے... جیسے... ایک بلیک ہول بنتا جا رہا ہو، جس کے دائرے سے فرار ممکن نہیں، روشنی کو بھی نہیں۔

اس نے کہا تھا...

تمھیں وہ فقیر یاد ہے جو جلاد کے سامنے سر جھکا کر بدبدایا تھا، 'آؤ، تم جس بھی راستے سے آؤ گے، میں تمھیں پہچان لوں گا'۔

شہر قاضی نے اس ننگ دھڑنگ فقیر سے پوچھا تھا، ''آپ اتنے بڑے عالم ہیں، پھر بھی اس طرح برہنہ کیوں پھرتے ہیں؟''

فقیر کیا جواب دیتا اور کن کو جواب دیتا؟ کیا انھیں جو لباس کے اندر سب کچھ چھپا لینے کے لیے بضد تھے؟ داراشکوہ کا قتل بھی؟

''جو گناہ کرتے ہیں، انھیں اسے چھپانے کے لیے کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں

نے ایسا کچھ نہیں کیا جسے چھپانے کے لیے مجھے کپڑے کا سہارا لینا پڑے۔''

قاضی برہنگی کو قتل کا سبب بنانا چاہتا تھا، اس نے فتویٰ لکھنے کے لیے قلم دان کا ڈھکن ہٹایا ہی تھا کہ شاہ نے اسے اشارے سے روک دیا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ برہنگی کسی کے قتل کا موجب نہیں بن سکتی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس قتل سے وہ خود بھی برہنہ ہو سکتا ہے، سب کے سامنے۔ کیوں کہ مملکت خداداد میں یہ اکلوتا برہنہ فقیر تھوڑی ہے، اور بھی بہت سارے محلوں میں، کھیتوں کھلیانوں میں ننگ دھڑنگ گھومتے رہتے ہیں، ان میں سے کچھ اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے رہتے ہیں، ان کے لمبے لمبے بال کھلے رہتے ہیں یا جوڑے کی شکل میں سر پر بندھے ہوتے ہیں۔ عورت مرد بچے انھیں دیکھ کر کوئی واویلا نہیں کرتے، انھیں عجیب نہیں سمجھتے، نہ انھیں خود سے الگ سمجھتے، عورتیں تو انھیں ادب سے بھیک دیا کرتی تھیں، پھر برہنگی قتل کی وجہ کیوں کر ہو سکتی تھی؟

دربار شاہی میں اس کی برہنگی کا سبب پوچھا گیا، فقیر کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''ایک عجیب چور نے مجھے برہنہ کر دیا۔''

اس چور کو سب جانتے تھے، اس سے سب واقف تھے جس نے فقیر کے کپڑے چرائے تھے لیکن یہ وجہ بھی قتل کی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر؟

شاہ کو اچانک یاد آیا کہ ایک وجہ تو ہو سکتی ہے۔ اس نے فقیر سے مطالبہ کیا، ''کلمہ پڑھ۔''

''لا الہ الا اللہ۔''

''پورا پڑھ۔''

''ابھی عشق کی اسی منزل تک پہنچا ہوں، آگے کا سفر باقی ہے۔''

شاہ کو وجہ مل چکی تھی، 'کفر'۔

شہر قاضی نے پھر قلم دان کھولا، اس بار شاہ نے اسے منع نہیں کیا۔ قتل کے فرمان پر شاہی مہر لگا دی گئی۔

فقیر کو اپنی موت کا فرمان سن کر ایسا لگا جیسے وہ بارش کی پھواروں کا سنگیت سن رہا ہے۔ وہ اندر ہی اندر شرابور ہو رہا ہے جیسے اس کی فریاد سن لی گئی ہو، جیسے اس کا عشق مکمل ہو گیا ہو۔ وہ وہیں مسجد کی سیڑھیوں پر رقص کرنے لگا۔ سر بازاری رقصم۔

تت تا تھئی، تھئی، تت تا تھئی، تھئی

تھیئ تا تا تت، تت، تت
تھیئ تا تا تت، تت، تت

اسے وہ ڈھول بھر راستے یاد آئے جس میں چل کر کاشان سے وہ ہندوستان پہنچا تھا۔ پھر اسے وہ حسین چور لڑکا یاد آیا جس نے اس کے کپڑے چرائے تھے، نہیں... اس نے تو اس کا پورا وجود ہی چرا لیا تھا۔ ٹھٹھ کا وہ نامراد ہندو لونڈا جس نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا؛ اس کی دولت، اس کی شناخت، اس کی تجارت، اس کا مذہب، اس کا ایمان؛ سب کچھ۔ اسے یاد آیا، وہ سب کچھ لٹا کر بھی بے چین تھا، اس کے جسم پر ابھی کپڑے جو باقی تھے، وہ اپنے معشوق کے گھر پہنچا اور اپنا آخری اثاثہ بھی اس کے قدموں میں رکھ دیا۔

تت تا تا تھیئ، تھئی، تھیئ، تا تا، تھیئ، تھیئ، تھیئ
تھیئ، تیھیئ، تھیئ، تھیئ، تھیئ، تھیئ، تھیئ

اس نے کہا تھا:

''اے شہر قاضی! سن، غور سے سن۔ عشق دلوں اور آنکھوں پر مہر لگا دیتا ہے، جسم میں چڑھ جاتا ہے اور جگر میں تیزی سے اثر کرتا ہے۔ صاحب عشق ظنون و اوہام کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی چیز صاف نہیں ہوتی اور نہ کوئی اس سے خاص وعدہ کی ہوئی بات ہوتی ہے، مصائب اس کی طرف جلد آتے ہیں، وہ موت کے شربت کا جرعہ گمشدگی کے حوض کا بقیہ ہوتا ہے، البتہ اس کی طبیعت میں بشاشت اور اخلاق میں شائستگی ہوتی ہے اور صاحب عشق سخی ہوتا ہے جو روکنے کے داعیہ کی طرف کان نہیں لگاتا اور نہ ہی ملامت کے داعیہ سے وہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔''

''سن اے سروں کو قلم کر کے ٹوپیوں کو سینے والے عابد بادشاہ، عشق کی دستار بندی تجھ پر اُدھار رہی کہ ٹوپیوں کے لیے سروں کا سلامت رہنا ضروری ہے۔ سن، وہ بات سن جو تیرا بھائی تجھے سنانا چاہتا تھا لیکن تو نے اپنی سماعتوں پر پہرے بٹھا دیے، اپنے دل کو مقفل کر لیا، اب مجھ سے سن۔ عشق، سراب سے زیادہ رقیق اور شراب سے زیادہ نرم روی والا ہے۔ وہ معطر مٹی سے بنا ہے جسے جلالت کے برتن میں گوندھا گیا ہے۔ میانہ روی کی صورت میں شیریں پھل ہے اور جب زیادہ بڑھ جائے تو عقل کو خراب کرتا ہے اور قاتل بن جاتا ہے اور ایسا لاعلاج فساد بن جاتا ہے جس کی اصلاح کی امید نہیں کی جا سکتی، اس کا بادل بہت پانی والا ہوتا ہے جو دلوں پر برستا اور فریفتگی کا گھاس اُگاتا اور شوق کا پھل دیتا ہے، اس کا مارا ہوا ہمیشہ سوزش میں پڑا رہتا ہے۔ وہ تنگ حال،

زمانے کو دیکھنے والا اور لمبی سوچ والا ہوتا ہے، وہ رات کو بے خواب اور دن کو مضطرب ہوتا ہے، اس کا روزہ مصیبت اور افطاری شکایت ہوتی ہے۔"

تھیئی، تھیئی، تھیئی، تھیئی، تھیئی، تھیئی

تگدھا... تگ... دھا... تھیئی... تگ... دھا...

وہ جلاد کی تلوار کے نیچے اپنا سر رکھ کر دھیرے سے بدبدایا، "آؤ، تم جس بھی راستے سے آؤ گے، میں تمھیں پہچان لوں گا۔"

تگدھا... تگ... دھا... تھیئی... تگ... دھا...

کٹا ہوا سر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر رقص کر رہا تھا۔

تگدھا... تھیئی... تت تت... تر کٹ... کٹ...

وہ بے پناہ سرور جو روحانی وجود مادی وجود سے کٹ کر زمین وزماں کی وقت اور شعور کی رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا اپنے مرکز حقیقی کی طرف پرواز کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، وہ اس میں شرابور تھا۔ یہ وہ مقام تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں وہ اپنے وجود کی نفی کرتے ہوئے لامکاں کی وسعتوں میں کھو جانے والا تھا۔

تھیئی، تھیئی، تھیئی، تھیئی، تھیئی، تھیئی

تگدھا... تگ... دھا... تھیئی... تگ... دھا...

تگدھا... تھیئی... تت تت... تر کٹ... کٹ...

مسجد کی سیڑھیوں پر رقص کرتا ہوا سر اپنے پیر و مرشد کی آغوش میں سما گیا۔ قبر نے آسودگی سے کروٹ لی، تخت شاہی کانپنے لگا۔ آواز آئی:

چوں دلم بتکدہ شد آزر گو بت متراش
چوں سرم معصرہ شد خانۂ خمار مگیر
کفر و اسلام کنوں آمد و عشق از ازلست
کافرے را کہ کشد عشق نہ کفار مگیر

بادشاہ نے خوانِ شاہی الٹ دیا اور چلا اٹھا، "خون... خون..."

بیگمات، شاہزادوں، باندیوں اور غلاموں نے حیرت سے دیکھا، طشت و طبق خون

سے سرخ ہو چکے تھے۔

Electro Cardiogram کے اسکرین پر صرف ایک نقطہ نظر آ رہا ہے، وہ بھی تھوڑی دیر بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مریض پر پڑی ہوئی سفید چادر کو اس کے سر تک کھینچ دیا جاتا ہے۔

ایک شو ختم ہو چکا تھا۔
دوسرے کی تیاریاں کہیں نہ کہیں شروع ہو ہی گئی ہوں گی۔

اشعر نجمی کا ناول 'اس نے کہا تھا' ایک ایسے معاشرے میں ان افراد کی نقاب کشائی کرتا ہے جو اپنے وجود کی تنہائیوں میں ڈر، ذلت اور شکست سے دو چار ہیں۔ یہ احساس ذلت اور شکست ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ فطرت کی طرف سے اس جنسی عطا کی وجہ سے ہے جو انسانی معاشرے کے اپنے قائم کردہ اصولوں سے منحرف ہے۔ منافق معاشروں میں کسی ایسے موضوع پر لکھنے کا مطلب آگ میں تپے ہوئے سرخ تانبے کو چھونا ہے۔ جسے بہر حال اشعر نجمی نے چھوا ہے اور پوری طاقت سے چھوا ہے۔ یہ ناول جنسی اختلاط رکھنے والے ان نارمل انسانوں کی کتھا ہے جنھیں ہمارے کٹھور سماج نے ابنارمل کے خطاب دے کر ناقابل بحث قرار دے دیا ہے۔ ایسے انسانوں کی تنہائی انھیں صرف دو رخ سے دو چار کرتی ہے؛ یا وہ اپنے اپنی خواہشات کو دبا لیں اور اسی گھٹن میں موت سے ہمکنار ہو جائیں یا اپنے وجود کو سماج کے سامنے پیش کر کے اپنے گلے میں ذلت کا طغرہ بندھوالیں۔ حتیٰ کہ سرکاری سطح پر ان کے حق میں بنائے گئے قوانین بھی ان کے مداوے کو نہیں پہنچ پاتے۔ مگر یہاں اشعر نجمی صاحب زمانے کی تمام ملامتیں اپنے نام لے کر ان تاریک راہوں میں پڑے ہوئے سوگواروں کی تلاش میں نکلے ہے اور میں انھیں اِس کام میں جرأت اور شرف عزت کا خلعت پہناتا ہوں۔

علی اکبر ناطق
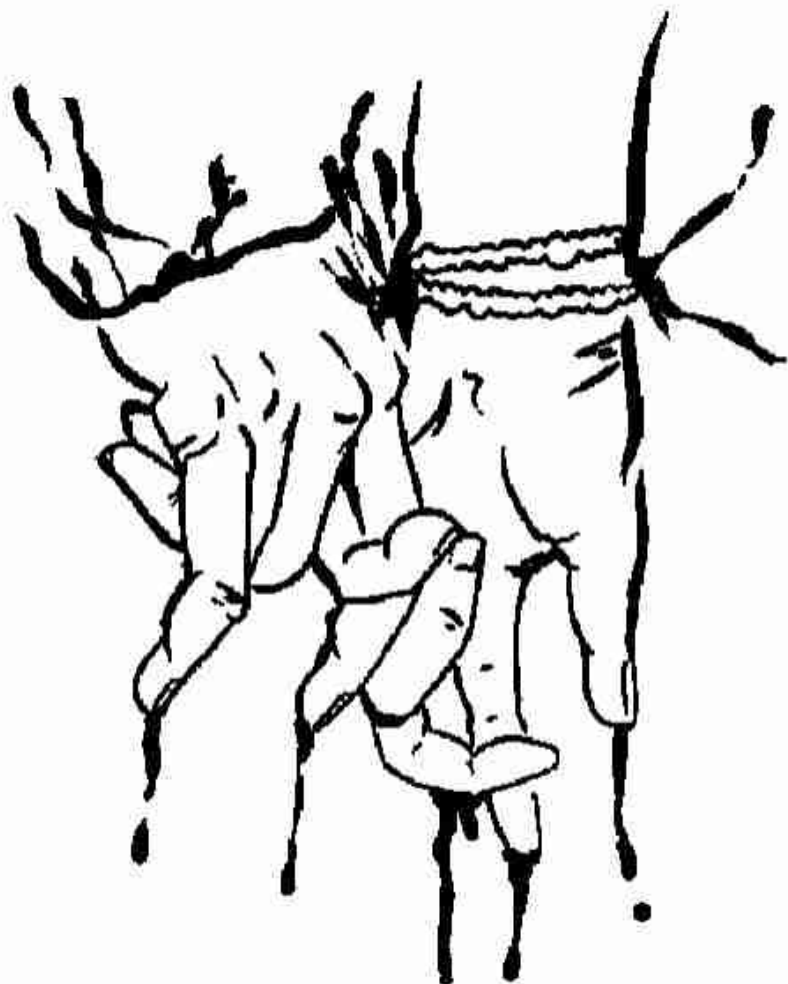
"Nature made a mistake, which I have corrected."

- Christine Jorgensen